چین آشنائی
شاہ محمد مری

چین آشنائی

شاہ محمد مری

سنگت اکیڈمی آف سائنسز کوئٹہ

بلوچوں کے نشاں محفوظ رکھنا
میرا سعیِ طلب ملحوظ رکھنا

شاہ لطیفؒ

نام کتاب: چین آشنائی

مصنف: شاہ محمد مری

سال اشاعت: 2007ء

تعداد: 500

قیمت: ------

پبلشر: سنگت اکیڈمی آف سائنسز کوئٹہ

پرنٹر: کراچی

انتساب

ایمان کے نام

فہرست

پیش لفظ

پہلا باب

چھوٹے دارالحکومت سے بڑے دارالحکومت تک

1۔توشہِ چین

2۔بیاپہ خیر

3۔سرسبز رہوگی

4۔آباد جنگل میں ایک آدھ شیر

5۔آں صد شلی تو یک شلی

6۔سنگت منی امبل منی

دوسرا باب

مجذوب بیوروکریسی کا شہر،اسلام آباد

1۔میلی تاریخ، بدلتا جغرافیہ

2۔میر بہار خان کو ساتھ لونگا

3۔چودہ اونٹ بھی کم ہیں

4۔اسلام آباد میں بلوچستان

5۔چین میں بلوچستان

6۔سمو نے میرے لئے موٹے موٹے آنسو بہائے

تیسرا باب

برو دیما، برو دیما، برو۔۔۔۔

1۔جانان، جوانی اور جام

2۔لغت کے دو بد بخت الفاظ۔۔۔۔میرا، تیرا

3۔کی دم دا بھروسہ یار، دم آوے نہ آوے

4۔طاقتور سردارو، مجھے زبردستی بھنگ نہ پلاؤ

5۔میں باغی ہوں میں باغی ہوں

6۔گردنیں کاٹنے سے افکارِ حیات مار سکتے ہو؟

7۔ مُکے بازوں کی بغاوت

8۔چین کا بزنجو۔۔۔۔سن یات سن

9۔وارلارڈز چین میں

10۔روس کا عظیم سوشلسٹ انقلاب
11۔حسن باپ ہے محبت کا، اور ماں ہے عشق کی
12۔سوشلزم کی قدم بوسی
13۔ایک سرخ ستارہ مانگیں گے

چوتھا باب

کھلا بابِ سحر آہستہ

1۔صرف گنجان آبادہی نہیں گنجان اشجار بھی
2۔بے جنگ ۔۔۔شمالی شہر
3۔چینی، کوئٹہ کے ہزارے ہیں
4۔جن بھوت کا وجود ہے، نہیں ہے۔۔۔!!
5۔لی صاحب کی اژدھوں سے محبت
6۔چین افغان متحدہ محاذ
7۔دم لے لے گھڑی بھر، مسافر۔۔۔
8۔دو بھائی تیسرا حساب
9۔ملاؤں میں بھی مسلمان ہوسکتے ہیں
10۔عوامی جمہوریہ سائیکلستان
11۔رنگ برنگی کاروں کو
12۔قسم مجمعے کی، قسم سردار کی، قسم بھیڑوں کی
13۔خوردم خوردم گاؤ شدم
14۔خوراک میں بھی مارکیٹ اکانومی

پانچواں باب

Forbidden City

1۔شہرِ ظلمات کو ثبات نہیں
2۔اک دعا بلوچ کے لئے
3۔کیا کروں روؤں ہنسوں رقص کروں یا ماتم
4۔یہ عمارات و مقابر، یہ فصیلیں یہ حصار
5۔بادشاہ آتا تو لوگ سجدے میں گر پڑتے
6۔بادشاہ کی رکھیلیں، داشتائیں، خواجہ سرا
7۔دربارِ عشق کی زیارت
8۔نیم غریبی حال و چالیں۔ نیم غنی ءِ زرز والیں
9۔ملکہ نہاتی کیسے تھی
10۔بادشاہ حسینائیں جمع کرتا ہے
11۔بادشاہ کے ساتھ سونے والی عورتیں
12۔داشتاؤں کی بغاوت
13۔چکورباز، بٹیرباز، جھینگرباز بادشاہ
14۔انتقام غیرت کا نام دھار لیتا ہے
15۔بادشاہ کا مولوی
16۔زن و مرد کی تقسیم

17۔ بت پرست یا بت شکن

چھٹا باب

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

1۔ اصلی گدھا یہی ہے
2۔ ایک بچے والا دیس
3۔ ترقی آئے، ترقی نہ آئے
4۔ وہاوءَ نیلی مناں

ساتواں باب

دیوارِ چین

1۔ ڈاکٹر نہیں، پٹواری بن جاؤ
2۔ مولوی آن لائن
3۔ ملکِ ختا کی ترقی
4۔ اوھیل
5۔ قومی ثقافت کا محافظ نظام
6۔ تھوڑی دیر ساتھ چلو
7۔ بلوچ کی افلاطونی دانائی
8۔ مردِ کہستانی
9۔ ڈیرہ غازیخان کی عورت
10۔ اونٹ نے کہا، تینوں پر لعنت ہو
11۔ سوشلزم جاگتا ہے
12۔ جعلی ڈگریاں بکتی ہیں
13۔ دوست ملک کے لئے نیک تمنا
14۔ چائینیز ہوٹل اور بلوچی سجی

آٹھواں باب

نیشنل میوزیم آف ماڈرن چائینیز لٹریچر

لوہسون
ماؤزے تنگ
باجین
ماؤڈون
کومورو

نواں باب

چین کا بڑا آدمی

1۔ قد اور عقل، قد اور فتنہ
2۔ کوہلو اور کاہان بخش دوں ۔۔۔۔ مستؔ
3۔ ڈی میلو اور سلیم اختر
4۔ ایک بہن کی مہمان نوازی

5۔ ویران شود شہرے کہ میخانہ نہ دارد

دسواں باب

عبرت، اے آنکھوں والو!

1۔ مست ڈیرہ غازیخان میں
2۔ کمپیوٹر زنانہ آواز میں
3۔ سجی خورے کو سجی ملتی ہے
4۔ تلاش، تلاشی

گیارہواں باب

چینی تاریخ میں ایک اور ڈُبکی

1۔ چین کا پٹ فیڈر
2۔ سخی سرور کے دربار میں عشاق پہ کوئی پابندی نہیں ہے
3۔ شاؤلین ٹمپل
4۔ چینی دیومالا
5۔ ملّا جنرل بن گئے

بارہواں باب

شہ مرید کی گشت گاہ سے واپسی

1۔ ویکھدا رواں
2۔ علماء کی صحبت میں

تیرھواں باب

کلچر، ایگریکلچر

1۔ مرگ ءَ پچُوری
2۔ شاہ محمد
3۔ ایں مئے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود
4۔ بیجی لڑ گماں کاری نہ باڑشوئے کپتغیں چی آں
5۔ چین کی اوہام پرستی
6۔ وطن کشمیر
7۔ ماہر کس ڈولے پنڈوخوں
8۔ تھیوری آف ریلے ٹے وٹی

چودھواں باب

مہر گڑھ کا تسلسل

1۔ شنگھائی ہی چین کا ماضی ہے
2۔ شنگھائی ہی چین کا مستقبل ہے
3۔ شنگھائی میوزیم
4۔ آدم و آلہ
5۔ سب کچھ سمّو کا

6۔ پرل ٹی وی ٹاور

پندرھواں باب

ترقی، مزید ترقی، مزید۔۔۔۔۔

1۔ ہم لٹ گئے بیچ بزار
2۔ حساس ترین بحث
3۔ عشقیہ داستان
4۔ محبت کی شادی یا شادی کی محبت
5۔ مادی ترقی اور ادب
6۔ دوستی، مہمان نوازی
7۔ آنکھیں بڑی نعمت ہیں
8۔ گناہ بھی بڑے ڈھنگ سے
9۔ ٹوٹ پڑو
10۔ کمیونسٹ ہونے کا کچھ فائدہ نہیں

سولہواں باب

کونجوں کی وطن واپسی

پیش لفظ

امریکہ بدمست پاور ہے،اس کی بپا کردہ جنگ وجدل کی دنیا ہے، آہیں کراہیں، خون ریزی، تباہی رقصاں ہے اورانسانیت مذلت کی جانب دھکیلی جارہی ہے۔فکری ونظریاتی کنفیوژن کا دور دورہ ہے ۔ جھوٹ حاوی ہے ، امن پسندی کا مذاق اڑایا جارہا ہے ، پاکی پاکیزگی گوشہ کی طرف دھکیلی جارہی ہے۔لاٹھی حکمران ہے، وسائل بری طرح لوٹے جارہے ہیں۔اورانسانی اقدار کچلی روندی جارہی ہیں۔۔۔چین کا ہمارا سفرایسے موقع پر ہوا ہے۔

چین نظریاتی فاصلے پر رہتے ہوئے بھی جس سوشلسٹ بلاک کا حصہ تھا وہ بلاک ہی ختم ہو چکا ہے۔قوت کے لحاظ سے سوویت یونین کا ہم پلہ چین ایک طرح سے اکیلا رہ گیا ہے۔چاروں طرف سے سامراجی اشاعت وابلاغ کا گھیرا ہے جو صبح ایک خبر اڑاتے ہیں شام ایک اور بے پر کی چھوڑتے ہیں۔ساری دنیا چین کی طرف دیکھ رہی ہے، کچھ جوش وخروش سے کچھ پریشانی سے آج کے چین سے متعلق دو باتیں مشہور کردی گئی ہیں۔ایک یہ کہ چین نے سوشلزم چھوڑ دیا اور سرمایہ داری نظام اپنالیا ہے۔۔۔دوئم یہ کہ چین ایک سامراجی ملک بن چکا ہے اور وہ بلوچستان کے ساحل اور وسائل پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔۔۔۔ہم اس پس منظر میں چین کے سفر پہ نکلے۔

اس سفر کے دوران مجھے مشتاق احمد یوسفی ،ڈاکٹر سلیم اختر ،داور خان داؤد اور اظہار الحق جیسے مفکر وعالم دوستوں کی رفاقت نصیب ہوئی۔سفر میں اُن کو دیکھا،ان سے بحثیں ہوئیں ،اوران سے خیالات کے تبادلے ہوئے۔ سچی بات ہے کہ میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ۔۔۔اس علم کو دوسروں تک پہنچانا بہت ضروری ٹھہرا۔

اسی طرح میں نے چین کے فراواں قدرتی نظاروں کا خوب نظارہ کیا۔چین جن معاشی معاشرتی مراحل سے گزر رہا ہے۔ان کا مفصل مطالعہ کیا۔اور وہ ارتقا کی جس سطح تک پہنچا ہے وہ بغور دیکھی۔اس سب کا معروضی ذکر ایک قرض سا بن گیا۔

پھر وہاں سفر کے دوران بہت سے ادیبوں ،شاعروں اور دانشوروں سے تفصیلی ملاقاتیں ہوئیں۔اسی طرح چین کی امیر ثقافت اور وہاں کی ثقافتی ادبی سرگرمیوں کو قریب سے دیکھا۔چین کس نظام میں ہے اور کل کس سمت کو جائیگا،اس کے بارے میں ان کے تجزیے سنے۔۔۔۔ان کا نچوڑ بیان کرنا ضروری قرار پایا۔

اپنے وطن سے دوری، اپنے اپنوں سے دوری اور پھر اپنے ''مرکزِ ثقل'' سے دوری کیا کیا کربناک صورتیں پیدا کرتی ہے،ہم ان کا بھی نشانہ بنے۔اس نا قابلِ بیان چبھن کو بیان کئے بنا رہا نہیں جارہا۔۔۔۔

یوں یہ کتاب وجود میں آ گئی۔

مجھے احساس ہے کہ یہ کتاب بہت ساری تشنگیاں دور کرتے کرتے کئی نئی تشنگیاں

پیدا کرے گی۔کئی سوالات کے جوابات دیتے دیتے نئے سوالات کو جنم دے گی۔شاید یہی ارتقا کا فلسفہ ہے۔۔۔۔اور ہم سب ارتقا ہی کے ہمسفر تو ہیں۔

شاہ محمد مری

ماوند

29جنوری2007ء

چھوٹے دارالحکومت سے بڑے دارالحکومت تک

1۔توشۂ چین

کوئٹہ ایئرپورٹ کے لاؤنج کی شیشہ دیواروں کی ان دیکھی درزوں کو چیرتی، راستہ بناتی نقرئی موسیقی میرے کان میں گونجی۔ جیسے دو جام ٹکرائے ہوں، جیسے چوڑیاں کھنکی ہوں، جیسے موتی کا دانہ فرش پہ گر جائے:

''میرے ہمزاد ، میری پرچھائیں ،میری روح کے حجاب ، میرے دل کے محور، میرے تصورات کی انتہا ، دل کو گرما دینے والی ہلچل ، جلتی دوپہر میں ٹھنڈی ہوا کے جھونکے، میرے جھومر، میرے دل میں چھپی مسرت، وسیع نیلے گگن کی طرح شفاف انسیت ، میری ناقابلِ مزاحمت کشش، میرے اطمینانِ قلب، میرے قابلِ فخر دوست ______ میں اپنی دعاؤں کی پوٹلی تمھاری سمت دم کرتی ہوں جو دورانِ سفر بطور امام ضامن تمہاری حفاظت کرینگی ۔ میں نے اپنے رب کے سامنے تمہارا نام لے کر التجا کی ہے کہ میں پچھلے چھ جنموں سے جس شخص سے محبت کرتی ہوں، اس کو اپنی امان میں رکھنا۔''

''سنو! میں لاؤنج میں بیٹھا ہوں۔ میری آنکھوں کے سامنے ایک بہت ہی رومانوی منظر ہے۔ ساتھ والے صوفے پہ ایک یورپین جوڑا بیٹھا ہے۔ محبت سے سرشار، خود سے بے خبر۔ لڑکی کا سر لڑکے کے سینے پر رکھا ہے۔۔۔۔''

''کیا تم محسوس نہیں کرتے؟ تمہارے اندر ہی تو سمائی ہوئی ہوں میں۔ میری تمہاری قرنوں کی قربت ہے۔ ہماری محبت کا کینوس تو بہت وسیع ہے، جس میں زندگی کے تمام ممکنہ رنگ بھرے ہیں۔ وابستگی کے رنگ، تفہیم کے رنگ، جذبات، اعتماد کے رنگ، آنسوؤں قہقہوں کے رنگ، شدت، خلوص، ایثار کے رنگ۔۔۔۔تمہیں یاد ہے، میں نے دنیا کے ہر سفر کے دوران تمہارا ہاتھ اتنی مضبوطی کے ساتھ تھاما کہ مجھے کبھی سیٹ بیلٹ باندھنے کی ضرورت ہی نہ ہوئی۔ اور میں جب بھی تھکی تو اس یورپی لڑکی کی طرح اپنا سر تمہارے سینے پر رکھ لیا۔ ہر جنم میں سینکڑوں ہزاروں بار!!۔ میں بہت خوش ہوں کہ اب میں تمہاری آنکھوں سے سرخ پرچم پہ چمکتے پانچ ستاروں والے کمیونسٹ ملک کو دیکھوں گی۔''

''میں نے جہاز میں کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ لے رکھی ہے۔ دیکھو جہاز میں ٹی وی سیٹ لگے ہوئے ہیں۔ ٹی وی سکرین پہ پھولوں کی کیاریاں دکھائی جا رہی ہیں۔

''سنتی ہو، ہمارے اس جہاز پہ جتنی خوبصورت دھنیں بجائی جا رہی ہیں اتنی مدھر موسیقی میں نے پی آئی اے کے جہازوں پر پہلے کبھی نہیں سنی''۔

''تم وہاں کی کلاسیکی موسیقی ضرور سننا۔ اور میرے لیے اس موسیقی کے کچھ نمونے ضرور ریکارڈ کر لانا۔''

بلوچی بنجو سے ملتا جلتا کوئی ساز بج رہا تھا۔ کوئی بہت ہی اچھا راگ چھیڑ دیا گیا تھا۔ اور پھر اس کی ہم آہنگی میں ٹی وی سکرین پہ آبشار دکھائی جا رہی تھی۔ اور اسی موسیقی کے زیر و بم

میں سکرین پر ایک سرخ تتلی پھولوں کی ہر پنکھڑی کی فرداًفرداًلب بوسی کرتی نظر آرہی تھی۔

کوئٹہ ایئرپورٹ سطح سمندر سے ساڑھے پانچ ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔طیارہ جیسے ہی آپ کو لے کر فضا میں بلند ہوتا ہے تو یہ گنجان آباد وادی، سنگلاخ کوہساروں کے بیچ زندگی سے بھرے جام کی مانند دکھائی دینے لگتی ہے، جو چہار سمت سے چلتن،تکتو،مردار اور زرغون نامی پہاڑوں سے گھری ہوئی ہے۔گیارہویں صدی میں محمود غزنوی کے حملے سے لے کر سولہویں صدی میں مغلوں، اٹھارویں صدی میں خان قلات اور انیسویں صدی میں انگریزوں کی سلطنت کا حصہ رہنے کے بعد بالآخر پاکستان کا پھلوں کا باغ بننے تک، یہ شہر ایک اہم عسکری تاریخ کا حامل رہا ہے۔

میں مکمل محو اور گم سم تھا کہ پھر میرے کان میں ہلکی سی سرگوشی ہوئی:

’’ہم سفر کیسے ہیں؟‘‘

ہڑ بڑا کر دزدیدگی سے آس پاس دیکھا:’’کچھ بے باک سمگلر آنکھیں ہیں جنہیں اس مسحور کن موسیقی کی بجائے کسی سستے ہلکے فلمی گانے کی توقع تھی۔ کچھ بدلباس سوداگر ہیں جنہیں استری اور شیو سے کوئی سروکار نہیں۔ کچھ بونے ، بیوروکریسی کے بھی ہیں جنکی گردنوں میں کوئی خم کوئی لچک نہیں۔کچھ افغانستان کے ہزارہ ہیں جو سیاستدانوں کی حب الوطنی کے خالی خولی نعروں کو ٹھوکر مار کر مہذب روٹی کے حصول کے لئے ایشیا چھوڑ کر کہیں اور بسنے جا رہے ہیں۔ایک آدھ بیمار دکھائی دے رہا ہے جو جھاڑ پھونک سے لاعلاج ہو کر اسلام کے قلعے کے کسی کافری ہسپتال جا رہا ہے۔ کچھ پشتون اپنی ہمہ وقت اور ہر جہاز میں موجودگی کی تصدیق کروا رہے ہیں......’’ارے جہاز نے رن وے پر رینگنا شروع کر دیا ہے۔سکرین پر جہاز کی سمت بھی بتائی جا رہی ہے۔۔۔‘‘

’’تم اسی ملک تو جا رہے ہو جس نے قطب نما بنایا تھا۔کاغذ بھی چینیوں ہی نے ایجاد کیا تھا اور چھاپہ خانہ بھی۔۔۔۔چین میں 140 ایئرپورٹ ہیں!اور وہ بھی دالبندین والے نہیں بلکہ کوئٹہ سے بڑے بڑے 140 ایئرپورٹ ہیں وہاں۔۔۔‘‘

2۔بیاپہ خیر

جہاز تیزی سے زمین پر دوڑنے لگا ہے۔میں بہ یک وقت ٹی وی اور زمین پر نظر رکھے ہوئے تھا کہ دیکھ سکوں کہ جہاز کی رفتار کتنی ہوتو یہ اڑنے لگتا ہے۔اور جب اس کی رفتار 190 میل فی گھنٹہ تک پہنچ گئی تو اس کے ٹائر زمین سے بلند ہو گئے۔اور تب ہم آسمانی(آفاقی نہیں)مخلوق بن گئے۔ہم جوں جوں بلند ہوتے جا رہے ہیں زمینی دنیا چھوٹی لگنے لگی ہے۔ شیعہ گیری سنی گیری، جیکب آباد سندھ کا کہ بلوچستان کا،کالا اچھا ہے یا گورا۔۔۔۔کتنی حقیر باتیں ہیں۔۔۔۔زمین بہت ہی خوبصورت سیارہ ہے۔ہم اسی کے بیٹے بیٹیاں ہیں۔یہی سچ ہے اور یہی انسان کا اصل مقام ہے۔باقی سب گری ہوئی باتیں ہیں۔

چاند بھی آسمان پر تھا اور ہم بھی وہیں تھے۔چاند کا آدھا بھی گم تھا اور ہمارا نصف بھی نیچے زمین پر رہ گیا تھا۔ہم نے اپنے پوتے افروز کی توتلی زبان کا گانا دھرایا:’’چندا ماموں سوجا ۔۔۔۔‘‘۔میری طرح چاند بھی اس کی معصومانہ بات پہ مسکرادیا۔۔۔ ہماری انتہائی رفتار 615 میل فی گھنٹہ تھی۔گیارہ ہزار تین سو میٹر بلندی پر سفر کر رہے تھے ہم۔اور باہر درجہ حرارت منفی 58 ڈگری سینٹی گریڈ تھا۔اندر ہمارے لیے آرام دہ درجہ حرارت برقرار رکھا گیا تھا۔ہم (انسان)فطرت پر کمان کر رہے تھے۔ہم ہر لحاظ سے اس جہاز پہ مطمئن تھے۔مگر زمین کی کشش پوری قوت سے ہمارے دل کو اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ہم ’’کششِ ثقل‘‘ کے خیالوں میں گم تھے کہ دیکھا سامنے لگا ہوائی وی سیٹ بند ہو گیا۔اور پھر ایک اسٹیورٹ کرافٹ اس کی طرف لپکا۔اس جہاز میں ضیاء الحق کا فلسفہ یوں مکمل طور پر نافذ تھا کہ یہاں مرد ہی مرد مہمان

نوازی کر رہے تھے۔ ایئر ہوسٹسیں آگے حلال کی کمائی والی کلاس کو جلوے اور حلوے بانٹ رہی تھیں۔۔۔اور میں سوشلزم جا رہا تھا کچھ سوشلزم ادھار لینے، اس صنفی امتیاز کے قبرستان کو سلام کرنے۔ اس آدمی نے آ کر اپنے مردانہ ہاتھ سے اس ٹی وی کو دو تھپڑ رسید کیے۔ ٹی وی فوراً چالو ہو گیا۔ مگر اس کا یہ مطلب نہ نکالا جائے کہ پاکستان کے جہاز میں نصب ٹی وی سیٹ کی طرح پاکستانی عوام بھی ڈنڈے کی زبان سمجھتے ہیں اور لہذا ایوبی مارشل لاء بہت جائز تھا۔ ہمیں گلی کی سطح پر رائج اس طرح کی مثالوں سے بہت گمراہ کیا جاتا رہا ہے۔

۔۔۔میں نے چپکے سے اپنی چھ جنم کی ساتھی کو بتایا: ''جہاز اتر رہا ہے۔''

''ویلکم ٹو اسلام آباد''۔ اُدھر سے جام ٹکرائے۔ ''تمھارے پہلو میں ہمیشہ کی طرح یہ سفر بھی بہت آرام دہ گزرا۔ تم نے سوٹ کیوں نہیں پہنا؟''

''یہاں تک تو قمیص شلوار میں آیا ہوں۔ آگے چین میں سنا ہے سردی ہے وہاں گرم کپڑے ہی پہننے ہوں گے۔''

3۔ سرسبز رہو گی

اسلام آباد ائیر پورٹ پہ ہجوم کے اندر ہم اپنے نام کا پلے کارڈ ڈھونڈ رہے تھے کہ ''پروفیسر مری'' پکار کر ایک شخص بغل گیر ہو گیا۔ وہ پتلون زیب تن کئے ہوئے ایک سندھی تھا۔ پوچھا تو اس نے تصدیق کر لی۔ ''میرا نام میر نواز ہے اور میں سولنگی قبیلے سے ہوں''۔ ''ارے بھئی سندھی تم کہاں، اسلام کہاں اور آبادی کہاں؟ یہاں تو صرف انہی کو ہونا چاہیے جن کے لیے یہ بنایا گیا تھا!!''۔ وہ ایسی مسکراہٹ مسکرایا جس میں 75 فیصد سندھی پن تھا۔ مگر ایک چوتھائی اسلام آباد پن آ چکا تھا۔ راستے میں اس نے افتخار عارف کا نام لے کر کہا''۔۔۔۔۔اس ایک شخص کی وجہ سے ابھی تک ٹکے ہوئے ہیں۔ وگرنہ کب کی چھٹی ہو گئی ہوتی یا کب کے چھوڑ چکے ہوتے''۔ سندھی جب بھی بلوچ سے ملے گا محبت سے ملے گا۔ اس لیے کہ سسی، شاہ لطیف اور مستیں توکلی ان دو قوموں کی دوستی صدیوں پہلے پکی کر چکے تھے۔ میں اور میر نواز تو محض ان صوفیوں، ولیوں کی سنّت پہ چل رہے ہیں اور چلنے پہ پابند ہیں۔ ______

چھنا کا ہوا: ''سنو، وہاں میری محبت کی اچھی طرح دیکھ بھال کرتے رہنا۔ اسے نظر انداز کبھی نہ کرنا۔ چین بہت خطرناک ملک ہے پاکستانی محبوباؤں کے لئے۔ وہاں تم جیسے نام نہاد پیروں کا زہد بہت جلد ٹوٹ جاتا ہے اس لئے کہ ان کے ہاں دو ہزار برس قبل مسیح ہی سے باقاعدہ حکومت موجود رہی ہے۔ (ان میں سے اولین ''سیا'' سلطنت تھی۔) یعنی وہاں چار ہزار برس تک بادشاہت رہی ہے۔ اور بادشاہوں کی ملکائیں حسن اور دلکشی کی تراکیب اور کاسمیٹکس ایجاد کروانے کے علاوہ کچھ بھی نہیں کرتی تھیں۔ اس طرح وہاں حسن سازی کا کام چار ہزار برس سے منظّم طور پر، اور ریاستی پشت پناہی میں جاری ہے۔ اس کے علاوہ اس ملک میں موجود 56 قومیتوں کا حسن باہم مدغم ہو چکا ہے۔ پھر اس کی سرحدیں دنیا کے دیگر کسی بھی ملک کی نسبت زیادہ ملکوں سے ملی ہوئی ہیں۔ اس لیے اس کے اپنے حسن میں شمالی کوریا، منگولیا، کزاخستان، تاجکستان، کرغزستان، روس، افغانستان، پاکستان، انڈیا، نیپال، بھوٹان، جاپان، برما اور ویت نام کا حسن بھی شامل ہے۔ لہذا میں وہاں کی حسیناؤں سے حسد تو محسوس نہیں کر رہی مگر تمہاری حسن پرست فطرت سے بہت پریشان ہوں۔ اس پر طرہ یہ کہ تم بہت پسماندہ وطن سے وہاں جا رہے ہو۔''

''بے غم رہو جان۔ ہم صدیوں پرانے دوست ہیں۔ محبت پہ بھروسہ رکھو گی تو سرسبز رہو گی''۔

4۔آباد جنگل میں ایک آدھ شیر

ہم رائٹرز ہاؤس پہنچ گئے۔اس ہاؤس کے نگراں عطاء اللہ نامی ایک جمالی ہیں اوستہ محمد کے۔ظفر اللہ جمالی کے بھرتی کردہ ہیں۔ان کی یادوں میں BSO بسی تو ہوئی ہے مگر وہ ایسی جگہ آگئے ہیں جہاں بہت سی چیزوں کا، باتوں کا' کاموں کا، ناموں کا ستیاناس ہوجاتا ہے ۔ جمالی بتاتے ہیں کہ اسلام آباد میں اکا دکا بلوچ پائے جاتے ہیں ۔رات کو کھانے پر افتخار صاحب نے بتایا کہ اسلام آباد کے جنگلوں میں ایک آدھ شیر بھی دیکھا گیا ہے۔۔۔۔۔۔تو ہمیں جمالی کی بات یاد آئی۔بس یاد آئی۔اس میں فلسفہ کیا تلاش کیا جاسکتا ہے۔

''میرا کمرہ نمبر 214 ہے۔''

''اپنے ہم سفر ساتھیوں سے ملے ہو؟''اس نے پوچھا۔

''ابھی نہیں ۔ میں ان سب لوگوں کے لئے اجنبی ہوں اور وہ بھی میرے لئے انجانے لوگ ہیں۔ایک ہی آئے ہوئے ہیں۔فرنٹئر کے پختون ہیں۔ بیرا بتاتا ہے کہ لمبی سفید داڑھی والے ہیں وہ۔کراچی کے مشتاق یوسفی سنا ہے 80 برس سے زائد کے ہیں ۔ وہ ایک گھنٹہ میں پہنچنے والے ہیں ۔ایک اسلام آباد کے ہیں۔لاہور سے سلیم اختر نامی ایک صاحب ہیں،وہ بھی ابھی نہیں پہنچے۔''

''اوہ۔ میں خوش ہوئی ۔تم جہاں جاتے ہوایک ملاّ ڈھونڈ لیتے ہو۔مگر مجھے یقین ہے کہ وہ ملاّ کے بھیس میں ایک اور شاہ محمد ہوں گے۔اور اگر نہیں ہے تو 23 صوبوں والے ملک میں تمہارے ساتھ رہ کر وہ تمھارے جیسے ہی بن جائیں گے۔شرط لگالو۔''

''ہوسکتا ہے۔۔۔۔ میں ابھی ان سے ملا نہیں ہوں ۔رات کے کھانے پر ان سے ملاقات ہوجائے گی۔ یہ کھانا اکیڈمی آف لیٹرز کے چیئر مین کی طرف سے ہے۔''

''ان کے بارے میں تو تم نے کچھ بتایا ہی نہیں!''

''افتخار عارف ہے نام ان کا۔میں زیادہ جانتا نہیں انہیں ۔ایک دو بار جب کوئٹہ آئے تو مریدوں کی طرح عبداللہ جان سے ملنے ان کے گھر چلے گئے۔ان کی یہی ادا اچھی لگی مجھے۔وہ مجھے اس طرح جانتے ہیں کہ جب بیس پچیس برس قبل وہ لندن میں مقیم تھے تو اس زمانے میں کچھ بلوچ بزرگوں نے ان سے میری تعریف کی تھی ۔شائستہ آدمی ہیں ۔انسائیکلو پیڈیائی ذہن رکھتے ہیں ۔ شاید ترقی پسند بھی ہیں۔ بلوچ عوام سے دوستی رکھتے ہیں ۔۔۔۔ریڈیو اور ٹی وی سے پرانی وابستگی رہی۔بہت محفلی آدمی ہیں،خوش گفتار، مجلسی۔گھنٹوں باتیں کرتے رہیں گے بور کئے بغیر۔درمیان درمیان میں شاعری کے ٹوٹے ،اچھے فقرے، ضرب الامثال بھی جوڑتے رہیں گے۔باسٹھ سالہ افتخار عارف ملکی اور غیر ملکی درجنوں ادبی اور کلچرل تنظیموں کے''تاحیات''رکن اور عہدیدار ہیں۔شاعر ہیں۔ان کے چار مجموعے چھپ چکے ہیں:''مہرِ دونیم''۔''بارھواں کھلاڑی''،''حرفِ باریاب''، اور''جہانِ معلوم''۔افتخار عارف دنیا بھر میں اتنا گھومے ہیں کہ آپ جہاں جانا چاہتے ہوں۔ان سے ضرور مشورہ کرلیں ۔وہ آپ کو یہ تک بتادیں گے کہ اچھی ٹائیاں کہاں ملتی ہیں۔۔۔۔۔

5۔آں صد شلی تو یک شلی

''اچھا۔اب میں ڈنر کے لئے جا رہا ہوں بیوروکریسی کے اڈے،اسلام آباد کلب ،میز بان ساتھ ہیں اور باقی ہم مہمان ہیں_____ سب سے کم سن بوڑھا میں ہوں۔''

''ارسٹوکریٹوں کے شہر میں وادی کی لڑکی کو نظر انداز مت کرنا۔''

ہم نے افتخار صاحب کی میٹھی باتوں اور درمیان درمیان میں یوسفی صاحب کے عطر

بھرے چٹپٹے جملوں میں کھانا کھایا۔ بیوروکریٹوں کی آئی ہوئی ''عورتیں'' نگاہیں برابر اپنی طرف کھچواتی رہیں۔ ''تتلیاں ہیں یہ۔۔۔۔۔سوشل تتلیاں۔ پاؤڈر لگی مصنوعی پلاسٹکی تتلیاں۔۔۔پولٹری فارم کی مشینی، غیر قدرتی حسن کی دعویدارنیاں۔ کہاں یہ ''سو''شلی اور کہاں تم ''ایک''شلی؟ (شلی کلاسیکل بلوچی شاعری میں ایک شاعر کی محبوبہ کا نام تھا)۔

''ارے چھوڑو ان بھینسوں کو۔ سناؤ ننھی چڑیا کا کیا حال ہے؟ وہ، جس کا خوبصورت گول چہرہ ہے، ٹائیڈی سا، ہلدی سا گورا، دودھ سا چٹا، چاند چہرہ۔۔۔۔''

6۔سنگت منی امبل منی

رات کو ایک بجے تک اکیڈمی کی طرف سے وفد کے دوسرے ساتھیوں کے مہیا کردہ حیات نامے (C V) پڑھتا رہا۔

''مشتاق احمد یوسفی کی پیدائش اگست 1923 کی ہے''۔

یعنی وہ بیاسی برس کے ہیں۔ میں نے آگے پڑھنا موقوف کر دیا اور ایک لمحے کے لئے سوچ میں پڑ گیا کہ اس عمر میں اتنی سرگرمی کہ وہ بیرون ملک سفر بھی کر سکیں۔

''وہ فلسفہ میں ایم اے ہیں'' پڑھ کر میں واقعی خوفزدہ ہو گیا اور توکلی مست سے دعا کرنے لگا کہ وہ میری مدد کو آئیں۔ مگر جب یہ پڑھا کہ وہ اوپر سے ایل ایل بی بھی ہیں تو مست کو ناکافی سمجھ کر پیرو لال خان کو بھی ''المدد المدد'' کا سگنل دے دیا۔ ابھی سنبھلنے نہ پایا تھا کہ اگلا فقرہ پڑھ کر اپنے ولی اللہ جیسے پہنچے ہوئے اجداد شادیہان، دلیل خان (اور روز یر خان کو بھی) ''یادادامدد، یادادامدد'' کی صدا دی۔ فقرہ تھا: ''وہ بہت سے بنکوں کے سربراہ رہے ہیں''۔ یااللہ، بزرگ سن، فلاسفر، وکیل، بینکر، یہ میں کدھر پھنس گیا۔ اوپر سے بارہ مکمل برس لندن میں گزار چکے ہیں۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ وہ وفد کے سربراہ کی حیثیت سے وقت کی سخت پابندی کرائیں گے، مسکراتے ہوئے بھی یہ سوچیں گے کہ یہ صبح کی مسکراہٹ ہے یا شام کی۔ دلیل دو تو وکیل کی سی جوابی کارروائی کریں گے۔ اور جہاں دیدگی کا دبدبہ الگ۔ ان سب سے ہم اچھی طرح نمٹ سکتے تھے مگر دو چیزوں کے سامنے جانے سے تو ہمارے پر جلتے ہیں۔ اول یہ کہ علم کے سامنے ہم مرغی بن جاتے ہیں اور، دوئم: بزرگ سنی بن بتائے ہمیں ''چھوٹو'' بنا ڈالتی ہے۔ ان کی کتابیں ہیں: ''چراغ تلے''، ''خاکم بدہن''، ''زرگزشت'' اور ''آبِ گم''۔ شام کے وقت افتخار عارف نے تلقین کی: ''شاعروں سے کتاب کا فاصلہ رکھنا چاہیئے''۔ اور اس پر یوسفی صاحب کا لقمہ تھا: ''خوبصورت عورت سے شوہر کا فاصلہ رکھنا چاہیئے''۔ دل چاہا کہ پوچھوں: ''اور تنہا عورت سے؟'' مگر پوچھا نہیں کہ کہیں اردو ادب یا ان بزرگوں کے ادب میں بے ادبی سرزد نہ ہو جائے۔

''عبدالمجید کے بیٹے داور خان داؤد فروری 1940 کو لنڈی ارباب پشاور میں پیدا ہوئے۔'' میں نے لاحول ولا کا اردو ترجمہ پڑھا۔۔۔ اس لیے کہ اس طرح وہ بھی 64 برس کے نوجوان ہیں۔ ایک تو بزرگ اوپر سے پختون۔ اس قدر خطرناک C V والے شخص!۔ داور صاحب ایم اے سے تین بار شبِ عروسی منا چکے ہیں۔ ایک دفعہ انگریزی میں، ایک دفعہ پٹھان بن کر اور ایک بار اردو میں۔ وہ انگلش کے ایسوسی ایٹ پروفیسر ریٹائر ہو چکے ہیں۔ (میں سوچ میں پڑ گیا: ٹائر اور ''ری ٹائر'' کا آپس میں تعلق کیا ہے؟)۔ نعت لکھنے پر صدارتی تمغہ لے چکے ہیں (میرے واقف کار میری حالت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔ اگر چار موٹے موٹے آدمی ڈنڈے لیے ایک لاغر کتے کو گھیر لیں تو وہ دفاع میں جس طرز کی مسکین بتیسی دکھا کر بھونکتا ہے۔ وہی روہانسی صورت ہماری تھی۔) ادب پر پرائڈ آف پرفارمنس بھی حاصل کر چکے ہیں۔ (بلوچی میں کہتے ہیں میں تم سے ہی بیزار تھا تم نے بیٹا بھی پیدا کر دیا)۔ وہ تراجم بھی کرتے ہیں۔ (یا اللہ اگر خیر سے واپس آؤں تو کالی بکری خیرات کروں گا)۔ باریش، نعت نویس،

تمغہ یافتہ، ریٹائرڈ ٹیچر، تین ایم اے پٹھان____ خدا کس جنم کے گناہوں کی سزا کس جنم میں جا کر دیتا ہے!!

محمد اظہار الحق (نام ہی خطرناک ہے____ محمد ضیاء الحق کا ہم وزن)۔ان کو اسلام آباد سے چنا گیا ہے۔ظاہر ہے کہ ان کے سارے لچھن اسلام آباد والے ہی ہونے تھے ۔ان کی دی گئی سوانح حیات سے معلوم ہوا کہ موصوف ایم اے کو دو بار نشانہ بنا چکے ہیں۔ایک دفعہ یضربُ یضربا' یضربو (عربی) میں اور دوسری بار ''نم نمے اکاسی بلی تیری ماسی'' (معاشیات) میں۔بظاہر افلاک کے آئی ایس آئی نے عرشِ معلٰی پر ہی ہمارے لیے ایک بور ترین سفر کے سارے انتظامات کر رکھے تھے۔اظہار بھی ہم سے بڑے ہیں۔یعنی ہم پورے سفر میں کسی کو ''تم'' نہ کہہ سکیں گے۔بلوچ مامامارا گیا۔اسے ایسی نستعلیقی اردو کہاں آتی تھی۔سو ''جاہلِ مطلق'' کی چہار دستخطی سند ملنی تھی ہمیں۔اظہار صاحب بھی شاعر ہیں۔اور شاعری پر دسترس نہ ہونے کی وجہ سے میں ہمیشہ شاعروں کا احترام کرتا ہوں۔(ہماری الہامی کتابوں میں شاعروں کی تعریف تو موجود نہیں ہے!!)۔ان کے ایک نہیں، دو نہیں، پورے چار مجموعے چھپ چکے ہیں۔تخیل کی بلندی تو کتابوں کے نام دیکھ کر آپ خود ناپ لیں: ''دیوارِ آب'' (یعنی پانی کی دیوار۔۔۔۔ارے ایسے نہیں۔آنکھیں بند کر لیجئے اور اپنے سارے مرشدوں کو پکاریے، اگر آپ میں سے کوئی پانی کی آدھ انچ بلند دیوار بھی بنا لے تو ''پنڈی کے بادشاہ ساز ہاؤس'' ننگے پاؤں جا کر گڑگڑا کر آپ کے لئے وزارت مانگ لوں گا)۔دوسرے شعری مجموعے کا نام ہے ''پری زاد''۔اگلی کتاب ''غدر'' اور پھر ''پانی پہ بچھا تخت''۔(ہوا میں تیرتا تخت تو سنا تھا مگر آبی بادشاہ اور وہ بھی اسلام آباد میں جہاں نہ سمندر ہے نہ دریا۔یہ کتاب میں ضرور پڑھونگا۔شاید گوادر پر لکھی گئی ہو)۔لیکن سچی بات یہ ہے کہ جب مست نے سمو سے اپنی محبت پہ احباب کے اعتراضات اور تنقید سنی تو بہت پیار سے بولے تھے: ''میں تمہاری آنکھوں پہ قربان جاؤں' ان آنکھوں نے سمو کی مدھر چال تو دیکھی ہی نہیں ہے۔'' یہ اظہار الحق بہت خوبصورت شاعر ہیں۔

اظہار صاحب بھی داور خان کی طرح پکے نمازی اور سُچے (نرے) پرہیزگار ہیں۔ داڑھی ان کی بھی سفید ہے مگر پٹھان کی لمبی سادی داڑھی جیسی نہیں بلکہ جماعت اسلامی، یا ڈگری یافتہ شہری اور جہاں گر دیدہ مولویوں کی خط کی ہوئی داڑھی ہے۔اور ایسی داڑھی کو خطرناک ترین منصوبوں سے بھرے ذہن کی علامت سمجھا جاتا ہے۔اوپر سے یہ اکیس گریڈ کے وفاقی افسر ہیں، اسلام آباد والے۔اس درجے پر پہنچ کر تو زندگانی کی ہر چیز اکیس گریڈ والی بن جاتی ہے۔حتیٰ کہ ان اکیس گریڈیوں کا پاسپورٹ بھی ہم ''پاکستانیوں'' کے پاسپورٹوں سے مختلف ہوتا ہے۔رنگ میں بھی، کرتوتوں میں بھی اور معجزات میں بھی۔

داور صاحب اور اظہار صاحب کی موجودگی میں افتخار عارف نے وفد کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہا ''ہمارا یہ وفد ہمارے آج کے حالات کا بہت خوبصورت ترجمان ہے۔ دوار کان تو نظر ہی القاعدہ والے آتے ہیں!''۔اظہار صاحب نے تو وضو اور مسح کے لئے بوٹ کے اندر موزے بھی پہن رکھے تھے اور وہ کھانے کے دوران چین میں اپنی نماز کی بروقت ادائیگی کے بارے میں اچھے خاصے پریشان رہے۔اور ہمارا ایک پورا ''پندرہ منٹی'' وہ اپنی اسی فکرمندی میں غرقاب کر گئے۔یہ سیشن اس وقت ٹوٹا جب میری بے ادبی کی انتہا ہو چکی تھی اور میری کم وقفوں پہ، اور پرشور جمائیوں نے ماحول کو بہت غیر دوستانہ بنا دیا۔میں اس قدر بڑا منہ کھول کر جمائیاں لیتا گویا کہ اظہار صاحب کو بمع داور صاحب کے زندہ سلامت ہڑپ کرنا چاہتا ہوں۔افتخار صاحب جو پہلے گفتگو میں پکے نمازی بن چکے تھے، ہماری عدم تشدد بھری عدم تعاونی تحریک بھانپ گئے تو قضا پڑھنے نہ پڑھنے کے موضوع کو بڑی اسلام آبادی استادی کے ساتھ داخل دفتر کر کے محفل کا تقدس بحال کر دیا۔

سلیم اختر کا تعلق لاہور سے ہے۔مگر جس طرح اظہار صاحب اسلام آباد کے نہیں اٹک کے ہیں، مشتاق صاحب کراچی کے نہیں ہندوستان کے ہیں، داور صاحب پشاور کے

نہیں لنڈی ارباب نامی گاؤں کے ہیں ،اور میں کوئٹہ کا نہیں ماوند کا ہوں، اسی طرح سلیم صاحب بھی لاہور کے نہیں، اُدھر والے پنجاب کے ہیں۔(اربنائزیشن، مائیگریشن ______ انسان ایک جگہ ٹکتا ہی نہیں)۔سلیم صاحب اس قدر زیادہ اوراس قدر کثیر پہلو موضوعات پہ لکھ چکے ہیں کہ ان کی اپنی شخصیت ان تحریروں میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔اب بھلا ساٹھ کتابیں کوئی کیونکر لکھ سکے گا۔اوراس بسیارنویسی میں معیار کے ستیا کوناس ہونے سے بچاؤ کی کیا تدابیر کی ہونگی۔سلیم اختر اپنی بھرپور کوشش کے باوجود اپنا CV دوصفحات پر عملے کومہیا نہ کر سکے۔اوراردو میں پندرہ بیس صفحے کا ایک پلندہ فوٹوسٹیٹ کر کے پکڑا دیا۔میں نے بہت غور کرنے کے بعد انکی ساٹھ عدد تصانیف کی لسٹ کو یہاں نقل کرنے کا ارادہ ترک کردیا۔سلیم اختر گورنمنٹ کالج لاہور سے ایسوسی ایٹ پروفیسر ریٹائر ہو کر وہیں کنٹریکٹ (ٹھیکہ) پر وزٹینگ پروفیسر کی حیثیت سے پڑھاتے ہیں۔وہ ایم اے اور ایم فل کو پڑھاتے ہیں۔ڈاکٹر اس لیے کہلاتے ہیں کہ اردو میں پی ایچ ڈی ہیں۔1934 کی پیدائش ہےیعنی مکمل ستر برس کے ہیں۔

ان سترے بہترے لوگوں کے درمیان اگر ایک دلربا کی روحانی رفاقت نہ ہوتی تو ہمیں خشکی کے ہاتھوں موت آ جاتی اور ہم چین میں بدھ مت والوں کی طرح تکفین پاتے۔(گوکہ میرے سارے خدشات کوچھٹ جانا تھااور مجھے دنیا کے بہترین رفقائے راہ کی نعمت ملنی تھی)۔

میں رائٹرز ہاؤس کے کمرہ نمبر 204 کی بتیاں بجھا کرسوگیا۔

مجذوب بیوروکریسی کا شہر اسلام آباد

1۔میلی تاریخ بدلتا جغرافیہ

سورج نے جونہی مارگلہ کے دامن میں جھانکا، اس سحر طراز، ستار آواز فنکارہ نے ''چھن'' کہا اور میں جاگ گیا: ''کھڑکی سے باہر دیکھو۔سنو، درختوں پہ پرندے کیا گا رہے ہیں۔۔۔۔وہ سب میری نمائندگی میں تمہیں کہہ رہے ہیں، صبح بخیر جان!۔۔۔۔۔محبت کے ایک اور دن پہ خوش آمدید!۔۔۔''

اسلام آباد کی صبحیں کتنی مسحور کن ہوتی ہیں۔آج فراغت کا دن ہے۔میں نے آرام سے ناشتہ کیا۔رپورٹنگ سے پاک، تجزیہ سے مبرا، اور خالص پریس ریلیزوں پہ مشتمل پاکستانی اخبار پڑھا۔رائٹرز ہاؤس اسلام آباد کے ٹی وی پر صرف ایک چینل آتا ہے اور وہ بھی پی ٹی وی۔اور پی ٹی وی صرف اور صرف جہالت نشر کرتا ہے۔اس لئے اے لوگو! پی ٹی وی بلوچستان کے لئے کسی کام کی نہیں اور بلوچستان پی ٹی وی کے لئے بے کار ہے۔وہ ہمیں کیا جاہل بنائے گی کہ ہم تو آئے ہی اس صوبے سے ہیں جہاں ایم ایم اے کی حکومت ہے، اکیسویں صدی میں۔

اسلام آباد کی کل عمر مبلغ تیس برس ہے۔ان تیس برسوں میں بھی یہ کئی سالوں تک ایک غیر آباد تعمیراتی علاقہ ہی رہا۔اور اس پہ، ثقافت، تہذیب، ادب اور انسانیت سے عاری ایک ہی طبقہ حاوی رہا۔جی ہاں وہی طبقہ جس نے پاکستان کا بھٹہ گزشتہ پچاس برسوں سے بٹھائے رکھا ہے۔یہ بیوروکریٹوں کا طبقہ ہے۔دنیا کے ہر ملک کی بیوروکریسی بالعموم، اور پاکستانی بیوروکریسی بالخصوص ذہنی معذوروں پر مشتمل حاکم گروہ ہے۔یہ ایک ایسا فتویٰ ہے جسے تاریخ کی سائنس نے زیارت ریذیڈنسی، لیاقت باغ، خواجہ نظام الدین کے نام سے، تارا مسیح کی شخصیت میں، بہاولپور کے کھیتوں میں اور حکومتی سربراہوں کی جلاوطنیوں اور دو دو ماہ کی وزارت عظمیٰ گیری نے ایک سائنسی حقیقت ثابت کر دیا ہے۔جغرافیہ کی سائنس کا ذکر ہی کریں۔تو بنگلہ دیش کا نقشہ ذہنوں میں ابھر آتا ہے۔اس مجذوب بیوروکریسی نے بہت چابک دستی سے ملک کا دارالحکومت ایک دھتکارے ہوئے صوبے سے نکال کر ملک کے واحد مقتدرہ صوبے میں منتقل کر دیا۔ساتھ ہی بہت ڈھٹائی سے پورے وسطی ایشیا کے عوام کے عقیدے کا نام اس سے وابستہ کر دیا۔لیکن پاگلوں کی حرکتوں سے بھلا انسانی چال ڈھال بدل سکتی ہے کیا؟ لہٰذا یہ شہر نہ ''اسلامی'' بنا، اور نہ ''پاکستانی''۔ضیا کی کھچڑی بنا اسلام بھی، آباد بھی۔یہ بے چارہ شہر تو ''پنجاب آباد'' بھی نہ بن سکا جہاں کہ یہ جغرافیائی طور پر واقع ہے۔محض ایسے پہلوانوں کا اکھاڑہ ہے ہمارا دارالخلافہ، جن کے پیر دھرتی سے برسوں پہلے اکھڑ چکے ہیں۔جن کا انسپریشن کا منبع پاکستان اور اس کے عوام سے کوسوں دور کہیں اور واقع ہے۔جنہوں نے اس ملک کو پسماندہ رکھ رکھ کر اس کی پسماندگی پہ زندگی بھر ٹسوے بہاتے رہنے کا بہانہ پیدا کیا اور

مغربی ممالک میں اپنے بچے بھیجتے رہنے کا جواز بنا دیا۔ بے یقینوں، بے کلچروں، بے یاروں، بے ملکوں، بے مریدوں، بے عقلوں کا اکھٹ ہے اسلام آباد۔

2۔ میر بہار خان کو ساتھ لوں گا

پائل چھنکی اور میرے کانوں نے پسندیدہ ترین آواز سنی: ''سنو۔ تم نے اپنا شیڈول تو بتایا ہی نہیں۔ لیکن اگر فارغ ہو تو ہزاروں برس پرانے چین جانے سے قبل اس نومولود شہر اسلام آباد کی بھی سیر کر لو۔ سطح مرتفع پوٹوہار کے سرے پہ واقع یہ شہر اپنی کم سنی کے باوجود ہزاروں برس کی تاریخ کے حامل علاقے میں واقع ہے۔ جڑواں شہر راولپنڈی پتھروں کے دور سے انسانی تہذیب کا مسکن رہا ہے۔ پندرھویں صدی قبلِ مسیح میں وسط ایشیاء سے آریائی آ کر اس خطے میں آباد ہوئے۔ سکندرِ اعظم، چنگیز خان، محمود غزنوی اور تیمورِ لنگ جیسے بدنام زمانہ ڈاکو اپنے اپنے ادوار میں اس سرزمین پہ شب خون مارتے رہے۔ 1849 میں یہ علاقہ سکھوں کی دستبرداری کے بعد انگریزوں کے زیرِ سایہ آ گیا۔ ایک صدی بعد جب اس مرغزار کو پاکستان کے دارالحکومت کے طور پر منتخب کیا گیا تو نئے شہر کا ماسٹر پلان تیار کرنے کی ذمہ داری یونانی ماہر تعمیرات کی ایک فرم کو سونپی گئی، جس نے بہت قرینے سے شہر کو سیکٹروں میں تقسیم کیا۔ 910 مربع کلومیٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا یہ شہر سطحِ سمندر سے تقریباً 475 سے 610 میٹر کی بلندی پہ واقع ہے۔ لو، ہم نے ساری باتیں یہیں کر لیں تو شہر کب دیکھیں گے! اپنے دوستوں کو فون کرو، ان کو وزٹ کرو، شہر میں گھومو پھرو۔ دامنِ کوہ جاؤ، شکر پڑیاں جاؤ۔۔۔ چونکہ اتوار ہے اس لیے یونیورسٹیاں تو نہ دیکھ پاؤ گے۔ مگر مارکیٹیں دیکھو، لوک ورثہ چلے جانا_____ اور مجھے ساتھ لے کر جانا۔''

بات ہماری بلوچ کھوپڑی میں آ گئی۔ میرے ذہن میں وسیم اشرف کا مسکراتا چہرہ آیا۔ وسیم اشرف اصلی لاہوری نوجوان ہیں۔ این جی اوز میں بڑی تنخواہوں پر کام کرتے ہیں۔ بلوچستان میں رہ چکے ہیں۔ بلوچ عوام سے محبت کرتے ہیں۔ اور ہماری طرح ڈاکٹر سید امیر الدین کے مرید ہیں۔ انہیں فون کیا۔ مگر وہ لاہور گئے ہوئے تھے۔ پھر قاضی عثمان کو تلاش کرنے کی ٹھانی۔ قاضی عثمان میرے سٹوڈنٹ ڈاکٹر قاضی سلیمان کے بڑے بھائی ہیں۔ اپنے والد قاضی فضل الرحمٰن ہی کی طرح زبردست دانشور ہیں۔ خود بہت اچھے سفرنامے لکھتے ہیں۔ انہیں ڈھونڈا، مگر ان کا موبائل ''کوئٹہ'' بول رہا تھا۔۔۔ اب کیا کرتا؟ مدد کے لئے دوبار ولی اللہ سسی کو پکارا اور اپنے فون پہ پھونک کر رانا شفیق کا نمبر ڈائل کیا۔ کہ شاید وہ ہی مل جائیں۔ وہ ایک ڈایا گناسٹک کمپنی کے مالک ہیں۔ جس چابک دستی اور استادی سے اپنے پراڈکٹ بیچتے ہیں، ذاتی زندگی میں اس قدر استادی نہیں کرتے۔ اچھے پنجابیوں کی طرح اچھے انسان ہیں۔ وہ مل گئے۔ صحیح سلامت، ہشاش بشاش، چاک و چوبند۔ آن کی آن میں آن موجود ہوئے۔ اور اپنی کار میں بٹھا کر سارا اسلام آباد گھما لائے۔

3۔ چودہ اونٹ بھی کم ہیں

اسلام آباد قدرتی مناظر کے لحاظ سے مالا مال علاقہ ہے۔ اس شہر کی ایک جانب ایک چھوٹی سی پہاڑی ہے۔ جسے یہ پنجابی لوگ ''کوہ'' کہتے ہیں۔ ان کے پاس پہاڑ ہیں ہی نہیں لہذا یہ ہر ٹیکری کو کوہ بولتے پھرتے ہیں۔ اسلام آباد کا ''دامنِ کوہ'' بہت مقبول پکنک گاہ ہے۔ اس پہاڑی پر سے آپ اسلام آباد کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ پہاڑی پہ موجود کسی ریسٹورنٹ کے سامنے کرسیاں نکال کر بیٹھ جایئے اور چائے کی (جی ہاں، چائے کی) چسکیاں لیتے ہوئے

خوبصورت مناظر سے لطف اندوز ہوجایئے۔

رانا صاحب نے شکر پڑیاں کی پہاڑیاں دکھائیں، ان پہ اتوار کے دن والا رش دکھایا اور وہ جگہ دکھائی جہاں لوگ اپنے پیاروں کے لئے چھوٹے چھوٹے تحائف خرید رہے تھے۔ یہاں سیڑھیوں پر ''کی چین'' ملتے ہیں اور خواتین کے بالوں کے ''کلپ'' بکتے ہیں۔ ان کی خصوصیت یہ ہے کہ ''کی چین'' پہ مردانہ نام اور ''کلپ'' پر خواتین کا نام لکھا ہوتا ہے۔ آپ اپنا پسندیدہ نام پکاریں، دکاندار آپ کو اس نام کا کلپ یا کی چین ڈھونڈ کر دے دیگا۔ میں نے سوچا کہ اسلام آباد میں شاہ محمد والے نام تو بہت کم ہونگے۔ مگر میں نے جب اپنا نام بتایا تو دکاندار نے فوراً ایک کی چین ڈھونڈ کے دی جس پر شاہ محمد کندہ تھا۔ ہم نے وہ بھی خریدی اور ایک خواتین والا ''کلپ'' بھی خرید لیا۔ جس پر میرے پھیپھڑوں کی آکسیجن کے مالیکیول کا اسم اعظم لکھا ہوا تھا۔ کی چین کو مارو پھول، مگر جس گرمی گرم جوشی سے میں نے کلپ تھامی اور جس تکریم سے میں نے اسے جیب میں رکھا، رانا شفیق بھانپ گیا۔ پتہ نہیں انسان ایسے موقع پر چور نما کیوں لگتا ہے!! ہم نے گھوم پھر کر واپسی پہ وہ ''کلپ'' دکاندار کو مفت واپس کر دیا کہ کہیں کسی موزوں ''نوجوان'' کو اس نام کے ''کلپ'' کی ضرورت پڑے گی۔ اور مبادا اسے نہ ملے۔ ہم تو ویسے ہی مست کے بقول ''روحوں کے آوارہ'' ہیں۔

وگرنہ دل چاہے، دوستوں سے کہوں:
''اپنے اپنے چاقو نکال لو اور اونٹوں کے مہار کاٹ دو۔
یہ چودہ کی چودہ اونٹنیاں میری محبوبہ کی ایک قمیض بھی نہیں ہوسکتی ہیں۔
اور اگر (ان کی فروخت سے) کچھ رقم بچی تو اپنے لیے ایک صدری خرید لوں گا
اور صدری کی جیب میں اپنی محبوبہ کے لئے مصری ڈال کر لے جاؤں گا۔

4۔ اسلام آباد میں بلوچستان

خالص بیوروکریٹوں کے اسلام آباد کو البتہ پاکستانی اسلام آباد بن جانے میں بہت سست رفتار پیش رفت کا سامنا ہے۔ ایک تو اصلی نقلی الیکشنوں میں ''منتخب'' ہونے والے اوپری طبقات سے وابستہ لوگ چاروں صوبوں سے یہاں نظر آنے ہی لگے ہیں۔ آدھا پونا وزیر بھی یہاں آجاتا ہے۔ اس وزیر کے ناخواندہ عزیز و اقارب اور اہلِ خانہ بھی اپنی منفرد وضع قطع میں یہاں کچھ تنوع پیدا کرتے ہیں۔ اسی طرح پاکستان سے ضرورت مند، درخواست گزار بھی کاسۂ گدائی لیے کسمپرسی میں اس کی سرسبز لانوں اور اجلی سڑکوں کو اپنی غربت، پسماندگی اور حسرتوں سے کچھ نہ کچھ میلا کر ڈالتے ہیں۔ گو کہ ضیاء الحق کی پیروی میں ہر سرکار سیرت کانفرنسوں اور مشائخ کانفرنسوں کے نام پر ہر قوم کے ملاؤں پیروں کے میٹنی شو یہاں منعقد کرتی رہتی ہے۔ علاوہ ازیں پچھلے ادوار میں اکیڈمی ادبیات کے نام سے ملاؤں پیروں کا بے ریش ورژن بھی قلم سوزی میں مگن رہا ہے۔ البتہ ثقافت وہ واحد شعبہ ہے جہاں آپ بلوچ کو، پٹھان کو، سندھی کو اور حتی کہ پنجابی کو بھی عربی لباس نہیں پہنوا سکتے۔ لہذا جب ''لوک ورثہ'' نامی ادارہ بنا تو تمام استادیوں کے باوجود وہاں لیاقت علی کا شیروانی اور محمد بن قاسم کے سندھ پر یلغاری لشکر کے یونیفارم بچ نہیں پائے۔ لہذا مجبوراً ہماری قومی ثقافتوں کی پیشی کرنے کا تلخ آب ہمارے مالک طبقات کو پینا ہی پڑا۔ ہم نے شکر پڑیاں کے قریب واقع لوک ورثہ کا یہ میوزیم دیکھا۔ یہ نیشنل انسٹیٹیوٹ آف فوک اینڈ ٹریڈیشنل ہیری ٹیج کی کاوش ہے اور ایتھنالوجی اور فولکلور کا ملک کا پہلا میوزیم ہے۔ یہ ہماری نا اہل حکومتوں کی پوری تاریخ کا سب سے پہلا اور اچھا حاصل ہے۔ اس میوزیم میں ملک کی مختلف اکائیوں کے طرز ہائے حیات دکھائے گئے ہیں۔ ان کے آرٹس، دستکاری اور بود و باش کے مظاہر دکھائے گئے ہیں۔

ہماری تہذیبی تاریخ کی عکاسی کی گئی ہے۔ یہ بہت وسیع، اس قدر خوبصورت اور جامع میوزیم ہے کہ آپ کو یقین ہی نہ آئیگا کہ آپ ''اسلام آباد'' والے پاکستان میں گھوم رہے ہیں۔ علاوہ ازیں اس میوزیم میں ''لوک ورثہ ساؤنڈ آرکائیو'' نامی ایک شعبہ میں پاکستان بھر سے تمام زبانوں کے لوک گیتوں، سازینوں اور انٹرویوؤں کو اکٹھا کیا گیا ہے۔ میوزیم میں ایک اچھی خاصی بڑی لائبریری موجود ہے۔ یہاں ایک آڈیو وژوئل شعبہ بھی ہے۔

وقت کی تنگی کے باوجود ہم یہاں مکمل دو گھنٹوں کی عیاشی کر بیٹھے۔ میرا میزبان اسی قدر محو اور مستغرق تھا جس طرح کہ خود میں۔ ہر چیز دلکش، ہر بات فطری۔ ہم نے یہاں بلوچستان کے ساحل کا عکس دیکھا، بلوچوں کی خانہ بدوش زندگی کے رنگ دیکھے، بلوچی دستکاریوں کے نمونے دیکھے۔ روایتی بلوچی کشیدہ کاری دیکھی، کھجوروں کے پتوں کی صناع کاری دیکھی۔ ہم نے ہانی شہ مرید کی گیلری دیکھی، ہم نے نڑ اور سُر کا گوشہ دیکھا۔۔۔۔ ہم نے بلوچستان دیکھا۔ ہم نے بلوچستان پہ اپنی وارفتگی دیکھی۔

رانا شفیق دوپہر کا کھانا کھلا کر ٹھیک ساڑھے چار بجے واپس رائٹرز ہاؤس پہنچا گئے۔ اس درمیان لمبے لمبے چنار کے درختوں میں سے خوشبو کی شیشیاں ضرور ٹکراتی رہیں: ''تم کہاں ہو dashing مسٹر بلوچستان؟''۔

''اچھا اب کہاں ہو، کون ہے تمہارے ساتھ؟ اسے لطیفے ضرور سنانا۔ بور نہ کرنا اسے۔''

شام چھ بج کر چالیس منٹ پہ پون گھنٹہ تک رابطہ نہ رہا تو میرے بائیں کان پہ چٹکی کٹنے والا درد ہوا: ''جان۔ یوں غائب نہ ہوا کرو۔ تم رات دس بجے کے بعد سارا وقت اپنے ہم سفروں کے ساتھ ہو گے۔ انسان کی بنائی سرحدوں نے میری جغرافیائی آزادیوں کو محدود کر دیا ہے۔ میں تمہارے ساتھ نہیں آگے جا پاؤں گی۔ لیکن اس سے پہلے تو تم میری نظروں سے اوجھل نہ ہو۔ تم اپنا نام ایک ایسے دل پہ لکھنے میں کامیاب ہو گئے ہو جو ہزاروں پردوں میں چھپا ہے، تم نے پنجرے میں قید پرندے کو آزاد اڑان کی مسرت سے آشنا کرایا ہے۔ تم نے میری روح پہ اپنا حق منوالیا ہے، میرے سارے غموں اور مسرتوں کے ڈکٹیٹر بن گئے ہو تم۔

روانگی سے قبل ہم نے رائٹرز ہاؤس کے ڈائننگ ہال میں کھانا کھایا۔

''سوا نو بج گئے ہیں۔ تم فلائٹ مس کر دو گے۔ ڈیڑھ گھنٹے سے بھی کم وقت رہ گیا ہے۔ تمہیں ایئر پورٹ جانا ہے، سارے ضوابط سے گزرنا ہے۔ خدانخواستہ ٹائر پنکچر یا کسی اور مسئلے کے لئے مارجن رکھو۔''

''تم فکر مند نہ ہو سنگت!، اس سلسلے کے سارے انتظامات پہلے ہی کئے جا چکے ہیں۔

5۔ چین میں بلوچستان

پونے دس بجے ہم اسلام آباد ایئر پورٹ کے وی آئی پی لاؤنج میں تھے۔ جہاز پہ سوار ہونے سے قبل چینی دوستوں سے مختلف موضوعات بالخصوص چین کی تاریخ پہ گفتگو ہوتی رہی۔ ان لوگوں کو اپنی ہزاروں برس پرانی تاریخ و تہذیب پہ فخر ہے۔ اور اسی فخر کو انہوں نے قومی اتحاد کے ایک اوزار کے طور پر اپنایا ہوا ہے۔

ان دوستوں نے ہمیں بتایا کہ چین کی جدید ترین تاریخ بھی چودھویں صدی سے شروع ہوئی ہے۔ ہم نے پہلے ہی سن رکھا تھا کہ خاندانِ منگ، اور خاندانِ قنگ نامی سلطنتیں رہیں ہیں چین میں۔

پہلی حکمرانی منگ خاندان کی تھی۔ بادشاہوں کا ان کا یہ خاندانی سلسلہ 1368 سے شروع ہوا جو ظلم کرتا، جبر بڑھاتا، استحصال کرتا تقریباً تین صدیوں تک بادشاہی کے مزے لوٹتا

رہا۔ جی ہاں تین سو برس ایک ہی خاندان کی بادشاہی۔ اور وہ بھی اکیسویں صدی والی پوپ کی ویٹیکن شہر کی بادشاہی نہیں جس کا کل رقبہ ہی اتنا ہے کہ ایک کونے سے چرواہا پتھر پھینکے تو جہاں پتھر گرے وہاں پوپ کی بادشاہی ختم۔ بلکہ منگ خاندان تین سو سال تک چین جیسے وسیع و عریض ملک پر بادشاہی کرتا رہا۔ دلچسپ یہ کہ آج جو ہم پورے جنوب مشرقی ایشیا میں اژدھا کی تصاویر ٹی وی پر دیکھتے ہیں، چینی کھیلوں میں دیکھو تو کہیں نہ کہیں اژدھا کے درشن ہو جاتے ہیں، عمارتوں کے دروازوں پر اژدھے، عمارت کے اندر دیواروں پر کندہ اژدھے، آرائشی محرابوں پر لپٹے ہوئے اژدھے، باغوں میں جھولوں، چھولداریوں، کشتیوں اور دیگر اشیا میں اژدھا نمایاں کر کے لگایا جاتا ہے (1)۔ اسی کے نام کے میلے ہوتے ہیں، چینی ادب اژدھا کی کرامتوں اور طاقتوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے۔ یہ سب کچھ اسی خاندان کی عطا/ مسلط کردہ ہے۔ اس لئے کہ مِنگ شہنشاہ خود کو ڈریگن (اژدھے) کی نسل قرار دیتے ہیں۔ (بلوچوں میں مزاری کو شیر کی اولاد قرار دیا جاتا ہے)۔

اس خاندان نے جاگیردارانہ محاصل اور محنت کو ملا کر واحد محصول تشکیل دیا جس کی ادائیگی چاندی میں ہوا کرتی تھی۔ کسانوں کو حکم تھا کہ وہ کپاس کی کاشت کریں۔ تاجروں نے پارچہ بافی کی فیکٹریاں قائم کیں جہاں بعض اوقات سینکڑوں افراد کام کیا کرتے تھے۔ بیرونی تجارت میں بھی ایک حد تک اضافہ ہوا۔

اس منگ خاندان کا تختہ 1644 میں منچوریا سے آنے والے حملہ آور مانچو نے الٹ دیا اور اپنی قِنگ یا مانچو حکمرانی قائم کی۔ یہ تاتاروں کی اولاد تھی۔ انہوں نے چینی تمدن کو پسند تو کیا مگر ان سے شادیاں نہ کیں کہ خون باہم نہ ملے (''خراب نہ ہو'')۔ انہی مانچو شہنشاہوں نے ترکستان، برما اور تبت پر قبضہ بھی کر لیا۔ اور اٹھارویں صدی کے آخر تک مانچو حکمرانی نیپال تک وسعت پا گئی۔

قارئین۔ آپ کنفیوز نہ ہوں۔ مانچو بادشاہوں کا دوسرا نام قِنگ حکمرانی تھی۔ جسے کچھ لوگ چھنگ بھی لکھتے ہیں۔ یہ تینوں نام انہی منچوریائی تاتاروں کے ہیں۔ چینی ہوٹلوں میں شوں شوں کرتی ہوئی منچورین ڈش آپ کھاتے ہیں نا! ادھر ہی کے لوگ تھے وہ۔

چار ہزار برس مسلسل بادشاہت کی غلامانہ زندگی گزار کر کہیں 1911 میں یہ لوگ بادشاہت کا تختہ الٹ سکے ہیں۔ تب انکا ملک ''ری پبلک آف چائنا'' بنا۔ اور 37 برس اس بورژوا ''ری پبلکی پن'' میں رہ کر 1949 میں ''پیپلز ری پبلک آف چائنا'' ہوئے ہیں۔ یعنی وہاں 50 برس سے ''عوامی جمہوری حکمرانی'' قائم ہے۔ چینی اپنی پوری تاریخ سے محبت کرتے ہیں۔ انہوں نے وہاں کی بلوچی زبان کی بجائے وہاں کے مہرگڑھ کو اپنی شناخت کا منبع بنا رکھا ہے۔ فیوڈل متحدہ چینی ریاست شہنشاہ قِن شی ہوآنگ کے عہدِ حکومت (247 ق م سے 210 ق م تک) میں قائم ہوئی۔ اس نے چھ مختلف ریاستوں پر قبضہ کے بعد متحدہ چین قائم کیا تھا۔ (2)

نو بجکر اٹھاون منٹ: ''تم پاکستان سے مشرق کی طرف جا رہے ہو۔ میرے لیے pacific ocean (بحرالکاہل) کے مغربی ساحل پہ واقع ملک چین کے سارے رنگ جمع کرنا کہ یہ قدامت وجدت کا خوبصورت امتزاج ہے۔ ہاں مگر تاریخ کے معاملے میں یہ ہم سے سبقت نہیں لیجا سکتا کہ مہرگڑھ کی آغوش میں فقط میری اور تمھاری محبت ہی پروان نہیں چڑھی بلکہ 9000 سال قبل اسی کی گود میں انسانی معاشرے نے بھی آنکھ کھولی۔ کوئٹہ سے 140 کلومیٹر جنوب مشرق میں درہ بولان کے دھانے پر کیچی کی پہاڑیوں کے دامن میں واقع محبتوں کی سرزمین مہرگڑھ انسانی تہذیب وتمدن کا اولین گہوارا ہے۔ اب یہ ہماری نااہلی ہے کہ ہم اس انمول تاریخی ورثے کو سیاحت کا مرکز بنانا تو کجا اِسکی مناسب دیکھ بحال کے لیئے اِسے یونسکو کی world heritage sites کی فہرست میں شامل کروانے میں بھی ناکام رہے ہیں۔ آج ساری دنیا فردِ واحد کی محبت کو تو تاج محل کے نام سے جانتی ہے لیکن محبت کو اپنی کوکھ سے جنم دینے والی دھرتی ہماری غفلت کا شکار ہے اور اگر ہماری بے نیازی کا یہی

عالم رہا تو ایک روز دریائے نغاری کی طغیانی ہم سے ہماری تاریخ کے سب آثار چھین لے گی۔لیکن میرے ہمدم! میرے اور تمھارے لیئے تو مہر گڑھ دوسروں سے کہیں زیادہ بڑھ کے اہم ہے کہ اس سرزمین نے جب ابن آدم کو خانہ بدوشی کی زندگی ترک کر کے مستقل سکونت اختیار کرنے کی ترغیب دلائی ،اپنے باسیوں کو کھانا پکانے کے لئے آگ کا استعمال سمجھا کر قدرت کی اس طاقت کو انسان کے تابع کیا، درندوں کے گوشت سے شکم سیری کرنے والے آدم زاد کو گندم کی کاشت سکھائی، جانوروں کو سدھانے کا گُر بتلا کر انسان کی حیوانات پر ابدی برتری منوائی، کپاس اور اون کا تانا بانا بُننے کا فن سکھا کر بنی نوع انسان کو پوشاک کی زینت بخشی، برہنہ سر پہ پگڑی سجائی، پیتل تانبے کے برتن، زیورات، بال سنوارنے کی پنیں اور اوزار ڈھالنے کے ہنر سے اشکار کروایا، جنگلوں اور غاروں میں الگ تھلگ رہنے کے بجائے بستی بسانے کی ابتدا کر دی، موتیوں، سیپوں، چونے کے پتھر اور فروزے وغیرہ کے ذریعے حسن کو احساسِ خوشنمائی سے روشناس کروایا، تب ہی اس نے میرے اور تمھارے دل کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیئے ایک دوسرے میں پیوست کر دیا۔ آج بھی جب فرانسیسی ماہرین گلے میں موتیوں کا گلوبند، کندہ کیے کوئی مورتی یا زمین کی تہوں میں مدفن سچے موتیوں کا کوئی ہار برآمد کرتے ہیں تو میں سوچتی ہوں شاید یہ وہی مالا ہو جو چھ جنموں پہلے تم نے میرے لیئے اپنے ہاتھوں سے پروئی تھی!!!۔ارے ہاں موتیوں سے یاد آیا چین سچے موتیوں کے لیے بہت مشہور ہے، میرے لیئے وہاں سے سفید موتیوں کی ایک لڑی ضرور لانا۔اور......اور میرے محبوب کا خیال رکھنا۔ وہ میری ملکیت ہے۔ وہ برسات کی سرد رات میں دوستی کی گرمائش ہے، گھپ اندھیرے میں امید کی کرن ہے، مکمل خامشی میں یقین دھانی کی سرگوشی ہے، بے سمت بے سرحد سیاہ آسمان میں قطب کا جھلملاتا ستارہ ہے، کوئٹہ کے بے گیاہ چٹانی پہاڑوں پہ لہلہاتی سرسبز جھاڑی ہے، گم شدہ قافلے کے لئے میر کارواں ہے، میرے لیے آبِ حیات کی بوند ہے ،کوڑھی کے لئے مسیحا کا لمس ہے، جسم کی روح ہے، میری انگوٹھی کا ہیرا ہے، پنچھی کا پنکھ ہے،

آسمانوں کی طرف سفر کا لیڈر رہے۔“

”تم وہاں بلوچستان کے ادب کے سفیر کی حیثیت سے جا رہے ہو لیکن پیشے کے لحاظ سے تم ڈاکٹر ہو۔ چین میں شاید طب کے حوالے سے تمھیں کچھ جاننے کا موقع ملے۔ وہاں ہزاروں برس سے رائج اکوپنکچر جیسی تکانیک آج دنیا بھر میں متبادل طب کے نام سے شہرت پا رہی ہیں، لیکن اس معاملے میں تم اپنے آپ کو قطعاً پسماندہ تصور مت کرنا کیونکہ ہمارے مہر گڑھ کے باسی دنیا کے قدیم ترین dentist تھے جو علاج کی غرض سے داڑھوں میں سوراخ کر کے جڑی بوٹیوں سے اُن کی بھرائی کیا کرتے تھے۔امریکی سائنسدان داڑھوں میں کیے جانے والے ان سوراخوں کی صفائی کا الیکٹران مائیکروسکوپ سے مشاہدہ کر کے ششدر ہیں کہ آج سے ہزاروں برس قبل یہ لوگ فنِ طب میں کس قدر مہارت حاصل کر چکے تھے ۔برٹش ڈینٹل ایسوسی ایشن بھی اس امر کی تصدیق کرتی ہے کہ ڈرلنگ اور فلنگ کے ذریعے دانتوں کی تکلیف دور کرنے کا طریقہ مہر گڑھ میں ہی ایجاد ہوا تھا۔ چین میں تو اس کے بہت بعد یعنی آج سے تقریباً چھ ہزار قبل مصنوعی دانت لگائے جانے کا کام شروع ہوا۔ لیکن مہر گڑھ والوں جیسا طریقہ علاج تو وہ بھی نہ جانتے تھے۔ مہر گڑھ اور چین کا کیا مقابلہ۔ مگر پھر بھی چین تہذیبی و ریاستی طور پر ہزاروں برس کی تاریخ رکھتا ہے۔ یہ وطن سماجی آزادی کے علمبرداروں سے ہی مزین نہیں بلکہ اس نے تو بے شمار سائنس دان، موجد، انجینئر، فلاسفر، شاعر اور ادیب پیدا کیے۔ ان کی ماہرانہ کھیتی باڑی نے کثیر آبادی کے لئے اساس فراہم کی۔ کاغذ، ریشم، بارود، بحری قطب نما، طباعت اور پورسلین کا شمار چینیوں کی معروف صنعتی اور سائنسی ایجادات میں ہوتا ہے۔ انہوں نے ایندھن کے لئے کوئلہ استعمال کیا۔ نمک اور قدرتی گیس کے لئے گہرے کنویں کھودے، دھاتیں پگھلانے کے لئے پانی کے پہیے والی دھونکنی مروج کی، نہروں پہ بند باندھنے انہوں نے شروع کیے۔ چھتری بھی چینیوں کی ایجاد ہے۔ زلزلوں کا سراغ لگانے کے لئے زلزلہ پیما (Seismograph) انہوں نے ایجاد کیا۔ ریاضی میں ایکس

(Abacus)، پائی کی انتہائی درست قدر، اور دو عددی کلیہ ادھر ہی سے آیا۔۔۔۔ارے یہ میں کیا باتیں لے بیٹھی؟ بس ایک کام کرنا: جس دن دیوارِ چین دیکھنے جاؤ اپنے سوٹ کیس کا چھوٹا تالا نکال کر جیب میں ساتھ لیکر ضرور جانا۔ وہاں بہت ضروری کام آئے گا۔''

6۔ سمو نے میرے لیے موٹے موٹے آنسو بہائے

''مجھے کون صبح سویرے جگا دیا کریگا۔ کون مجھے شب بخیر کہا کریگا۔ میں کس کے ساتھ جھگڑ لیا کرونگی۔ ہر روز میری نگاہیں کسے تلاش کرینگی۔۔۔میرے کان تمہاری سرگوشی کے عادی ہو چکے ہیں۔ اور میرا ذہن تمہارے تصور کا۔۔۔سنگت' تمہارا کوئی متبادل نہیں ۔۔۔۔۔میں تمہیں مس کرونگی جان، میں نے تو ابھی سے تمہیں مس کرنا شروع کر دیا ہے۔ یہ بہت بہت بہت تکلیف دہ ہے۔ ناقابلِ تشریح حد تک تکلیف دہ۔ لگتا ہے ایک ہفتہ ہزار برسوں کا ہوگا۔ میرے اندر تو ابھی سے ٹوٹ پھوٹ ہونے لگی ہے۔''

''خدا حافظ، اللہ کی امان میں۔ وہ ہر قدم پہ تمہاری مدد کریگا۔ اپنی عمر بڑھانے کی ترکیب ضرور پوچھنا وہاں سے۔ میں نے آج ہی پڑھا ہے کہ انقلاب سے قبل وہاں اوسط عمر 35 برس ہوا کرتی تھی، جو کہ اب بڑھ کر 80 سال ہوگئی ہے۔ میں تم کو 100 سال کا بوڑھا دیکھنا چاہتی ہوں''

''تم روح ساتھ لیے جا رہے ہو۔ یہاں تو صرف جسم ہے۔۔۔تمہیں مس کرنے کیلئے۔ تم نے اپنے ڈالر احتیاط سے خرچ کرنے ہیں۔ ایک ڈالر ان کے آٹھ یوآن کے برابر ہے۔ ان کا سکہ رین منی (RMP) ہے جس کا مطلب ہے ''عوامی کرنسی''۔ ان کے نوٹ بڑی رقم سے لے کر چونی اٹھنی تک کے ہوتے ہیں۔ میرے لئے ان کے نمونے ضرور لانا۔ مجھے سکے اور نوٹ جمع کرنے بہت پسند ہیں۔''

''یہ ہفتہ میری ساری قوتِ برداشت کو امتحان میں ڈال دیگا، جو کہ میں پہلے ہی کھوتی جا رہی ہوں۔۔۔۔خدایا، میں خود کو رو دینے سے کس طرح بچا پا رہی ہوں۔۔۔ میرے دوست کو تندرست، مسرور، خوش مزاج ہی واپس لانا، 29 نومبر کو۔''

افتخار عارف الوداع کہنے کی آخری گھڑی تک ہمارے ساتھ ہوتے ہیں۔ لطیفے، حکایتیں، عبرتیں سنا سنا کر سفری رہنمائی یا خبرداری کا کردار ادا کرتے رہتے ہیں۔ عوامی جمہوریہ چین کے سفارتخانے کے کلچرل ونگ کے عہدہ دار ساتھ ہوتے ہیں۔ اور ہمارے ہم سفر ایکس گریڈ والے اظہار صاحب کے دفتر والے لوگ بھی اپنے صاحب کی بیگ برداری وغیرہ کے لئے موجود۔ بلوچ ماما اپنا کیمرہ ساتھ نہ لائے۔ مگر افتخار عارف نے اپنے دفتری کام دیکھ کر سرِ شام ہی اپنا چھوٹا Olympus والا کیمرہ بمعہ پانچ ریلوں کے میرے ہاتھ تھما دیا کہ ''ہیرو (مجھے پتلون و ٹائی میں دیکھ کر)! یہ اب تمہاری ذمہ داری ہے۔ سرکاری ملاقاتوں کے لئے میرے دفتر کو درکار تصاویر ضرور اتارنا'' میں انکار نہ کرسکا۔ مگر یہ ایک اور ذمہ داری والی بات تھی۔ اور بکواس اس میں ہے کہ جب آپ ہی کیمرہ مین ہوں تو اپنی تصویر تو کھچنے سے ہر جگہ رہ جاتی ہے۔

ائیر پورٹ پر جو بھی تصویر کشی ہوسکتی تھی' کی۔ اور بغیر کسی بڑی تلاشی کے ہم بخیر و عافیت پی آئی اے کے جہاز میں بیٹھ گئے۔ (اتنے بڑے افسروں کے ساتھ سفر کرو گے تو تلاشیوں سے تو بچو گے ہی!)۔ اظہار صاحب نے اپنے سرکاری تگڑم بازی میں اکانومی والی سب سے اگلی سیٹ جو لے رکھی تھی وہ یوسفی صاحب کے لئے خالی کر دی۔ ہمیں ان کا یہ جذبہ اچھا لگا۔ یہیں سے ہم اپنے ہم سفروں سے آشنا ہونے لگے۔ اور باہمی احترام و اعتبار فروغ پاتا رہا۔ دوستوں نے سفر میں غیر سرکاری امیر مجھے ہی بنا ڈالا۔ مگر یوسفی صاحب کی بزرگی اور میری برخورداری اس پورے عرصے کے دوران برقرار رہی۔ اول الذکر اپنے مقام پر اور ثانی

الذکر اپنی اوقات میں رہا۔

اسلام آباد بیجنگ کا فاصلہ 2400 میل ہے۔اور یہ پانچ گھنٹے کا سفر ہے۔

دس بج کر پنتالیس منٹ: ''سیڑھیاں ہٹ چکیں، کھڑکیاں دروازے بند ہونے کو ہیں۔اس لئے مجھے خدا حافظ کہو اور حسبِ معمول شب بخیر بھی! میرے چہرے پہ رواں آنسوؤں کی لڑیاں تمہاری خیریت سے واپسی کی دعائیں ہیں۔بس میرے ہمدم! مہرگڑھ کے کھنڈرات کی یہ روح یہیں تک تمہارا ساتھ دے سکتی تھی۔اس سے آگے تمہیں اکیلے ہی جانا ہے۔''

ہم نے حفاظتی بیلٹ باندھے تو آنکھوں کے کناروں پہ شفاف قطرے مچل رہے تھے۔

کتابیات:

1)عارف،سید ارشاد احمد۔دیوار چین کے اس پار۔2000 خزینۂ علم وادب لاہور۔صفحہ 41

2)ژو ققسن۔دی سائنس آف چائنا۔2004۔چائنا ٹریول اینڈ ٹورازم پریس۔بیجنگ۔ صفحہ 35۔

برودیما، برودیما، برودیما، برو۔۔۔۔۔۔

(چین کا قومی ترانہ)

1۔ جانان، جوانی اور جام

غنیؔ خان

ہم نے جہاز میں فطرت کی جو صناعی دیکھی وہ ہم نے آج تک اس طرح یکجا و متوازن وہم آہنگ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس قدر خوبصورت ائیر ہوسٹس کہ الحفیظ والامان۔ آپ نے بڑی بڑی چمکتی شفاف تازہ آنکھیں کبھی دیکھی ہیں جن میں نیند کا ہلکا سا خمار آنے لگا ہو، اور جسکی وجہ سے ان میں تھوڑی سرخ ڈوریاں جھانکنے لگی ہوں؟ نہیں دیکھیں بھئی۔ انار گال، بھرا جسم، کٹے ہوئے سیاہ بال اور گورا چہرہ، اس پر سلائی جیسی سیدھی ستواں ناک، باریک قدرتی طور پر سرخ ہونٹ۔ ایسا کلر کمبی نیشن کبھی دیکھا آپ نے؟ میرے ساتھ بیٹھے میرے ہم سفر کا دل بیورغ بننے کو چاہا۔ مگر نہ تو اکیسویں صدی کا یہ غیر بلوچ اس نیم شب کو اس بھرے جہاز میں فریاد بھرے گیت گا سکتا تھا، نہ اس بلندی پہ دربانوں کو اشرفیاں دے کر محل کی سیڑھیاں اتری جا سکتی تھیں اور نہ ہی آواز دینے پر ملک نامی اس کی گھوڑی عین اُترنے والی جگہ پہ پوزیشن لئے کھڑی ہو سکتی تھی تا کہ وہ بولان کے دھانے پر دوست دشمن کی تمیز کرنے کے لئے اپنے ہوش میں آ جاتا۔ میں نے ٹوکا تو غنی خان کے شعر میں جواب دے بیٹھے: اے دوست دنیا نور سے بھری پڑی ہے۔ اپنی چادر خوب خوب بھرلو‘۔

نوجوان سٹیورٹ نے داور صاحب کی چترالی ٹوپی دیکھی، ان کی وسیع وعریض داڑھی جانچی اور پشاوری واسکٹ بھانپی تو انکی طرف ایسا بھاگا آیا جیسے پردیس میں ایک پٹھان دوسرے کو دیکھ کر کھچا چلا آتا ہے۔ اُس نے داور صاحب سے، اور میں نے اُس سے خوُب باتیں کیں۔ وہ یوسف زئی قبیلے کا تھا۔ (بلوچ اور پٹھان عرش پہ بھی جائیں تو بھی ایک دوسرے کے قبیلے کا پوچھتے ہیں۔)

کھانے کا وقت ہو جاتا ہے۔ میرا دوست اپنا دل، اپنی آنکھیں نثار کئے ملائم و شیرین وعاجز ترین آواز میں اس کی زبان میں اس سے بات کرتا ہے۔۔۔ ان پہ، اور ان کے صدقے مجھ پہ من وسلویٰ کی بارش ہو جاتی ہے۔ قیامت کھڑی کرنے والی ساقی بن مانگے اورنج جوس کے کوثر کا حوض سامنے رکھ دیتی ہے۔ اسکے چھوٹے چھوٹے خوبصورت شفاف ہاتھ خوراک کی میز پہ ایسے حرکت کرتے ہیں جیسے فلسفی غنی کی محبوبہ پیانو بجا رہی ہو۔ میرا دوست تو نگاہِ کرم کے ہاتھوں اسی جوس کے نشہ سے سرور میں آ جاتا ہے۔ اوجھل ہوتی ہے تو آنکھ لگ جاتی ہے، جلوہ افروز ہوتی ہے تو دیدے پھٹ پھٹ جاتے ہیں۔ چولستان کے سے بادلوں کی بس ایک بجلی چمکی اور پھر پانچ سال تک ایک جھلک بھی نہیں۔ خشک آبہ والوں کی نا دیدگی کی دید نہ حسن کو ٹکنے دیتی ہے، نہ بادلوں کو آنے دیتی ہے اور نہ رحمتوں کو برسنے دیتی ہے۔ ہر نعمت کا حمل ضائع ہوتا ہے ہمارے وطن میں۔ کاش بلوچ پٹھان کی آنکھوں میں جمنوں

پرانی پیاس اور بھوک نظر آنا چھوڑ دیں۔البتہ آج دس ہزار میٹر کی بلندی پہ جاکے یہ عقدہ ضرور کھلا کہ عام سے کسی پٹھان کو خوشحال کون بناتا ہے، جیبی، ترکئی، ناشناس، غنی خان کون بناتا ہے۔رحمٰن بابا کس پراسیس میں ڈھلتے ہیں۔ارے حُسن ہی تو ہے اُس قوت کا نام۔غنی خان حسن کو یوں بیان کرتا ہے:

یہ سببِ مرگ	یہ ضرورتِ حیات
یہ تعریفِ گناہ	یہ معنیٔ نور
یہ وجودِ عشق	یہ رازِ محبت
یہ لذتِ سوز	یہ سازِ مستی

کبھی وہ، کبھی جہاز اور کبھی وہ دونوں فضاء میں انگڑائیاں لیتے رہے اور انہی دو کی مناسبت سے ہمارے دوست کے خیالات بھی۔"آہ، یہ انگڑائی دنیا کی سب سے ہنرمند رقاصہ کی زندگی بھر کے مجموعہ ہائے رقص کے ہزار گنا سے بھی زیادہ اوریجنل، آرٹسٹک اور جاذب ہے"۔اس نے مجھ سے کہا: "میں آگے نہیں جاتا، مجھے، وقت کو'اور، اُسے' یہیں ساکت کردو۔"

2۔لغت کے دو بدبخت الفاظ۔۔۔"میرا، تیرا"

بارہ بجے اعلان ہوا کہ ہمارا جہاز گلگت کی طرف سے پاکستان عبور کر کے چینی ایئر سپیس میں داخل ہونے لگا ہے۔پتہ نہیں تکنیکی طور پر لوگ ہوا میں لکیر کیسے کھینچ پاتے ہیں؟ زمین پر تو ہم بڑا، یا ممتاز رنگ والا پتھر نصب کرتے ہیں اور اُسے "دَنگ" یا "سیم ءَ سنگ" کا نام دیتے ہیں اور اس حتمی سیم کو پار کرنے والا بلوچ کا سب سے خونی دشمن ٹھہرتا ہے۔سمندر میں لکیر کشی ذرا مشکل ہے۔اسی لیے ہم ہر روز سنتے ہیں کہ بھارت نے اتنے سو پاکستانی ماہی گیر پکڑے اور پاکستان نے اتنے ہندوستانی ماہی گیر اپنے جیلوں سے رہا کردیے جو لاعلمی میں دوسرے ملک کے سمندری حدود میں داخل ہوگئے تھے۔ہوا کا بٹوارہ کس طرح ہوگا؟ البتہ وہاں چونکہ مچھلی ملتی نہیں، گندم اُگتی نہیں، لہٰذا محنت کش نے تو وہاں جانا نہیں، محنت کش نے تو وہاں راستہ بھٹکنا نہیں۔صرف ہوائی جہاز ہی چلتے ہیں اور ہوائی جہاز چپو سے نہیں نازک اوزار کی مدد سے چلتے ہیں۔۔۔اوزار عالم الغیب ہوتے ہیں۔۔۔اوزار علم کا سرچشمہ ہوتے ہیں۔۔۔

میں دیر تک لفظ پر غور کرتا ہوں۔۔۔"چینی ایئر سپیس"!!، "پاکستانی ایئر سپیس"!!۔انسان کائنات کا سب سے بڑا پٹواری ہے۔آسمان بانٹتا ہے، زمین بانٹتا ہے، زیر زمین بانٹتا ہے، سمندر بانٹتا ہے۔۔۔دل بانٹتا ہے۔پتہ نہیں اسے اجتماعیت سے کیا بیر ہے۔یہ کیوں نہیں کہتا ہماری ایئر سپیس، انسانوں کی زمین!!۔۔۔

لیکن پھر سوچتا ہوں کہ سب انسان تو ایسا نہیں کرتے۔زورآور ہی یہ ذلیل کام کرتے ہیں۔تو پھر کمزور کو تو اپنا گھر بچانا ہی پڑتا ہے۔اگر شہ مرید کی قوم "میرا میرا" کی رٹ نہ لگائے تو پھر دوسرے زبان دراز اس کے سمندر کو بحیرہ عرب کا نام دے ڈالتے ہیں، خلیج فارس کہتے ہیں۔اسے ہتھیانے کیلئے مذہب کا نام استعمال کرتے ہیں، نظریہِ پاکستان کا لفظ ایجاد کرتے ہیں، جغرافیائی کے علاوہ نظریاتی سرحدیں بھی بناڈالتے ہیں۔یہ سب کیا ہے امیرالدین!

3۔کی دَم دا بھروسہ یار دَم آوے نہ آوے

میزبانہ کا سلیقہ دیکھا، اُس کا قرینہ دیکھا، حزم واحتیاط کا موجزن رویہ دیکھا، اچھا لگا۔اس دوران سب لوگ اپنی گھڑیاں تین گھنٹے آگے کر کے چین کے وقت کے مطابق ڈھال دیتے ہیں۔ہم نے بھی یہی کیا۔انسانی ضروریات نے ہی اُس سے گھڑی بنوائی، ٹائم زون

بنوائے ۔۔۔ مجھے پہلی بار اندازہ ہوا کہ ریڈیو پر انگریزی خبریں پڑھتی اناؤنسر ''پاکستان سٹینڈرڈ ٹائم'' کیوں کہتی ہے۔سٹینڈرڈائزیشن کے بغیر انسان اور نچلے جانداروں میں کوئی امتیاز، کوئی فرق نہیں رہ جاتا۔تصور کیجئے کہ اگر پندرھویں صدی کے ہمّل کی محبوبہ چین میں ہوتی اور وہ اسے رات نو بجے کا ٹائم دیتا تو جب وہ وہاں پہنچتا تو وہاں تو چھ بجے ہونے تھے ۔۔۔اور دن دھاڑے کی اُس کی مستی سیاہ کاری (کاروکاری) پر منتج ہوتی (شکر ہے چین میں یہ ذلیل عمل نہیں ہوتا)۔

انسان کو بہتے وقت کی رفتار سے باخبر رکھنے والے اسکی گھڑی نامی ساتھی کی ایجاد میں چینیوں کا کردار بہت اہم ہے۔مکینکل گھڑی سے قبل دنیا بھر میں وقت کی پیمائش کے لئے ''پانی کے گھڑیال'' استعمال ہوتے چلے آرہے تھے، جن میں کسی نہ کسی طریقے سے پانی کے بہاؤ کے ذریعے وقت ناپا جاتا تھا۔1086 میں سوسنگ نامی ایک افسر نے اپنی ٹیم کے ہمراہ ایک آبی گھڑی بنائی جس کی تکمیل میں آٹھ برس لگے۔یہ گھڑی چالیس فٹ بلند تھی اور بہت حد تک اس مکینکل گھڑی سے مشابہت رکھتی تھی جو دو سو سال بعد یورپ میں ایجاد ہوئی ۔ 1126 میں تاتاریوں کے ہاتھوں سنگ سلطنت کی شکست کے دوران یہ گھڑی بھی چوری ہو گئی ، اور اس کے ساتھ ہی چین میں گھڑی سازی کا فن بھی اختتام پذیر ہوگیا۔(تاتاری اور گھڑی!! گھڑی اور تاتاری!!! چنگیز خان اور گھڑی، گھڑی اور چنگیز خان!!! برسبیل تذکرہ چنگیز خان نے 1214 میں بیجنگ پر قبضہ کر لیا تھا اور اس کے جانشین قبلائی خان نے 1235 سے 1294 تک راج کیا تھا)۔چین میں مکینکل گھڑی ایجاد ہوئی۔اس ضمن میں چینیوں کا سب سے اہم کارنامہ escapement (فاصلہ بند پرزے) نامی ایک پرزے کی ایجاد ہے، جو ایک طرح سے گھڑی کے پہیے کی بریک کا کام کر کے اس کی رفتار کو متوازن رکھتا ہے۔ یہ پرزہ آج بھی ہر گھڑی کا جزوِ لازم ہے اور آپ کی میری گھڑیاں اسی کی وجہ سے ٹِک ٹِک کرتی ہیں۔دل کی دھڑکن کی ٹک ٹک کو کون سا ''فاصلہ بند'' پرزہ متوازن رکھتا ہے۔اور پھر محبوبہ اس پرزے کو اپنے قبضے میں کر کے دھڑکنیں اپنی تابع کیسے کر جاتی ہے۔

1310ء میں یورپ میں بھی مکینکل گھڑیاں بنائی جانے لگیں، جو بہت حد تک ان چینی گھڑیوں سے ماخوذ تھیں جو تاجروں کے ذریعے وہاں پہنچیں۔یہی وہ صدی ہے جب چینی بارود، iron cast اور پرنٹنگ بھی یورپ میں متعارف ہوئی۔چینیوں کو پارے کی سٹاپ واچ کا بھی موجد کہا جاتا ہے۔ایجادات کی بات ہو رہی ہے تو بتاتا چلوں کہ ہمارے روزمرہ استعمال کی بہت سی اشیاء قدیم چینیوں کی مرہونِ منت ہیں۔انہوں نے 105ء میں کاغذ اور ساتویں صدی میں چھپائی کا طریقہ ایجاد کیا۔886ء میں دنیا کی پہلی کتاب چھاپی گئی۔آپ جب بھی دیا سلائی روشن کرتے ہیں تو اسکی چنگاری چین کے بادشاہ کے حرم کی اُن عورتوں کو خراجِ تحسین پیش کرتی ہے جنہوں نے 577ء میں ماچس کی تیلیاں بنائیں جن کے سرے پہ گندھک استعمال کی گئی تھی۔یورپ میں تو اسکے لگ بھگ ایک ہزار سال بعد یعنی 1530ء میں ماچس کا استعمال شروع ہوا۔نویں صدی میں چین میں کاغذ کے نوٹ بنائے گئے۔اول اول انہیں ''اڑنے والے زر'' کا نام دیا گیا کہ یہ اتنے ہلکے تھے کہ ہوا کے دوش پہ ہاتھ سے اڑ جایا کرتے تھے۔(ہاتھوں سے اڑ جانا تو دولت کی سرشت ہے!)۔812ء میں حکومت نے نوٹ بنانے کا کام باقاعدہ اپنی سرپرستی میں لے لیا۔چین میں اپنے سفر کے دوران مارکو پولو کاغذ کے ان نوٹوں سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے ان پر اپنی کتاب کا پورا ایک باب لکھ ڈالا۔سائنس کے میدان میں قدیم چینیوں کی ایک اور اہم ایجاد بارود ہے۔پر حیران کن امر یہ ہے کہ بارود انہوں نے جنگی بالادستی کے حصول کے لیے نہیں بنایا تھا، بلکہ یہ تو دائمی زندگی کا نسخہ پانے کی کوشش کے دوران اتفاقیہ طور پر ایجاد ہو گیا۔اور یوں تیسری صدی ق م کے یہ موجد خود تو حیاتِ جاویدانی نہ پا سکے پر لاکھوں انسانوں کو ابدی نیند سلانے کا سامان کر گئے۔دوسری صدی قبلِ مسیح میں چینیوں نے جسم میں نظامِ دورانِ خون بیان کیا، جو بعد ازاں النفیس (1288ء) کی تحریروں کے ذریعے یورپ پہنچا۔زلزلہ پیمائی کا آلہ ،قطب

نما، ڈھلواں لوہا اور پیراشوٹ چینی اختراع ہیں۔ پتنگ بازی اور تاش کا کھیل چینیوں نے ایجاد کیا۔ اور اے شرابیو! تمہیں پتہ ہے کہ تمہاری وسکی بھی انہوں نے بنانی شروع کی؟ (1)

ابھی گھڑی والی میری بات ختم نہیں ہوئی۔ قدیم چینیوں کو گھڑی کی ایجاد کی ضرورت کیونکر پیش آئی اس کے پیچھے ایک دلچسپ داستان ہے۔ چینی شہنشاہ کو آسمانوں کا بیٹا تصور کیا جاتا تھا (صرف چینیوں کو ہی کیوں!) اور زمین پر اس کی حیثیت قطب کے ستارے کی سی تھی۔ اس کا ہر فعل ستاروں کی گردش سے مطابقت رکھتا تھا۔ وہاں لازمی نہیں تھا کہ بادشاہ کا جانشین اس کا سب سے بڑا بیٹا ہی بنتا بلکہ چینی تاریخ میں ایسی مثالیں ملتی ہیں جہاں چوتھے یا اس سے بھی چھوٹے فرزند کو تخت کا وارث قرار دیا گیا ہو۔ کسی بھی بیٹے کا ولی عہد بننے کا تعین اس امر سے ہوتا تھا کہ اس بچے کا حمل کب ٹھہرا تھا۔ کیونکہ چین میں زائچہ پیدائش نہیں بلکہ استقرارِ حمل کی گھڑی سے بنایا جاتا ہے۔ لہذا ستارہ شناس یہ حساب لگاتے کہ اس پل اجرامِ فلکی کس حال میں تھے، آسمان سے کسی شہابِ ثاقب کا گزر تو نہ تھا وغیرہ۔ اور اس مناسبت سے اندازہ لگاتے کہ یہ لڑکا قائدانہ صلاحیتوں سے بھرپور، پرعزم اور جنگجو بادشاہ ثابت ہوگا یا اس کا وجود اس کی سلطنت میں قحط کا باعث بنے گا۔ اس پیچیدہ اور باریک حساب کتاب اور استقرارِ حمل کے صحیح وقت کا تعین کرنے کے لیے گھڑی کی ایجاد ناگزیر تھی۔ (اندازہ کیجیے کہ کتنے ستارہ شناسوں کو رشوت دے دلا کر سوکنوں نے اپنے بیٹوں کو بادشاہ بنوایا ہوگا۔ اور کتنوں کو بادشاہی نہ ملنے پر سوکن ملکہ نے زہر دیا ہوگا)۔

4۔ طاقتور سردارو! مجھے زبردستی بھنگ نہ پلاؤ

مستؔ توکلی

ٹی وی سکرین پر شہرۂ آفاق صحرائے گوبی کے آس پاس ہمارے جہاز کی نہ ختم ہونے والی پھیریاں دکھائی جارہی تھیں۔ کتنا بڑا صحرا ہے یہ۔ اور کیا دلچسپ قریبی تاریخ ہے اس ملک کی۔ اور سچی بات یہ ہے کہ چینی دوست خواہ کچھ بھی بولیں، ان کی اصل تاریخ شروع ہی ہوتی ہے انیسویں صدی سے۔ اس سے قبل تو چین سیاہ کالی بادشاہی میں نظامِ جاگیرداریت سے گرا پڑا اُسست الوجود، گویا مردہ پڑا تھا۔ نہ تین میں نہ تیرہ میں۔ صحرائے گوبی پہ اس طویل سفر کے دوران دل و دماغ اُفق تا اُفق آوارہ خیالی کی مٹرگشت کرتے رہے۔ دل چاہا کہ اپنے سفر نامے کا عنوان رکھوں ''افیون سے انقلاب تک''۔ اس لئے کہ جب ہم سٹوڈنٹ لائف میں چین کا کمیونسٹ لٹریچر پڑھتے تھے تو Opium War کا تذکرہ ضرور آتا تھا۔ اور آپ دنیا بھر کی تاریخ کنگھال کر دیکھیں آپ کو کہیں اور ''جنگِ افیون'' نظر نہیں آئے گی۔ یہ بالکل چین کی مخصوص خصوصیت ہے۔ بالکل اسی طرح جس طرح چینی دوست اپنے سوشلزم کو ''سوشلزم چینی خصوصیات کے ساتھ'' کہتے رہتے ہیں۔ بالکل اسی طرح چین بحیثیت مجموعی ہر شعبۂ زندگی میں آپ کو اپنی مخصوص خصوصیات کے ساتھ ہی دکھائی دیتا ہے۔

یہ جو ہمارے ہاں ایسٹ انڈیا کمپنی تھی، اسے میں ہمیشہ ولندیزی، پرتگالی اور فرانسیسی سامراجوں کے مقابلے میں مہذب سامراج گردانتا تھا۔ اور اس کا تذکرہ میں نے اپنی کچھ تحریروں میں بھی کر رکھا ہے۔ لیکن اب معلوم ہوا کہ میرا مشاہدہ غلط تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی اصلیت اگر دیکھنی ہو تو چین میں دیکھئے۔ ہمارے ہاں تو گویا یہ شرافت کی دیوی تھی۔ اس نے اصل درندگی اور وحشی پن چین میں دکھائی۔ وہ وہاں شہد، شکر، علم، شرافت یا کچھ اور نہیں بلکہ افیون بیچتی تھی۔ اس ''افیون فروش سامراج'' نے یہ گھناؤنا کام چینیوں کی مرضی اور اجازت کے بغیر شروع کیا۔

اگر آپ بور نہ ہوں قارئین! تو ہم آج کے چین کو اچھی طرح سمجھنے کی خاطر ذرا تفصیل سے اس کی تاریخ دیکھیں۔ ثواب کا ثواب حاصل ہوگا اور خرما کا خرما ملے گا۔

صدیوں جاری خودکفیل قدیم نظام کو برقرار رکھنا چنگ (یا مانچو) سلطنت کے لیے

اس وقت ایک بوجھ ثابت ہوا جب اس ملک کو سمندری تاجر، یعنی یورپ کے بڑھتے ہوئے چیلنجوں کا سامنا ہوا۔ مِنگ دور سے چلتی آئی صدیوں کے امن اور خود کفالت نے حکمران طبقے کے رویوں میں کوئی تبدیلی پیدا نہ ہونے دی ۔ بادشاہت کے فکری باڈی گارڈوں نے کنفیوشس کی تعلیمات کو ڈھال بنا کر چینی تہذیب کی بلندی اور بادشاہ کی حیثیت کو ارفع ثابت کیے رکھا تھا۔ (الف)

مگر اس ساری سُست رفتاری کے باوجود سماج کا اپنا بھیڑ چال والا اِرتقاء تو بہر حال جاری تھا۔ قِنگ عہد میں دس ہزار اجرتی کانکن صوبہ کوانگشی میں اور کوانگ تونگ میں 50ہزار بافندے کام کر رہے تھے۔ بڑے بڑے کارخانوں میں (جن میں بعضوں کے ہاں 5,5ہزار مزدور کام کرتے تھے) چائے کی پراسیسنگ ہوتی تھی ۔ صوبہ چیانگشی میں پورسلین کے مشہور بھٹوں نے تقسیم محنت کا عمدہ عمل تشکیل دیا۔

اس طرح سماج کے جبلی رجحان کے بطور، سماجی مراحل کا تسلسل جاری رہا۔ چین کا مسئلہ البتہ یہ ضرور رہا کہ وہاں سماجی تسلسل میں پیدا شدہ ملکی سرمایہ داری میں اتنی سکت کبھی نہیں آئی کہ وہ جاگیرداری کو تباہ کر سکتی۔ وہاں یہ کام بیرونی سرمایہ داری نے کیا۔ اس بیرونی سرمایہ داری نے ہماری آپ کی جانی پہچانی ایسٹ انڈیا کمپنی کی شکل میں نہ صرف چینی جاگیرداری کو منہدم کیا بلکہ اس نے چین کی اپنی سرمایہ داری کے بھی نشوونما کے سارے ذرائع کاٹ دیے۔ یہ کافر کمپنی کافر پیمانے کی تجارت کرتی تھی۔ وہ یہاں سے چائے، ریشم، سوتی کپڑا، پورسلین وغیرہ خریدتی تھی۔ لیکن اس کے پاس اس تہذیبی طور پر پسماندہ معاشرے پر بیچنے کیلئے کچھ بھی نہ تھا۔ جاگیرداری کی ضروریات کیا خاک ہوتی ہیں۔ ہم بلوچستان والوں کی ضروریات کیا خاک ہیں۔۔۔ ایک اچھی گھوڑی، دوسری یا تیسری شادی، یا پھر اپنے ہی کزن کو قتل کرنے کے لیے ایک بندوق۔ چینی لوگ یہ بندوق والا دھندا بھی نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ کمپنی کو اپنی خریداری کے عوض چینیوں کو ادائیگی چاندی میں کرنی پڑتی تھی۔___ چاندی، ظالم چاندی ـ سونا، ظالم سونا۔ آج تک کاؤبوائے والی جتنی بھی فلمیں "سونے کی تلاش میں" جیسے ناموں سے بن چکی ہیں۔ سونا چاندی اس سے کئی گنا گھناؤنے دھات رہے ہیں۔ خون آشام کہانی ہے ان کی۔ میکسیکو اور پیرو میں امریکی انڈین جولانوں اور کوڑوں کے سائے میں کانوں سے چاندی نکالتے تھے اور لاطینی امریکہ میں ہسپانوی آبادکار اس کا بڑا حصہ افریقہ سے پکڑ کر لائے جانے والے غلام خریدنے کے لئے برطانوی بردہ فروشوں کے حوالے کر دیتے تھے۔ اور پھر برطانیہ اس چاندی سے ہمارے خطے (ہندوستان بلوچستان) کے عمدہ گھوڑے، پارچہ جات اور مصالحے خریدتا تھا۔ اور جب ہم پر برطانیہ نے قبضہ کر لیا تو یہ چاندی ہمارے عوام کا خون نچوڑ کر واپس لے لی گئی۔ اس چاندی کے ڈرامے کی اگلی گھناؤنی قسط چین میں دیکھی جا سکتی ہے:

انیسویں صدی کے آتے آتے چین کو معاشیات کا پیدا کردہ داخلی دباؤ تنگ کرنے لگا۔ بیروزگاری بڑھ رہی تھی اس لیے کہ بادشاہ نے صنعت تو لگانی نہ تھی، اور فرسودہ پیداواری رشتوں کی وجہ سے زراعت میں مزید کوئی ترقی آنی نہ تھی۔ چنانچہ یہ دیہی بے روزگاری بے قراری کو جنم دے رہی تھی اور امن وامان کچھ کچھ بگڑ رہا تھا۔ بیوروکریسی کی کرپشن بھی اس صورت حال کو تقویت دے رہی تھی۔ اور اِدھر اُدھر مقامی بغاوتیں اُبھر رہی تھیں۔

بلوچستان کی طرح چین میں بھی پرتگالی ہی اولین سامراجی تاجر بنے۔ وہاں انہوں نے "مکاؤ" میں اپنے پاؤں جما لیے جہاں سے وہ گوانگ ژو کے چینی بندرگاہ پر بیرونی تجارت کے اجارہ دار بنے۔ پھر جلد ہی اور گدھ آن پہنچے، سپین پھر برطانیہ پھر فرانس۔۔۔

مغرب کے ساتھ صرف تجارت ہی واحد رابطہ نہ تھا۔ رومن کیتھولک پادری لوگ تیرھویں صدی سے اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ چین میں کلیسیا قائم کریں۔ گو کہ 1800ء تک محض چند ہزار چینیوں نے ہی اپنا مذہب بدلا مگر ان مشنری لوگوں نے توپ سازی، کیلنڈر سازی، جغرافیہ، نقشہ نویسی، موسیقی، آرٹ اور آرکی ٹیکچر میں چینیوں کے علم میں

اضافہ کیا۔ وہ چینی فریم ورک کے اندر مسیحیت کو فٹ کرنے کی پالیسی پر چل رہے تھے۔

اٹھارویں صدی میں یورپ اور امریکہ میں چائے کی صورت میں ایک نیا مشروب منڈی میں تیزی سے پھیلنے لگا۔ اس کے علاوہ چینی ریشم اور چینی مٹی کے ظروف کی مانگ بھی بہت بڑھ رہی تھی۔

ہر قدیم معاشرے کی طرح قدیم چین میں بھی بنیادی انقلابی طبقہ کسان تھے، جو زمینداروں، تاجروں اور سودخوروں کے تہرے طوق کے بوجھ تلے مشقت کرتے تھے۔ اس طبقے نے طاقتور جابر قوت کے خلاف صدیوں تک واقعتاً تن تنہا مسلسل اور شجاعانہ جدوجہد کی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ماؤزے تنگ نے 17 بڑی کسان بغاوتوں کا تذکرہ کیا ہے اور بے شمار چھوٹی بڑی بغاوتوں کا حوالہ دیا ہے۔ جو 2000 برس سے زیادہ عرصے میں ہوئیں۔۔۔ اور یہ بغاوتیں ''چین کے جاگیردارانہ معاشرے کی تاریخی پیش رفت میں حقیقی قوت محرکہ تھیں''۔

چین چونکہ ابھی تک غیر صنعتی ملک تھا اس لیے اسے مغرب کی منڈی میں سے کسی خاص چیز کے خریدنے کی ضرورت نہ تھی۔ مگر یورپی تاجروں نے اپنا تجارتی خسارہ پورا کرنے کے لئے کچھ نہ کچھ تو بیچنا تھا۔ اور ''وہ کچھ نہ کچھ چیز'' افیون بنی۔ چنانچہ انہوں نے افیون (اس زمانے کا ہیروئن) چین میں سمگل کرنا شروع کر دیا۔ حالانکہ چین میں اس کی خرید وفروخت پر پابندی عائد تھی۔ یہ ڈرگ ٹریفکنگ دھونس، دھمکی، رشوت، چوری ہر ذریعے سے ہونے لگی۔ سوداگروں نے 1835ء میں ایک سال کے اندر اندر 24 لاکھ پونڈ افیون چینیوں کو پلائی اور کروڑوں پاؤنڈ کمائے۔ یہ افیون زیادہ تر ترکی اور برٹش انڈیا سے آتا تھا۔ (انڈیا میں اسے اگایا جاتا تھا۔ پٹنہ میں اس کی بہت بڑی فیکٹری تھی۔ اور پھر اسے چین لایا جاتا تھا)۔ یہ سارا کام ایسٹ انڈیا کمپنی کرتی تھی۔

جلد ہی چین کی چائے، ریشم اور دیگر اشیائے برآمد، افیون کی قیمت پوری کرنے سے معذور ہو گئیں اور چاندی ملک میں آنے کی بجائے باہر جانے لگی۔ صرف 1832ء سے 1835ء تک کے عرصے میں دو کروڑ اونس چاندی بیرونِ ملک گئی۔

1839ء میں قنگ حکومت نے دس برس تک افیون دشمن مہم چلا چلا کر، اور اس میں اپنی ناکامی کا تماشا دیکھ دیکھ کر اس کی تجارت پر شدید ممانعتی قوانین اپنائے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریز کی فروخت کردہ افیون سے ملک کی آبادی کا ایک بڑا حصہ افیون کا عادی ہو چکا تھا۔ ملک بدترین معاشی اور سماجی مسائل میں گھر چکا تھا۔ اور لگتا تھا کہ اگر افیون کی فروخت پر قدغن نہ لگائی گئی تو پورا ملک نشے کی لت میں پڑ کر مفلوج اور قابل نفرت بن جائیگا۔ بادشاہ نے لین زے شوی (1785......1850) نامی ایک کمشنر کو گوانگ ژو بھیجا تاکہ وہ غیر قانونی افیم کی ٹریفک کو روکے۔

کمشنر لین نے افیم کے غیر قانونی سٹاک پر قبضہ کر لیا اور سارے غیر ملکیوں کو گرفتار کر لیا اور برطانیہ کی افیم کی بیس ہزار پیٹیاں قبضہ کر کے جلا ڈالیں۔ اس پہ ''افیم فروش'' برطانوی سرکار غصے سے بپھر گئی اور اس نے چین پر باقاعدہ حملہ کر دیا۔ اس جنگِ افیون کی باقاعدہ منظوری پارلیمنٹ نے دی۔۔۔ جی ہاں، پارلیمنٹ نے۔ اور ہماری جیسی بریف کیس پارلیمنٹ نے نہیں بلکہ جمہوریت، تہذیب، آزادی اور روشن فکری کی ماں یعنی برطانوی پارلیمنٹ نے۔ حتیٰ کہ جس افسر نے جنگِ افیون میں برطانوی افواج کی قیادت کی تھی، اسے یعنی، سر انتھونی بلاکس لینڈ کو ملکہ وکٹوریہ نے دوبار Knight Hood کا اعزاز بخشا۔ کس بات پر؟ افیون فروشی پر۔ (منافع نظریہ سے زور آور نکلا۔ منافع نظریہ سے زور آور ہی نکلتا رہا ہے)۔

تاریخ میں یہ جنگ Opium War کہلاتی ہے۔ اور یہ 1839ء سے 1842ء تک جاری رہی۔ یہ دنیا کی پہلی ڈرگ وار تھی۔ واہ ڑے برطانیہ واہ، واہ ڑے انگریز واہ۔ واہ ڑے ہیروئن واہ، واہ ڑے ایڈز واہ، واہ ڑے ایف 16 واہ۔ نتیجہ یہ ہی نکلا کہ چین تباہ

ہوا، لٹ گیا، تاراج ہوگیا، زیر زبر نا ہوگیا۔ ہر گھر کو توڑ دیا گیا، ہر الماری اور دراز الٹ دی گئی تھی، فرنیچر، تصاویر، میزوں، کرسیوں، اناج اور توپوں کے زخمیوں اور مُردوں سے گلیاں بھر گئی تھیں۔ لوٹ مار اس وقت رکی جب لٹنے کے لئے اور کچھ بچا ہی نہیں۔ ایک فیوڈل متکبر، ٹیکنالوجی سے بے بہرہ، اکڑی گردن والی بادشاہت افیم فروشوں کے اسلحہ، چاندی اور حرص کے سامنے ڈھیر ہوگئی۔ بھائی صاحب نے نہ صرف ہانگ کانگ کا جزیرہ 99 سال کے لئے برطانیہ کے حوالے کر دیا، بلکہ پانچ دیگر بندرگاہیں گوانگ ژو، ژِن مین، فو ژو، ننگ بو، اور شنگھائی برطانوی تاجروں کے لئے تجارتی اور رہائشی مقاصد کے لئے کھول دیں۔ اور 15 لاکھ ڈالر تاوان جنگ ادا کیا۔ اس قومی بے عزتی کے بعد بہت عرصے تک بہت سے دیگر ذلت آمیز معاہدات اس پہ تھوپے جاتے رہے۔ برطانیہ کی دیکھا دیکھی میں دوسرے مغربی ممالک نے بھی بادشاہ کی افیمچی بنائی گئی رعایا پر مشتمل فیوڈل نظام پہ اس طرح کے کئی معاہدے مسلط کر دیے۔(2)

1856ء میں بھیڑیے نے کسی اور بہانے سے اس فیوڈل بادشاہت پر حملہ کر دیا اور ایک اور معاہدے پر اس سے دستخط کروائے۔ اب کے گیارہ بندرگاہیں گئیں، اور افیون کی ''درآمد'' ''قانونی'' بنا دی گئی۔ اور اب اس معاہدے میں صرف برطانیہ نہ تھا بلکہ اس نشئی قوم کی لاش نوچنے کے معاہدے میں فرانس، روس اور امریکہ نامی گدھ بھی شامل تھے۔

ذرا سوچئے کہ ٹیکنالوجی کی کمتری نے اس قوم کو جتنی بڑی اہانت اور تذلیل سے دوچار کیا تھا، اس کمی کو دور کرنے کے لئے چینی قوم آج کیا کیا تگ و دو کر رہی ہے۔ وہ ڈیڑھ سو برس بعد اپنا ہانگ کانگ واپس لے چکی ہے، اپنے شنگھائی کو دنیا بھر کا ترقی یافتہ شہر بنا چکی ہے اور سائنس و ٹیکنالوجی، دفاع اور معیشت کو اس قدر ترقی دے گئی ہے کہ اب دوبارہ اس طرح کے ذلت آمیز معاہدے اس پہ مسلط نہ کئے جا سکیں گے۔ اور آج کی ساری چینی خارجہ، داخلہ اور معاشی پالیسیاں اسی توہین کی تلخ یاد کا پرتو ہیں۔

چنانچہ ہوا یوں کہ چینی عوام کو برطانوی جنگی جہازوں سے مستقل طور پر زیر نہ کیا جا سکا، نہ ہی انہیں بندوق کے زور پہ مسلط کئے گئے افیون سے مدہوش کیا جا سکا۔ مغربی حملہ آوروں کو اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ اپنے توپوں کی گھن گرج سے مشرقی دیو کو خواب سے بیدار کر دینگے۔ ایک بار جاگے تو پھر چینی عوام بیرونی حملہ آوروں اور اپنے کرپٹ فیوڈل حکمرانوں کے خلاف اپنی قوم کے ترقی یافتہ عناصر کی قیادت میں زندگی اور موت کی جدوجہد شروع کریں گے۔(3)

اس طرح چینی عوام دو دشمنوں میں گھرے ہوئے تھے: غیر ملکی حملہ آوروں میں، اور جاگیردار حکمرانوں میں۔

غیر ملکی استحصال بہت جلد اپنی وحشت کے عروج یعنی انسانوں کی خرید و فروخت تک جا پہنچا۔ 1840ء کے عشرے میں ''قلیوں کی تجارت'' شروع ہوئی اور لاکھوں چینیوں کو غلاموں کی شکل میں برطانوی اور امریکی جہازوں میں لاد کر دنیا کے دور دراز خطوں میں پہنچا دیا گیا۔ سفر کی صعوبتوں سے زندہ بچنے والوں کو منزل پر پہنچنے کے بعد ''400 سے لے کر 1000 ڈالر فی مزدور'' کے حساب سے بیچ دیا جاتا تھا۔ وہ کیوبا، برٹش گی آنا اور ہوائی میں گنے کے کھیتوں میں۔۔۔ ملایا، چلّی اور پیرو میں معدنی کانوں میں،۔۔۔ اور امریکہ کے ساحل پر ہر قسم کے بھاری کام کر کے مغربی سرمایہ داروں کی جیبیں بھرتے تھے۔(4)

ملک کے اندر جاگیرداری اس قدر گھناؤنی شکلیں اختیار کر چکی تھی کہ بادشاہ کی طرف سے ہر وقت بڑھتے رہنے والے ''لگان کی جبری وصولی کے لئے بار بار سپاہی اور سرکاری افسر بھیجے جاتے جو کسانوں کو اس قدر کوڑے لگاتے کہ ہر طرف گوشت کے لوتھڑے اور خون کے چھینٹے پھیل جاتے۔۔۔ (5)

ایک نفرت تھی جو عوام میں شہنشاہی جاگیرداریت اور غیر ملکی جارحین کے خلاف موجزن تھی۔ ایک کہاوت عام تھی: ''عوام حاکموں سے ڈرتے ہیں، حاکم غیر ملکی شیطانوں

سے ڈرتے ہیں اور غیر ملکی شیطان عوام سے ڈرتے ہیں۔"

5۔ میں باغی ہوں، میں باغی ہوں

گل خان نصیر

چین میں "تھائی پھینگ بغاوت" شروع ہوگئی جو بہ یک وقت پرانی طرز کی آخری کسان جنگ اور دورِ جدید میں عوام کی پہلی عظیم جمہوری لڑائی تھی۔ اس تحریک نے تیزی سے زور پکڑا اور دیکھتے ہی دیکھتے ویت نامی سرحد کے قریب واقع صوبہ کوانگشی سے ہوتے ہوئے شمال میں بیجنگ، مشرق میں شنگھائی اور مغرب میں تبت کے پہاڑی علاقوں تک پھیل گئی۔ اس تحریک نے "تھائی پھینگ تھین کو" (عظیم امن کی آسمانی مملکت) قائم کی۔ یہ مملکت پندرہ سال (1850-1865) تک قائم رہی اور نانکنگ کو اپنا دارالحکومت بنایا۔ ان کسانوں کا فوجی نظام بڑا منظم تھا۔ انہوں نے زمین کی ملکیت کا قانون نافذ کردیا کیا جس نے جاگیرداری کی جڑوں پر کاری ضرب لگائی۔ انہوں نے جاگیردارانہ کنفیوشسی ثقافت کے بنیادی تصورات کو چیلنج کیا اور غیر ملکی جارحیت کے خلاف حقیقی معنوں میں قومی خارجہ پالیسی اپنائی۔

اس بغاوت کا راہنما ایک سکول ماسٹر تھا۔ وہ مسیحیت کے زیرِ اثر تھا اور اپنے آپ کو "حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا چھوٹا بھائی" قرار دیا اور یسوع کی روایت کے مطابق، جنہوں نے "نبیوں کو عبادت گاہ سے نکال باہر کیا" مذہبی سماجی نظریے کے ساتھ کنفیوشن ازم کی مخالف کی۔ (6)

تھائی پھینگ فوجیں جہاں کہیں بھی پہنچیں، قابلِ نفرت چھینگ حکومت کی حاکمیت کا خاتمہ کیا، حکام کو برطرف کیا اور ان کی املاک غریبوں میں بانٹ دیں۔

جاگیرداروں کے ہاتھوں میں ارتکازِ زمین کی جگہ انہوں نے مساوات پسندانہ "آسمانی مملکت کا نظامِ اراضی" نافذ کیا۔ اس زرعی قانون میں کہا گیا کہ "آسمانوں تلے ساری زمین، آسمانوں تلے آباد تمام لوگوں کو کاشت کرنی چاہیے۔۔۔" (7)

بھوک اور ننگ کے مارے لوگوں کے لئے انہوں نے ایسی حکومت قائم کی جس نے عزم کررکھا تھا کہ "کوئی ایسا فرد نہ رہے جسے پیٹ بھر کھانا اور تن ڈھانپنے کو کپڑا نصیب نہ ہو"۔ شاہی چور اور طفیلی فوج کی جگہ انہوں نے عوامی فوج قائم کی جو لڑائی کے ساتھ ساتھ کام بھی کرتی تھی: افیمچیوں، جواریوں اور بدعنوان افراد کو سزا دیتی تھی اور مثالی نظم وضبط کی حامل تھی۔ فیوڈل معاشرے میں جہاں عورت کو کوئی حقوق حاصل نہ تھے، انہوں نے قانون بناڈالا کہ عورتوں کو مردوں کے مساوی زمین ملنی چاہیے، اور انقلابی حکومت نے انہیں مسلح افواج میں شامل کیا۔ (8)۔ (کوئی یہ نہ کہے کہ سوشلزم روس کی پیداوار ہے!!)

یہ عجیب قسم کا سوشل ازم تھا جس کے بارے میں کارل مارکس نے 31 جنوری 1850ء میں نیورائنشے ریویوای میں لکھا: "چین کے سوشلزم کا یورپ کے سوشلزم سے ممکن ہے وہی تعلق ہے۔ جو چینی فلسفے کا ہیگل کے فلسفے سے ہے۔ بہر حال یہ بات باعثِ مسرت ہے کہ دنیا کی قدیم اور مستحکم ترین سلطنت برطانوی بورژوا طبقے کے سوتی کپڑے کی بنا پر، ایک ایسے سماجی طوفان کے دوراہے پر کھڑی ہے جو تہذیب کے لئے، انتہائی اہم مضمرات کا حامل ہوگا۔ جب ہمارے یورپی رجعت پسند ایشیا کی طرف دوڑ میں، جو مستقبل قریب میں ان کی منتظر ہوگی، عظیم دیوارِ چین تک پہنچیں گے، ان دروازوں تک پہنچیں گے جو بدترین قسم کی قدامت پسندی کے قلعے کی جانب لے جاتے ہیں، تو بعید نہیں کہ وہ ان دروازوں پر یہ تحریر پائیں:

"آزادی، مساوات، بھائی چارے کی علمبردار چینی ری پبلک۔"

(اور بڑے انسانوں کی تمنائیں یا دُعائیں جلد یا بدیر قبول ضرور ہوتی ہیں!)

6۔ تم گردنیں کاٹنے سے افکارِ حیات مار سکتے ہو؟

عطا شاد

ادھر برطانیہ مزید لوٹ مار چاہتا تھا۔ وہ 43-1842ء کی جنگِ افیون کے بعد کے معاہدوں کے حاصل شدہ مراعات میں اضافہ چاہتا تھا۔ چینی حکام نے افیون کی تجارت میں ملوث ایک چینی جہاز پر جس پر برطانوی پرچم لہرا دیا تھا، پکڑ لیا تو برطانیہ نے اس بہانے چین کے خلاف اعلانِ جنگ کر دیا۔ جس میں بعد ازاں فرانس بھی شریک ہو گیا۔ یہ دوسری جنگِ افیون تھی۔ مگر انہی دنوں یعنی 1857ء میں ہندوستانی فوج نے اسی سامراجی آقا کے خلاف ہندوستان میں بغاوت کر دی۔ اس لیے چین کے خلاف برطانوی فوجی کاروائی میں تاخیر ہو گئی۔ ایسی ہی حسین ہے انسانی تاریخ۔ افغانستان کی آزادی بلوچوں نے بچائی، چین کے عوام پہ گولیاں ہندوستانی عوام نے اپنے سینوں پر سہیں، کیوبا کی آزادی میں ارجنٹینا والوں کا حصہ ہے، مشرقی یورپ کے سارے ممالک کو سوویت عوام کے کروڑوں بیٹوں کے سروں کی قربانی سے آزادی نصیب ہوئی۔ بڑے آئے جغرافیائی سرحدوں والے، نظریاتی سرحدوں والے! کیا حد کیا سرحد، انسان لولاکی ہے۔

افیون فروش انگریزوں کا پکا منصوبہ تھا کہ دنیا بھر کے انسانوں پہ برطانیہ کی عالمگیر سلطنت قائم کی جائے گی۔ مگر انسانوں کے خدا کو کچھ اور منظور رہے، اس لیے دیکھ لیں کہ آج اس برطانیہ کا ''عالم'' کدھر ہے، ''گیریت'' کدھر ہے۔ وہ امریکہ کا چھوٹو بن کر عراق و افغانستان میں کرایہ پر لڑ رہا ہے، مر رہا ہے۔

58-1857ء میں کینٹن پر بمباری کی گئی۔ اس زبردست حملے میں برطانیہ اور فرانس کی فوجیں بیجنگ سے صرف 80 میل دور پہنچ گئیں۔ مگر بدبخت سلطان نے غیر ملکی جارحیت کے خلاف تو کوئی مزاحمت نہ کی، بس اپنی ساری قوت کسانوں کے انقلاب کو کچلنے میں صرف کر دی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چین کو تباہ کن شکست کا سامنا کرنا پڑا اور بادشاہ سلامت نے پھر ہتھیار ڈال دیے۔ پھر ایک شرمناک معاہدہ ہوا۔ پھر تذلیل بھری شرائط تسلیم کر لیں۔ افیون کی تجارت مزید ''قانونی'' بن گئی۔ اس جنگ میں برطانیہ اور فرانس تو فائدے میں رہے ہی۔ امریکہ، زار بادشاہ والا روس اور فرانس سب نے بہتی گنگا میں اپنے سامراجی منحوس ہاتھ دھوئے۔

اِدھر سے چین جس طرف چل نکلا، اس کے تین نتیجے نکلے۔

1۔ اندرونِ ملک بادشاہ کا کنٹرول وقتی طور پر مستحکم ہوا۔
2۔ غیر ملکی مداخلت چین کو بتدریج شکست و ریخت کے کنارے تک لے جانے لگی۔
3۔ چینی معاشرے میں نئے طبقے یعنی سرمایہ دار اور صنعتی مزدور ابھرنے لگے۔

اگلے کئی عشروں تک کسانوں کی بغاوتیں جگہ جگہ ابھرتی رہیں اور کچلی جاتی رہیں۔ اور لبِ مرگ سماجی و انتظامی ڈھانچے کے خلاف عوام کی صدائے احتجاج کو بزورِ شمشیر کچلنے کی کاروائیاں بے تحاشا خونریزی اور آلام کا باعث بنتی رہیں۔

7۔ مُکّے بازوں کی بغاوت

ایک مُکّہ
دو مُکّے
اور میں جوڑوں ہاتھ

ایک مُکّہ
دو مُکّے
پھر بھی جوڑوں ہاتھ

ایک مُکّہ

دو مکّے

پھر میں چھوڑوں ہاتھ

(عطا شاد)

''باکسر بغاوت'' 1899-1901ء کا آغاز روایتی طرز کی پر اسرار بادشاہ دشمن خفیہ کسان سوسائٹی سے ہوا۔''باکسر'' کا نام اسے غیر ملکیوں نے اس لیے دیا کہ باغیوں کی ایک جنگی مشق مکے بازی سے ملتی جلتی تھی۔ 1898ء میں صوبہ شان تو نگ میں یہ سوسائٹی جرمنوں کے خلاف غم وغصے کے اظہار کا مرکز بن گئی کیونکہ وہ صوبے کو انتہائی وحشیانہ انداز میں نو آبادی کی شکل دے رہے تھے۔ جرمنوں نے نہ صرف اقتصادی لوٹ کھسوٹ مچا رکھی تھی بلکہ گاؤں کے گاؤں جلا کر رکھ دیے تھے۔ مزید برآں، شان تو نگ کے لوگ، پورے شمالی چین کے باسیوں کی طرح مسیحی ملاّؤں (مشنیریوں) سے تنگ آنے لگے، جو اپنی اپنی حکومتوں کے ہاتھوں چین کے مختلف علاقوں پر قبضے میں اعلانیہ ہراول دستوں کا کردار ادا کر رہے تھے۔ یہی سبب تھا کہ عوام ان مبلغوں کو غیر ملکی جارحین کا شریک جرم گردانتے تھے۔''باکسر بغاوت'' دراصل چین کے عام لوگوں کی ایک مجاہدانہ اور خود رو جدوجہد تھی جو انہوں نے چین کے حصے بخرے کرنے کے خواہاں ''مہذب'' راہزنوں کے خلاف اور قومی بقا کے تحفظ کی خاطر شروع کی۔ لینن اس وقت ان کے حق میں سختی سے بول پڑے جب باکسر جانبازوں پر سامراجیوں اور شاؤنسٹوں نے ''غیر ملکی دشمن'' ہونے کا الزام لگایا:

''ہاں! یہ سچ ہے کہ چینی یورپیوں سے نفرت کرتے ہیں، مگر وہ کون سے یورپی ہیں اور اس نفرت کا سبب کیا ہے؟ چینی، یورپی عوام سے نفرت نہیں کرتے، ان کا یورپ کے لوگوں سے کبھی کوئی تنازعہ نہ تھا۔ وہ یورپی سرمایہ داروں سے نفرت کرتے ہیں۔ چینی ان لوگوں سے نفرت کیوں نہ کریں جو محض حصولِ مفادات کی خاطر چین آئے؛ جنہوں نے اپنی بلند بانگ تہذیب کو محض دھوکا دھی، لوٹ کھسوٹ اور تشدد کے لئے استعمال کیا؛ انہوں نے افیون بیچنے اور لوگوں کو اس کی لت ڈالنے کے لئے چین کے خلاف جنگیں چھیڑیں، اور تبلیغِ مسیحیت کے نام پر لوٹ مار مچائی۔(9)

لینن نے، بحیثیت پرولتاری انقلابی انٹرنیشنلسٹ ''خود اپنے'' یعنی زار بادشاہی روس والے سامراج پر اپنی سخت ترین تنقید میں طبقاتی بنیاد پر زور دیا: ''حقیقت پسندی سے کام لیا جائے، تو ہم بہر طور یہ کہیں گے کہ یورپی حکومتیں (جن میں روسی حکومت سر فہرست ہے) پہلے ہی چین کے حصے بخرے کرنے میں مصروف ہیں۔ انہوں نے چین کو یوں بھنبھوڑنا شروع کیا جیسے غولِ بیابانی لاش کو بھنبھوڑتے ہیں۔ اور جب اس بظاہر لاش نے مزاحمت کی کوشش کی تو وہ وحشی درندوں کی طرح اس پر جھپٹ پڑے۔ انہوں نے پورے کے پورے گاؤں نذرِ آتش کر دیے اور نہتے لوگوں کو بیوی بچوں سمیت دریائے آمور میں غرق کر دیا۔۔۔ چین کے بارے میں ہم اپنی حکومت کی احمقانہ پالیسی کی توضیح کس طرح کر سکتے ہیں؟ اس سے کن کو فائدہ پہنچا؟ فائدہ صرف مٹھی بھر بڑے سرمایہ داروں کو پہنچا۔۔۔'' (کتنی اُجلی رہتی ہے کمیونسٹوں کی سوچ!!)۔

''باکسر'' بغاوت کو 1900ء میں سارے یورپ نے مل کر کچل ڈالا۔ جرمنی، جاپان، روس، فرانس، برطانیہ، امریکہ، اٹلی اور آسٹریا پر مشتمل آٹھ طاقتوں کی اتحادی فوجوں نے بیجنگ پر حملہ کر کے اس انقلاب کو تہس نہس کر دیا اور اس کے بعد بھی وہ گاؤں جو کبھی باکسروں کا ہیڈ کوارٹر رہے تھے یا جہاں سے ہتھیار برآمد ہوئے، بھسم کر دیے گئے اور دیہاتیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔

ایک اور شکست، ایک اور رسوائی۔ اور بادشاہ پر ایک اور معاہدہ مسلط کیا گیا۔ یہ معاہدہ 1901ء میں ہوا۔ ''باکسر سمجھوتہ'' یہ کہتا تھا کہ چین کی شاہی حکومت پابند ہے کہ اپنے ہی متعدد حکام کو جنہوں نے جنگ کو سنجیدگی سے لیا تھا، موت کے گھاٹ اتار دے یا ''خود کشی کی سزا'' دے۔ کٹھ پتلی بادشاہ (اس سے بھی بہت چھوٹا لفظ استعمال ہونا چاہیئے) سے ایک

فرمان جاری کرایا گیا جس کے تحت ''غیر ملکیوں کے خلاف قائم ہونے والی کسی بھی سوسائٹی کی رکنیت پر دائمی پابندی لگا دی گئی اور خلاف ورزی کو قابل گردن زدنی قرار دیا گیا۔'' 50 کروڑ امریکی ڈالر کا تاوان جنگ عائد کیا گیا جو نہ صرف بڑی طاقتوں کو بلکہ اٹلی، ہالینڈ، آسٹریا، بلجیم، سپین، پرتگال اور سکینڈے نیویا کے چھوٹے اور شامل باجے ممالک کو بھی ادا کرنی تھی۔ (لعنت غلامی پہ۔)

8۔ چین کا بزنجو، سن یات سین

ملک کو کیسے بچایا جائے؟ یہ تھا سوال۔ اور اس کا جواب دیا عظیم انقلابی جمہوریت پسند ڈاکٹر سن یت سین اور اس کے جواں سال محبانِ وطن ساتھیوں نے۔ اِن کا جواب تھا: بادشاہت پہ مشتمل فیوڈل ملوکیت کا خاتمہ اور ایک بورژوا ریپبلک کا قیام۔ ڈاکٹر کی تنظیم میں وہ تمام تارکینِ وطن کی ہمدردیاں شامل تھیں جو قلیوں کی صورت میں ملایا، ہوائی، کینیڈا اور ویسٹ انڈیز بک گئے تھے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کاروبار وغیرہ کر کے کچھ پیسہ کے مالک ہو گئے تھے جسے وہ اپنے ملک میں Invest کرنا چاہتے تھے۔ مگر ایسے چین میں جو فیوڈل ملوکیت سے پاک ہو، بورژوا ہو، اور ریپبلک ہو۔ داخلی کمپراڈور طبقہ بھی ساتھ ہو گیا۔ ان بغاوتوں نے چین کے دانشوروں میں قومی آزادی اور جمہوریت کے لئے جدوجہد کرنے کا حوصلہ پیدا کیا۔

چین کے قوم پرست سرمایہ داروں اور انقلابی دانشوروں نے کومن تانگ کے نام سے 1894ء میں ایک سیاسی پارٹی قائم کی۔ اس کے لیڈر گوانگ ژو کے باشندے اور ممتاز انقلابی قوم پرست ڈاکٹر سن یات سین (1866-1925) تھے۔ انہوں نے جاپان اور ہوائی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ اور ہانگ کانگ کے کالج آف میڈیسن میں طِب پڑھا تھا۔ (10)۔ ڈاکٹر صاحب اور ان کی محترمہ بیگم سونگ جینگ چینی انقلاب کے بانیوں میں شمار ہوتے ہیں (11)۔

1901 میں ''باکسر سمجھوتے'' سے لے کر 1911ء کے بورژوا انقلاب میں ملوکیت کا تختہ الٹنے تک کے دس سال میں چین کی صورت حال تیز رفتار تغیرات سے گزری۔ یہ ملک بقول سن یات سین ''ذیلی نوآبادی'' میں بدل چکا تھا۔ ایسی گائے بن چکا تھا جسے بہ یک وقت کئی غیر ملکی طاقتیں دوہ رہی تھیں۔ ان کئی غیر ملکی طاقتوں کے منافعوں کی ریل پیل میں ریل وسعت بھی پا گئی اور ہو بھی انہی کی گئی۔ معدنیات بے تحاشا دریافت ہوئیں مگر انہی کی ہوئیں۔ چین کے سارے اہم شہروں میں امریکہ، برطانیہ، فرانس، زارشاہی روس، جرمنی اور جاپان کے بڑے بڑے اجارہ دار بنکوں کی شاخیں کھل گئیں۔

نتیجتاً چین میں ایک طفیلی بورژوا پیدا ہوا۔ جو تجارت میں انہی سامراجی ممالک کی ایجنسی لے کر ان کا سامان تجارت اندرون ملک پہنچاتا تھا اور وہاں سے ان کو مطلوب چیزیں خریدتا تھا۔ یہ سامراج کے بارسوخ دلالوں (ایجنٹوں) کا طبقہ تھا جسے ''کمپراڈور بورژوازی'' کہا جانے لگا۔ البتہ ہلکی صنعتوں بالخصوص پارچہ بافی اور آٹا پیسنے کی صنعتیں خوب بڑھیں اور یہ چین کی اپنی قومی بورژوازی کے ہاتھ میں تھیں۔

مزدور طبقہ اچھا خاصا فروغ پا گیا۔ ریل ہو یا معدن، بورژوازی کمپراڈور تھی یا قومی، صنعت کی ملکیت سامراجی ممالک کی تھی یا چین کی، مزدور طبقے کی تعداد میں اضافہ ہی ہوتا چلا گیا۔۔۔۔۔

مگر اس سارے ملکی بورژوا طبقے کی وابستگی تو زرعی چین کی جاگیرداریت سے تھی۔ اسی سبب سے تو یہ طبقہ چینی معاشرے کو غلاظتوں سے پاک کرنے میں متذبذب تھا۔ دوسری طرف گو کہ مزدوروں کی اکثریت بھی کسانوں سے بھرتی ہو کر آئی تھی اور وہ دیہی علاقوں سے

اپنے رشتے برقرار بھی رکھے ہوئے تھے۔مگر ظلم و جبر کے وہ سارے آلام دل میں بٹھائے جو جاگیردارانہ استحصال نے ان پر اوران کے آباؤ اجداد پر روا رکھے تھے۔ باغی تھے یہ جاگیرداریت کے، بھرپور تمسخر تھے یہ چین کے پرانے معاشرے پہ۔مگر شومیِ قسمت اب وہ محض جاگیرداروں کے ہاتھ ہی استحصال کا شکار نہ تھے بلکہ اب تو وہ سامراجی استحصال بھی بھگت رہے تھے۔

ایسے میں جبکہ سن یات سین اپنی سرگرمیوں کے فیصلہ کن مرحلے میں داخل ہو رہے تھے، ماوزے تنگ بھی بلوغت کو پہنچ رہے تھے۔ ماؤ کے ذہن پر سامراجیت کی ذلت آمیزی، پے در پے کسان بغاوتوں اور تحریکوں کے نقوش ثبت ہو رہے تھے۔

چینی عوام نے یورپی مزدور طبقے کی اولین مسلح جدوجہد یعنی 07-1905ء کے روسی انقلاب سے اثرات قبول کیے۔ اس انقلاب نے، سامراجی طاقتوں میں سے بظاہر انتہائی خوفناک طاقت یعنی زارشاہی ملوکیت کی داخلی کمزوریاں عیاں کر دیں۔

دس اکتوبر 1911ء کو ایک فیصلہ کن واقعہ رونما ہوا۔ وسطی چین کے اہم صنعتی اور تجارتی شہر ہانکھو سے دریائے یانگسی کے اس پار ''وُوچھانگ کی'' میں شاہی گیریزن نے تھونگ مونگ ہوئی کے خفیہ ارکان کی زیرِقیادت بغاوت کر دی۔اور مطالبہ کیا کہ شاہی خاندان کا تختہ الٹ دیا جائے۔انہوں نے قریبی شہر میں چین کے سب سے بڑے اسلحہ خانے پر قبضہ کر لیا۔حکومت نے بغاوت کچل ڈالنے کے لئے فوج بھیجی مگر اس فوج نے انقلابیوں پر گولی چلانے سے انکار کر دیا۔شیر خوار بچہ پھوای تخت نشین تھا۔

غیر ملکی طاقتوں اور ان کے چینی طفیلی سرمایہ داروں اور چینی جاگیرداروں کو شہنشاہیت کا بچانا ناممکن نظر آیا تو انہوں نے ایک انتہائی جاہ پسند غدار جرنیل یوان شی کھائی کو تلاش کیا۔اسے شاہی افواج کا کمانڈر انچیف اور وزیرِاعظم بنا دیا گیا۔اس نے شمالی چین کا کنٹرول حاصل کیا جہاں انقلابیوں کی کوئی مسلح قوت نہ تھی، پھر کسانوں کی بغاوتوں سے خوفزدہ جنوبی چین کے متذبذب بورژوا عناصر اس کے ہاتھوں میں کھیلنے لگے۔

اسی اثنا میں انقلاب کے علمبردار سن یات سین بیس سالہ جلاوطنی کے بعد فاتحانہ انداز میں چین لوٹے۔ یکم فروری 1912ء کو تھائی پھینگ باغیوں کے دارالحکومت نانکنگ میں انہیں ری پبلک کا صدر بنایا گیا۔انہوں نے اعلان کیا کہ چین میں شہنشاہیت کی کوئی گنجائش نہیں۔۔۔نہ آئینی بادشاہ کی شکل میں اور نہ کسی اور روپ میں۔مگر ڈاکٹر صاحب کی پارٹی کے اعلانات میں زمین کی مساوی ملکیت کا کوئی ذکر موجود نہ تھا۔

اُدھر یوآن شی کھائی اور اس کے جرنیلوں نے فوری کارروائی کر کے فنگ خاندان کو تخت سے دستبردار کر دیا اور بیجنگ میں اقتدار سنبھال لیا۔ تین سالہ شہنشاہ کے ساتھ ایک سمجھوتے کی تصدیق کی گئی کہ معزول شہنشاہ کو ''وہ منزلت حاصل ہوگی جس کا کہ ایک فرمانروا مستحق ہوتا ہے''۔اس کی تنخواہ تقریباً 20 لاکھ امریکی ڈالر سالانہ ہوگی۔محلات سمیت شاہی خاندان کی تمام نجی املاک برقرار رہیں گی اور خدام اور مسلح محافظ دستے کے اخراجات حکومت خود برداشت کرے گی۔اشرافیہ نے بھی اپنی نجی املاک اور اعزازات برقرار رکھے: ''مفلوک الحال شہزادوں اور نوابوں کو ذرائع کفالت مہیا کیے جائینگے''۔(12)

دو دن بعد 14 فروری 1912ء کو سن یات سین یوان شی کھائی کے حق میں مستعفی ہو گئے، جسے شاہی خاندان نے تخت سے دستبرداری کے وقت جانشین مقرر کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب زمینی اصلاحات نہ کر سکے۔ وہ صرف شہنشاہیت کے خاتمے کو کافی سمجھ بیٹھے تھے۔اس لئے خانہ جنگی اور غیر ملکی مداخلت سے دامن بچانے کی خاطر اور ری پبلک کے قیام کے لئے انہوں نے دستبرداری کا اعلان کر دیا۔مگر نہ تو اتحاد حاصل ہوا۔نہ امن آیا، نہ ترقی ہوئی۔ڈاکٹر صاحب اپنی تمام مصالحت بازیوں کے باوجود چین میں قدر و منزلت کا مرکز ہیں۔بادشاہت کے خاتمے کے لئے انہوں نے شاندار کام کیا۔سوشلزم کو ذریعہ نجات جانا اور آگے چل کر جب انقلاب روس ہوا تو اس سے خوب خوب دوستی بنالی۔

9۔وارلارڈز چین میں

چین میں 1912ء سے لیکر 1918ء کا زمانہ ''وارلارڈز'' کا زمانہ کہلاتا ہے۔ ری پبلک کے ختم ہونے کے بعد سن یات سین کے بااثر ساتھیوں نے متعدد نئی سیاسی پارٹیوں کے اشتراک وتعاون سے ''کومنتانگ'' تشکیل دی۔ یہ ایک ڈھیلی ڈھالی تنظیم تھی اور اس میں ابن الوقت اور ہارس ٹریڈنگ کے شکار اور شکاری وافر تعداد میں موجود تھے۔ چین کے ضیاء الحق یعنی جنرل یوان شی تھائی نے اقتدار غصب کرلیا تو کومنتانگ پارلیمنٹ میں نام نہاد حزب اختلاف بن گئی۔ جرنیل ظلم ڈھاتا رہا، اور اپنی من مانیاں چلاتا رہا۔ 1913ء کے الیکشنوں میں سن یات سن کی کومنتانگ پارٹی جیت گئی مگر اس کے جیتے ہوئے امیدوار نے جونہی بیجنگ پہنچ کر ٹرین سے باہر قدم رکھا تو اسے قتل کر دیا گیا۔ سن یات سن نے ''دوسرا انقلاب'' برپا کر دیا۔ چین کے جنوبی صوبوں میں فوجوں نے بغاوت کرلی۔ مگر یاروں نے بلوچ لیڈروں کی طرح ایک بار پھر زرعی اصلاحات کی بات کو زیرِ زبان چھپالیا، اگر مگر، یوں یعنی، چوں، چرا۔۔۔۔۔ یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ لیڈرانِ کرام سماج کی بنیادی تضاد کی بات گول کر کے بھی توقع کرتے ہیں کہ اس تضاد کے شکار عوام کی اکثریت انکا ساتھ دے۔ چنانچہ چین میں دوسری بار بھی جاگیرداری کے خلاف بات نہ کی گئی اور کسان اس بغاوت سے بھی الگ تھلگ رہے۔ انقلاب ناکام ہوگیا۔ جنرل نے کومنتانگ پر پابندی لگادی، پارلیمنٹ توڑ دی۔ سن یات سین پھر جلاوطن ہوگئے۔

1914ء میں جنگ عظیم شروع ہوئی تو امریکہ سمیت ساری بڑی قوتیں یورپ میں حیات وبقاء کی کشمکش میں مصروف ہوگئیں۔ صرف جاپان بچ گیا۔ اور پھر یہی جاپان شیر بن کر غرانے لگا اور پورے چین کو اپنی نوآبادی بنانے کے خواب دیکھنے لگا۔

ٹھیک دوسال بعد 1916ء میں جنرل کو اللہ نے دھرتی سے ہی اُٹھالیا۔ یہ حضرت باقاعدہ خود کو امیرالمومنین والے نام کے متبادل یعنی ''شہنشاہ'' منتخب بھی کرا چکے تھے۔ اپنی تاج پوشی کا دن بھی مقرر کر چکے تھے۔ مگر بلوچ کہتے ہیں: خدا گھڑی میں گھڑیال بجادیتا ہے۔ لہٰذا چین ایک اور تاج پوشی سے محفوظ رہا۔ بادشاہ، سلامت نہ رہا تو سکندر اعظم کی طرح اسکی فوجوں میں بھی پھوٹ پڑ گئی۔ ایک ٹولے کی پشت پر جاپان تھا اور دوسرے کی پشت پر امریکہ و برطانیہ۔ انارکی پھیلی۔ وارلارڈز کا دور شروع ہوا۔

10۔روس کا عظیم سوشلسٹ انقلاب

پہلی سامراجی جنگ عظیم جاری تھی کہ 1917ء میں روسی مزدوروں نے اپنے عظیم لیڈر لینن کی قیادت میں سوشلسٹ انقلاب برپا کر دیا۔ یہ نیا سوشلسٹ ملک کرہِ ارض کے چھٹے حصے پر مشتمل تھا۔ دنیا بھر کی طرح چین کے انقلابی دانشور بھی پہلی بار مارکسزم لینن ازم کے نظریات کے بارے میں واضح انداز میں باخبر ہوئے۔ مگر چین تو عین ساتھ والا پڑوسی تھا اس مارکسسٹ، لیننسٹ ریاست کا۔ چینیوں نے خود دیکھا کہ دوسری تمام فاتح طاقتیں چین کو غلام رکھنے کی سازشوں میں مصروف تھیں مگر سوویت حکومت ان مراعات تک سے بھی بلامشروط دستبردار ہوگئی جو زار بادشاہ کے زمانے میں اسے چینی علاقے میں حاصل تھیں۔ اس عمل سے چینی عوام کی دلچسپی نئے سوشلسٹ روس سے مزید بڑھی۔ انہوں نے دیکھا کہ روس کے محنت کش عوام نے نہ صرف ''خود اپنے'' سامراجیوں سے نجات حاصل کی بلکہ پوری سامراجی دنیا کی مسلح مداخلت کا مقابلہ بھی کیا۔ سارا سامراج روس کے خلاف ہوگیا تھا۔ یہاں تک کہ چین کے جنگی سرداروں والی حکومت بھی سوویت یونین کے خلاف کاروائیوں میں شریک ہوگئی۔ جس کے ردِ

عمل میں بھی ہر ایماندار چینی صدق دل سے سوویت یونین کا ہمدرد بن گیا۔

ڈاکٹر سن یات سن نے چینی انقلاب کی تکمیل کے لیے لینن سے مدد چاہی۔ بقول ماؤ ''چین کے بورژوا ڈیموکریٹک انقلاب میں تبدیلی پیدا ہوگئی اور وہ سوویت سوشلسٹ انقلاب کے بعد نئے زمرے میں داخل ہوگیا ہے''۔(13) لینن نے ڈاکٹر صاحب کو مشورہ دیا کہ انقلاب کی تکمیل کے لیے: (1) جاگیرداری کا خاتمہ ضروری ہے (2)، مزدوروں کے حقوق کی نگہداشت ضروری ہے اور (3) قومی فوج کی تشکیل لازمی ہے۔ اور ان تینوں امور کے لیے (4) چینی کیمونسٹ پارٹی کا تعاون ضروری ہے۔ چنانچہ انقلابی قوتوں کی نئی صف بندی ہوئی اور تحریک درست سمت میں چل پڑی جہاں چینی انقلاب مارکسزم کی طرف جھک گیا اور سوویت یونین اس کا آئیڈیل بنا۔ ماؤ کے خوبصورت الفاظ تھے: ''انقلاب اکتوبر کی توپوں کی گرج نے ہمیں مارکسزم لیننزم سے روشناس کرایا۔ اس نے ساری دنیا کے ترقی پسندوں کی مدد کی کہ وہ قوم کی تقدیر کے مطالعے اور خود اپنے مسائل پر ازسرنو غور کرنے کے لیے بطور ہتھیار پرولتاری عالمی نقطۂ نظر اختیار کریں''۔(14)

ہم اس رات ہوائی سفر کے دوران اس ملک کے عوام کی پرعزم جدوجہد پہ غور کرتے رہے اور ہم نے یہ رات بھی بقول توکلی مست:

ہم نے اکثر سرما کی راتیں جاگ کر تکلیف کے ساتھ
فکر و تفکر کے ساتھ صبح کردیں

11۔ حسن باپ ہے محبت کا، اور ماں ہے عشق کی

بجلی، چاکر کی ماڑی کے دامن پہ سرمائی رات میں بنا ابر کے کتنی بار چمکی (ب)، کتنی بار دل مچلا اور کتنی بار غنی خان کے دیس کی ہوائی میزبان کو ہمارے دوست کی نادیدگی کے ہاتھوں پردے کے پیچھے پناہ لینی پڑی۔ مگر یہ تو ہم سادہ شخص بھی دیکھ چکے تھے کہ اس کی پرنور آنکھیں کسی اور کی آنکھوں کے نور کی متلاشی تھیں۔ گہری، پیاسی، متلاشی، برق وش آنکھیں۔

ہم نے اپنے دوست کی حالت غیر دیکھی تو اسے چینی کلاسیکی شاعری کی کتاب سے چینی کلاسیکل شاعر ''سانگ یو'' کا کلام پڑھ کر سنانے لگے:

فراخ ہے اس کا چہرہ تازہ، پُرسکون، حَسین
جواہر کی طرح کا رنگ و روپ، نورانی، تاباں
آنکھوں کی اسکی پتلیاں جیسے بلور جگمگ جگمگ کرتے ہوں
انکی تجلی جھلملاتی ہے ایک شاندار فریفتگی کے ساتھ
اس کے ابرو نرگسیں انداز میں خمدار ہیں، میٹھے انداز میں لہردار
اس کے گلنار لب، مانند انار دانہ، چمکیں شوخی سے
ملائم، جیسے ایک ہلکورے کھاتا چشمہ سراسر شفاف
اس کی باتیں گلاب جیسی معطر
اس کے متنوع لہجے بچوں جیسے پُر کشش

اس دوائی سے میرے یار کو تو بہت افاقہ ہوا۔ مگر میں اسے حُسن وجاہت کے عجائب گھر میں گم پا کر، جانے کب نیند کا پناہ گزیں بن گیا۔ جانے فطرت مہربانیوں کے کون کون سے رنگوں کا قوس قزح ترتیب دے چکی تھی۔ جانے کس گھڑی مومندوں کے فقیر (ج) سے ملاقات ہوئی۔ اس نے حسن کی جائے رہائش کی اہمیت پوچھی۔ ہم نے تخت سلیمان اور یسوع کے جھونپڑے کا امتیاز پوچھا۔ اس نے حسن اچھا یا وفا اچھی کا معمہ کھڑا کردیا۔ ہم انکی لاٹھی پکڑ کر ہزاروں میل دور اپنے دیس لے گئے۔ انہیں شہد کا پتھر (د) دکھایا۔ اور پوچھا۔ کہاں عرش کہاں بلوچستان۔ کہاں عدن کہاں وطن، کہاں جہاں گشت نازنین کہاں سمو کا خاکِ پا۔ اور پھر میں نے خود کو اسی کا شعر گنگناتے سنا۔

اپنے یار کی محبت میں اس قدر منہمک
کہ بت خانے کی خبر ہے نہ کعبہ کا حال

جانے کب آنکھ کھلی، جانے کیا کیفیت تھی کہ مست کے شعر میں ترمیم کرنے کی گستاخی کی اور سوئے ہوئے مسافروں بھرے جہاز میں یہ ترمیمی شعر گنگنانے لگا:

رحمٰن اپنے چار ساتھیوں سمیت جاتے ہوئے ملا
وہ داھنے پنجے سے میری پیٹھ تھپکا کے چلا گیا

اور ایک بار پھر ایک پُر مست روحانی بوجھ ہمارا حاصل تھا۔ اب خواہ اس کا حسن رہے یا ڈھل جائے ہمارے دوست کے جنون کو ضروری رسد مل چکا تھا۔ حسن جسے دوام نہیں، عشق جسے زوال نہیں۔ میں بقیہ پورے سفر میں ایک مرشد کی طرح اپنے دوست کی عزت کرتا رہا۔

میرا دوست اس کی رت جگی آواز کے زیر و بم میں کھو گیا۔ اور اس کے کہے گئے الفاظ ''اللہ حافظ'' اور خود ساٹھ برس سے عادی جملہ ''خدا حافظ'' کے بیچ فرق نہ سمجھ پاتے ہوئے قندھار کے اسکے محل سے نیچے اترا، بے مراد و بے مرام۔ بن ملّ کے، بن گرانا ز کے۔ (ر)

12۔ سوشلزم کی قدم بوسی

مگر یہیں تو ہماری منزل مراد تھی۔ ہم نے لینن کا سویت دیس دیکھ رکھا تھا مگر ابھی تک اِس سوشلزم کی قدم بوسی نہیں کی تھی۔ یہ بیجنگ انٹرنیشنل ائیر پورٹ تھا۔ یہی تو وہ شہر ہے جس نے تاریخ کے سینکڑوں مد و جذر دیکھے، مطلق العنان بادشاہوں کے کروفر جھیلے اور کئی انقلابات کا خیر مقدم کیا۔ یہی تو وہ شہر ہے، جس پہ قبضہ کے بعد ہی (یعنی یکم اکتوبر 1949) کمیونسٹ پارٹی نے چین کا نام ''ریپلک آف چائنا'' سے بدل کر اسے ''پیپلز ریپلک آف چائنا'' رکھا۔ اور ایسا اس نے 40 لاکھ کی فوج کو شکست دے کر کیا تھا۔

اس وقت وہاں صبح کے سات بجے تھے۔ اس ائیر پورٹ کی عمارت ہی اپنے ماوند (س) سے کئی گنا بڑی تھی (بلا مبالغہ)۔ ہم سامان کی ٹرالیاں دھکیلتے چلتے ہی رہے، چلتے ہی رہے۔ اور پھر بالآخر پچیس کاؤنٹروں کی پوری قطار میں سے ایک کے سامنے لگی قطار میں جا کھڑے ہوئے۔ ان کاؤنٹروں کے سامنے لگی مسافروں کی لائینوں کے گننے کو دل چاہا۔ مگر ہم نے ان 25 میں سے غیر ملکی مسافروں کے لیے مخصوص 7 لائنوں کے سارے افراد کو گن کر وقت گزاری چاہی۔ ہر لائن میں 60 افراد کھڑے تھے۔ یہ لوگ اتنے زیادہ ہیں کہ امیگریشن پہ اگر ایک ایک منٹ فی کس لگتا تو ہمیں مزید پورا گھنٹہ لائن میں کھڑے رہنا تھا۔ ہم کھڑے تو ویسے ہی تھے اور اب جب امیگریشن کی رفتار دیکھ کر دیر تک کھڑے رہنے کا اندازہ ہوا تو ہم نے اس ملک کے لیے، اس ملک کے پرچم کے لیے اور اس ملک کے ترانے کے لئے خاموش اور با ادب کھڑے رہنے کی نیت باندھ لی اور فوجی انداز میں اٹینشن ہو کر کھڑے رہے۔ ہمارے من میں چینی عوام کا ترانہ یوں بج رہا تھا:

اُٹھو، تم جو غلام بننے سے انکار کرتے ہو
آؤ ہم اپنے لہو سے، جسم سے
اپنی نئی گریٹ وال تعمیر کریں!
چینی عوام مشکل ترین وقت سے گزر رہے ہیں

ہر شخص انکار غرّ ائے۔
اُٹھو، اُٹھو، اُٹھو!
لاکھوں دل بہ یک آواز دھڑکیں

دشمن کے توپوں کا بہادری سے مقابلہ کرنے
دشمن کی بندوقوں کو للکارنے
آگے بڑھو، آگے بڑھو، آگے بڑھو، آگے

ہمارا یوں باادب کھڑا رہنا ہمارے وفد کے ایک ساتھی نے نوٹ کیا۔ اور وہ پہلی بار بول پڑے کہ "دل سے میں بھی کمیونسٹ ہوں۔" مجھے وہ لطیفہ یاد آیا کہ لاہور میں آل پاکستان ہجڑہ ایسوسی ایشن کا کنونشن ہو رہا تھا۔ ریلوے سٹیشن پر مہمانوں کا استقبال ہو رہا تھا۔ پشاور سے بھی ایک وفد نے آنا تھا۔ مگر میزبان اسے تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پوری ٹرین خالی ہو گئی مگر ان کے مخصوص لباس والا وفد نظر نہ آیا۔ دور کونے میں بڑی بڑی مونچھوں، بڑی پگڑی اور سائیڈ پر پستول لگائے ہوئے ایک مسافر منتظر کھڑا تھا۔ یہ لوگ اپنے وفد کا پوچھنے اس کے پاس گئے اور ادب سے پوچھا کہ ہماری کانفرنس کا وفد نہیں اترا، آپ کو اس کے بارے میں کچھ معلومات ہیں۔ تو وہ فوراً بولا۔ یارا، وہ تو میں ہوں۔ وہ حیران ہوئے اور اس کی وضع قطع، بڑی مونچھوں، پگڑی اور پستول کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے: آپ وضع قطع سے ہجڑہ تو قطعاً نہیں لگتے۔ ہجڑہ خان صاحب نے مونچھوں کو تاؤ دیتے ہوئے کہا "لباس اور وضع قطع میں کیا رکھا ہے۔ ہیجڑہ بننے کے لئے دل کا ہیجڑہ ہونا ضروری ہے"۔

13۔ اِک سرخ ستارہ مانگیں گے

عوامی جمہوریہ چین کا پرچم سرخ رنگ کا ہے جس پہ پانچ درخشاں ستارے چمکتے ہیں۔ سرخ رنگ سوشلسٹ انقلاب کی عکاس ہے۔ ان پانچ ستاروں میں سے سب سے بڑا ستارہ چینی کمیونسٹ پارٹی کی نمائندگی کرتا ہے۔ اور چار چھوٹے ستارے چینی عوام کو ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی چینی عوام کی عظیم یکتائی چینی کمیونسٹ پارٹی تلے۔

عوامی جمہوریہ چین کا قومی نشان یوں ہے: پانچ چمکتے ستاروں کے نیچے تیاناں من گیٹ ہے، جن کے گرد گندم کے خوشے گھیرا ڈالتے ہیں۔ ان سب کے نیچے ایک پہیے کے دندانے ہیں۔ یہ سب چیزیں سنہرے رنگ کی ہیں۔ بقیہ پورا بیک گراؤنڈ سرخ رنگ کا ہے۔ یہ دونوں رنگ روایتی طور پر خوشحالی اور آسودگی ظاہر کرتے ہیں۔

تیاناں من، سامراج اور فیوڈل ازم کے خلاف چینی عوام کی، ان تھک جدوجہد کی اور حوصلے کی علامت ہے۔ پہیے کے دندانے اور گندم کے خوشے مزدور اور کسان کی علامت ہیں۔

ہمارے پاکستانی سفارتخانے کے بہت ہی ملنسار اور سرگرم تھرڈ سیکرٹری جناب سعید جاوید اپنے جونیئر کے ساتھ موجود تھے اور ہمارے آس پاس کھڑے رہے۔ پل صراط تو بہر حال خود اپنے اعمال کے بل بوتے پر عبور کرنا ہوتا ہے۔ سُچا سوشلزم ہوتا تو ہم خوشی خوشی لائن میں لگتے کہ ہم تو وی آئی پی ہوتے ڈسپلن کے، مثال کے، مثالی بننے کے۔ مگر اس سوشلسٹ مارکیٹ اکانومی والے ملک میں بھی ہمارے اعمال افضل و اعلیٰ ہونے تھے۔ کم از کم دعوے کی حد تک ہی سہی، ہمارا اپنا کمیونسٹ ایمان تو برقرار تھا۔

کاؤنٹروں سے اس پار ہمارے چینی میزبان جنکشی یو اور ترجمان ھُو وائی کھڑے تھے۔ ہمارے یہ میزبان بہت ہی مہربان، ذمے دار اور خندہ پیشانی والے اچھے انسان ہیں۔ یہ بہت ملنساری سے ملے اور ہم سامان سے لدے پھندے پارکنگ پہ کھڑی کوسٹر میں جا بیٹھے۔

☆☆☆☆☆

حوالہ جات

1۔ Le Baron Dean

Mao Marx & the Market.

2000. John Wiley & Sons Inc. New York. p. 155

2 ۔فیضی ڈاکٹر عنایت اللہ۔ چیں بہ جبیں۔ دوست پبلی کیشنز۔ اسلام آباد۔ 1998۔ صفحہ نمبر 46۔

3۔ وانگ شی فِنگ۔ لوہسون۔ 1948ء۔ فارن لینگویج پریس۔ بیجنگ۔ صفحہ 36

4۔ اپسٹین اسرائیل۔ جنگِ افیون سے آزادی تک۔ 1984ء۔ غیر ملکی زبانوں کا اشاعت گھر۔ بیجنگ۔ صفحہ 32

5۔ سو یوی تنگ: New light on the history of the Taiping Rebellion، ہارورڈ یونیوسٹی پریس 1950۔ صفحہ 44

6۔ اپسٹین ۔۔۔۔ صفحہ 35

7۔ اپسٹین ۔۔۔۔ صفحہ 38

8۔ اپسٹین ۔۔۔۔ صفحہ 39

9۔ لینن۔ وی۔ آئی: چینی جنگ۔ اسکرا دسمبر 1900ء (بحوالہ اپسٹین صفحہ 106)

10۔ گامر، ای، رابرٹ Understanding Contemporary China ۔ 1919۔ بولڈر۔ لندن۔ صفحہ 147

11۔ تارڑ۔ م۔ ح: پتلی پیکنگ کی۔ 2003 سنگ میل لاہور۔ صفحہ 287۔

12۔ اپسٹین ۔۔۔ صفحہ 150

13۔ ماؤزے تنگ: منتخبات۔ جلد دوئم۔ 1973ء۔ غیر ملکی زبانوں کا اشاعت گھر۔ بیجنگ۔ صفحہ 586

14۔ ماؤزے تنگ: منتخبات۔ جلد چہارم۔ 1976ء۔ غیر ملکی زبانوں کا اشاعت گھر۔ بیجنگ۔ صفحہ 262

☆☆☆☆☆

توضیحات وتشریحات

الف۔ واضح رہے کہ کنفیوشس 5 صدی ق م کا فلاسفر تھا۔ اس کے ہاں مذہبی تعلیمات کے برعکس اخلاقی تعلیمات کو اولیت حاصل ہے۔ وہ اپنے پیروکاروں میں نرمی، تحمل، صداقت، وقار، شفقت اور عاجزی کے 5 اوصاف پیدا کرتا ہے۔ کنفیوشش کہتا تھا کہ ایک مستحکم حکومت سماجی ذمہ داریوں سے آگاہ ہو کر موزوں کارکردگی دکھاتی ہے۔ سب سے بنیادی ذمہ داری بیٹوں کا باپ کی فرمانبرداری ہے۔ اسی طرح بیوی خاوند کی تابعداری کرے، چھوٹا بھائی بڑے بھائی کی، اور رعیت حکمران کی۔

کنفیوشس جس زمانے پیدا ہوا اور زندگی بسر کی، اس عہد میں جاگیردارانہ نظام جاری تھا۔ ملک میں کئی جاگیردار حکمران تھے، ان کے مفروضوں پہ شک کرنا، کوئی نئے خیالات پیش کرنا یا بیرونی نظریات کی باتیں کرنا دماغی خلل میں شمار ہوتے تھے۔ شاہی ہاتھ ان لوگوں کا گلا دبا دیتے جو آرتھوڈاکسی سے ذرا بھی ادھر ادھر ہوتے۔

ب: بلوچی کلاسیک سے

ج: پشتو کے صوفی شاعر رحمٰن بابا۔

د: بنیغ ءِ سنگ نامی جگہ بلوچستان میں ہے۔

ر: بلوچی کلاسیکی شاعری کے کردار

س: میرا گاؤں۔

کھلا بابِ سحر آہستہ

(آٹھویں صدی کا چینی مصرع)

1. صرف گنجان آباد ہی نہیں، بلکہ گنجان اشجار بھی

بیجنگ ائیر پورٹ کے آس پاس محض شجر کاری نہ تھی بلکہ واقعتاً جنگل اگا ہوا تھا۔ پورا راستہ سبزہ زار تھا اور لاکھوں درخت قطار اندر قطار کھڑے تھے۔ چین کے شہر انسانوں کے شہر ہیں، مگر ساتھ ساتھ اشجار کے شہر بھی ہیں۔

شہر کی طرف جاتے ہوئے ہمیں راستے میں چھوٹے بڑے پارکوں میں چینی مرد اور عورتیں یوگا جیسی ورزش میں مصروف نظر آتے ہیں۔۔۔سلو ردھم میں، صبح آ گیں فطرت کے ساتھ مکمل ہم آہنگی میں، ہموار، منظّم اور ری لیکس ورزش۔ اور روزانہ ورزش۔ لمبی لمبی جھاڑوؤں سے سڑکوں کی صفائی ہو رہی ہے۔ کچھ لوگ اپنے کتوں کے ساتھ صبح کی سیر کر رہے ہیں۔ کہیں کہیں سڑک کے کنارے کھدائی ہو رہی ہے تو نکالی گئی مٹی کے انبار ویسے ہی نہیں پڑے تھے بلکہ ان پر باقاعدہ پلاسٹک کی شیٹ بچھائی گئی تھی جیسے کہ ہم گرم دھوپ میں اپنے کار موٹروں کو ڈھانپ دیتے ہیں۔

ایک ریسٹورنٹ کے سامنے سے گزرے تو شیشے کے پار خوبصورت منظر نظر آیا۔ ایک حسینہ اپنے محبوب کو بہ ہزار ناز و ادا ناشتہ کھلا رہی تھی۔ وہ مرد کو ہاتھ ہلانے بھی نہ دے رہی تھی۔ خود چمچہ بھر کر ایک آفاقی نورانی انداز میں اس کے منہ میں ڈالتی۔ اس کا مقدر کا مالک محبوب صرف منہ کھولتا اور کھاتا جاتا۔ دیکھتے ہی دیکھتے میرے سامنے جیسے اس منظر کے کردار بدل گئے۔ وہ دونوں بلوچ بن گئے۔ لگا چمچہ میرے منہ میں انڈیلا جا رہا ہے اور چمچہ تھامے ہاتھ کی خوشبو سو فیصد بلوچستان کی تھی۔ تصور ہزاروں میل کی مسافت کو لمحوں میں سر کر لیتا ہے۔۔۔ تھیوری آف ریلیٹے ویٹی۔۔۔

مگر فوراً ہی احساس ہوا کہ وہ مہر گڑھ والی پری تو ہم جیسی فانی ہی نکلی۔ اس نے بھی تو انسانی جھوٹی سرحدیں مان لیں۔ گلگت سے آگے نکلنے میں اس کے پروں کو بھی جلنے کا خطرہ لاحق ہوا۔ میں نے ''لو برڈز'' کی جوڑی پہ دوبارہ نظر ڈالی، اب لڑکا اسی چمچے سے لڑکی کو کھلا رہا تھا۔ میں نے دونوں کو،، جی،، کہہ دیا اور اس جی کو ہزار سے ضرب دے کر فضا کے دوش پر بلوچوں کے دیس کی طرف پھونک دیا۔ میرے ایک ہمسفر نے بہت ہی بے موقع سوال پوچھ لیا: ''اگر یہ جوڑی آپ کے بلوچستان میں ایسا کر رہی ہوتی تو ان کے ساتھ کیا سلوک ہو چکا ہوتا؟''۔ میں نے تصور ہی تصور میں جیکب آباد کی کاروکاری کے امکان کو حقارت کے ساتھ جھٹک دیا۔ فیوڈل ازم کی تمام سیاہیاں اور سیاہ کاریاں سوشلزم میں نہیں ہوتیں۔ ہر نظام کا اپنا ویلیو سسٹم ہوتا ہے۔ ہوتا ہے نا!!

2۔ بے جنگ ۔۔۔۔شمالی شہر

یوں گماں ہوتا ہے بازو ہیں مرے ساٹھ کروڑ
اور آفاق کی حد تک مرے تن کی حد ہے
دل مرا کوہ و دمن دشت و چمن کی حد ہے

میرے کیسے میں ہے راتوں کا سیہ فام جلال
میرے ہاتھوں میں ہے صبحوں کی عنانِ گلگوں
میری آغوش میں پلتی ہے خدائی ساری
میرے مقدور میں ہے معجزۂ کن فیکوُن

فیض احمد فیض

بیجنگ (بے جنگ ۔۔۔۔۔شمالی شہر) بیرونی دنیا کے لئے چین کی کھڑکی ہے۔ یہ شہر جدید وقدیم کا امتزاج ہے۔ یہ چار شاہی خاندانوں کی سلطنتوں یعنی جن، یانگ، منگ اور قنگ کا دارالحکومت رہا ہے۔اس کے فن تعمیر کی تاریخ تین ہزار سال سے زیادہ قدیم ہے اور یہ گزشتہ 800 برس سے دارالخلافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ بہت بڑا شہر ہے۔ٹرانسپورٹ دائیں ہاتھ پر چلتی ہے۔یعنی ڈرائیونگ کا سٹیرنگ دائیں نہیں بائیں طرف لگا ہوتا ہے۔اور ڈرائیور دائیں ہاتھ سے گیئر بدلتا ہے۔

سڑک پہ وسیع وعریض فٹ پاتھ بنے ہوئے ہیں جہاں جگہ جگہ ٹیلیفون بوتھ لگے ہوئے ہیں، دو دو کی جوڑی میں ۔ان کے اوپر چبوترہ یا چھت بنا کر دھوپ اور بارش سے بچانے کی ترکیب کی گئی ہے۔

ہم ''نووٹیل پیس، بیجنگ'' نامی ہوٹل پہنچا دیئے گئے ۔یہ ملٹی نیشنل ہوٹلوں کا ایک سلسلہ ہے۔ بیجنگ میں یہ ہوٹل وانگ فوجنگ کے شاپنگ علاقے کے مرکز میں واقع ہے۔ ہمارے اس ہوٹل کے 344 کمرے ہیں۔میرا کمرہ انیسویں منزل پر تھا۔معلوم ہوا کہ چین میں دوسو فائیوسٹار ہوٹل ہیں اور 230 فور سٹار ہوٹل۔۔۔۔۔دراصل یہی ہوٹل ہی تو باہر کی دنیا کی طرف ماڈرن چین کی کھلتی ہوئی کھڑکیاں ہیں۔ بیجنگ شہر جدید ہوٹلوں، قدیم فیوڈل بادشاہی محلات اور انقلابی یادگاروں کا مرکب ہے۔

3- چینی کوئٹہ کے ہزارہ ہیں

اظہار الحق کا تبصرہ سو فیصد درست ہے کہ چین ہمارے کوئٹہ اور افغانستان کی ہزارہ برادری کی بہت ہی وسعت یافتہ آبادی ہے ۔ وہی ناک وہی نقشہ، وہی قد وہی کاٹھ۔فرق البتہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہمارے ہزاروں کی طرح پسماندہ نہیں ہیں، ان پڑھ نہیں ہیں، غریب نہیں ہیں۔ اور یہ آزرگی زبان نہیں بولتے ۔ یہ مری آباد، کوئٹہ میں نہیں رہتے، نہ ہی اس میں سما سکتے ہیں۔ یہ افغانستان سے مائیگریٹ شدہ اور ایران سے متاثر و وابستہ نہیں ہیں۔ان کی معاشی مادی حالت ہمارے ہزاروں سے بہت بلند ہے، اور یہ ذہنی ترقی میں بہت ارفع ہیں۔

یہ لوگ ہماری ہزارہ برادری کی طرح شیعہ بھی نہیں ہیں۔ بلکہ حیران کن بات تو یہ ہے کہ چین میں عوام کی واضح اکثریت کسی مذہب کو سرے سے مانتی ہی نہیں۔حکومت کسی کے مذہب کی حمایت یا مخالفت نہیں کرتی۔ بلکہ علامہ اقبال کے فلسفے کے بالکل الٹ وہاں دین وسیاست پچاس برس سے جدا جدا ہیں۔۔۔مگر اس کے باوجود سارے نظریہ پاکستان والے نوائے وقتیے، اس چنگیزی والے ملک کی تعریفیں کرتے نہیں تھکتے۔۔۔ بر

سبیلِ تذکرہ دنیا کی آج کی ساری ترقی یافتہ حکومتیں عملاً سیکولر حکومتیں ہی ہیں۔۔۔لیکن یہاں چین میں تو ہم ہزاروں سالوں سے ایک بے مذہب عوام کی بات کررہے ہیں۔ چینی آئین کے تحت مذہبی آزادی کی ضمانت ہے۔البتہ یہ پابندی ضرور موجود ہے کہ مذہبی تنظیمیں اور مذہبی امور کسی خارجی بالادستی کے تحت نہ ہوں۔کسی ملک کا بادشاہ خادم المومنین نہ بنے اور کوئی پوپ نما چیز، چینی مذہبی معاملات کا ہیڈ ماسٹر نہ ہو۔۔۔الغرض چین میں کوئی منظّم مذہب منظّم انداز میں موجود نہیں ہے۔گو کہ ضیا دور میں حمید گل والوں نے سنکیانگ میں علامہ مودودی کی کئی ٹن کتابیں سمگل کروائی تھیں۔اسی طرح بی بی سی نے بھی مذہبی آزادیوں کے فقدان کی بہت دھائیاں دیں۔مگر چینی سماج اور کلچر کو کسی بھی مذہب نے زیر نہیں کیا، نہ ہی کسی چرچ نے، نہ کسی پادری نے۔اسی لیے چین میں نسلی رواداری موجود ہے،اور اسی لئے وہاں بہت سے عقائد و مذاہب کیلئے باہمی برداشت واحترام موجود ہے۔یہ لوگ رسومات والی پوجا پاٹ کرتے چلے آئے ہیں جن میں مافوق الفطرت کو ماننا شامل ہے۔یہ اپنے آباواجداد کو مذہبی انداز میں مانتے ہیں۔بتوں کے ساتھ بھی یاری ہے۔قبل از مذہبی، اساطیری مافوق الفطری باتیں ماننے والے۔۔۔کچھ لوگ بدھ مت، تاؤازم، اور کنفیوشس فلسفوں کے ملغوبے پہ یقین رکھتے ہیں۔یہ لوگ بھی مذہب کے بجائے اخلاقیات کی پیروی کرتے ہیں۔یوسفی صاحب نے سوال کیا:''ڈاکٹر صاحب! اگر یہ لوگ خدا کو نہیں مانتے تو انکی تو زندگی اجیرن ہوتی ہوگی۔مثلاً وہ یہ کہنا چاہتے ہوں:''خدا کی مار'' تو وہ کیا بولیں گے؟''۔

4۔جن بھوت کا وجود ہے،نہیں ہے!!

جب بلندیوں پر آسمان کا نام نہیں رکھا گیا تھا
نیچے زمین کو نام لے کر نہیں پکارا گیا تھا۔۔۔
ابھی کوئی چھپر نہیں بنا تھا، کوئی دلدلی زمین ظاہر نہ ہوئی تھی،
ان کے کوئی نام نہیں تھے اور نہ ہی منزلوں کا تعین ہوا تھا۔۔۔
تب دیوتاؤں کو تشکیل دیا گیا

اینوما ایلشن
''بابلی داستان تخلیق''(تیسرا ہزاریہ قبل مسیح کا اواخر)

دنیا کے ہر کلچر میں تو ہم پرستی کا کچھ نہ کچھ عنصر ضرور موجود ہے، اس سلسلے میں مغربی ممالک کے اعوام کی ضعیف الاعتقادی کا یہ عالم ہے کہ وہ سائنسی ترقی کے اس دور میں بھی تیرہ کے ہندسے کو بہت منحوس تصور کرتے ہیں۔چینی کلچر میں بھی بے شمار واہمے موجود ہیں۔اور بے شمار جن اور بھوت موجود ہیں۔چینی لوگ صدیوں سے جنوں پریوں اور بھوتوں کے وجود پہ یقین رکھتے ہیں۔اور ان کی بڑی ہی محتاط عبادت کرتے چلے آرہے ہیں۔یہ لوگ بھوتوں اور دیوتاؤں کو ماننے اور پوجنے کے درمیان درمیان رہتے ہیں۔کنفیوشس نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ: بھوتوں اور دیوتاؤں کی عزت کرو مگر ان سے دور رہو''۔

چنانچہ بہت سارے لوگ انہیں مانتے ہیں، کئی نہیں بھی مانتے۔چینی کہتے ہیں''اگر تم انہیں مانتے ہو تو ان کا وجود ہوگا،لیکن اگر تم نہیں مانو گے تو ان کا وجود نہیں ہے''۔

آیئے اس کہاوت کے پیچھے موجود کہانی سنیئے:

تقریباً ایک ہزار برس قبل سونگ عہدِ سلطنت میں ژوکسی نامی ایک مشہور عالم ہوگزرا۔اس کا عقیدہ تھا کہ جنوں بھوتوں کا وجود نہیں ہے۔چنانچہ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ ایک مضمون لکھے گا جس کا عنوان ہوگا''بھوتوں کا وجود نہیں ہے''۔وہ اتنا بڑا عالم و دانا تھا کہ خود بھوت بھی اس سے ڈرتے تھے۔اگر وہ کہہ دیتا کہ بھوت نہیں ہیں تو بھوتوں کا وجود برقرار نہیں رہ سکتا تھا۔جب بھوتوں کو پتہ چلا کہ وہ ایک ایسا مضمون لکھ رہا ہے تو انہوں نے ایک ہنگامی اجلاس منعقد کیا اور اس مسئلے پر غور کیا۔انہوں نے فیصلہ کیا کہ سب سے چالاک بھوت کو اس کے پاس بھیجا

جائے تا کہ وہ اسے مضمون لکھنے سے باز رکھنے کی التجا کرے۔ چنانچہ ایک رات سمارٹ ترین بھوت ژوکسی کے ڈیسک پر آ گیا اور اس کے پیر پکڑنے لگا۔ ژوکسی حیران ہوا اور پوچھا ''بھوت؟ تمہیں اس وقت مجھے ڈسٹرب کرنے کی جرات کیسے ہوئی۔؟ چلے جاؤ یہاں سے۔ اور تم میرے مطالعے کے کمرے میں آئے کیوں ہو؟''

بھوت نے جواب دیا۔''میں یہاں آپ کے پاس ایک درخواست لے کر آیا ہوں۔۔''

''انسان''یانگ'' کی دنیا میں رہتے ہیں اور بھوت پریت''ین'' کی دنیا میں۔ہم الگ الگ دنیاؤں میں ہیں لہٰذا میں کسی بھی طرح سے تمہاری مدد نہیں کر سکتا''۔

''جناب عالی میں ایک خاص التجا کرنے آیا ہوں!''

''اچھا،کہو''

تب بھوت نے ژوکسی کو اپنے آنے کی وجہ بتائی اور بھوتوں کی نجات کی خاطر اس سے مضمون نہ لکھنے کی درخواست کی۔ژوکسی ہنسا اور کہنے لگا:

''ہم انسان تم بھوتوں کی بڑی مدت سے پوجا کرتے آئے ہیں۔اب وقت آ گیا کہ تم بالکل ہی ختم ہو جاؤ۔''

''ہم بھوتوں میں بھی اچھے اور برے دونوں طرح کے لوگ ہیں۔۔''

''سنا ہے تم ہر کام کر سکتے ہو۔کیا تم مجھے کمرے سے باہر لے جا سکتے ہو؟''

''یقیناً۔جناب عالی''۔

ژوکسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ اگلے ہی لمحے وہ باہر تھا۔وہ بھوت کی قابلیت سے حیران ہو گیا مگر ایسا ماننے پر تیار نہ تھا۔اس نے دوبارہ پوچھا:

''اچھا، تم میرا جسم تو لے جا سکتے ہو۔لیکن کیا تم میرے دل کو حرکت دے سکتے ہو؟''

''یہ ناممکن ہے جناب والا۔ہم صرف چیزوں کو یا کسی شخص کے جسم کو حرکت دے سکتے ہیں۔اور یہ ہمارے موجود ہونے کا ثبوت ہے۔ہم فریبِ نظر میں وجود رکھتے ہیں۔اگر آپ عقیدہ رکھیں، تو ہم وجود رکھیں گے لیکن اگر آپ عقیدہ نہ رکھیں گے تو ہم بھی وجود نہیں رکھیں گے۔آپ براہ کرم اپنے مضمون میں اس طرح کی کوئی بات لکھیں''۔

ژوکسی نے محسوس کیا کہ ان الفاظ میں کوئی ضرر نہیں ہے۔چنانچہ اس نے بھوت سے وعدہ کر لیا کہ وہ ایسا ہی لکھے گا۔بھوت خوشی خوشی چلا گیا۔چنانچہ ژوکسی نے''بھوت پریت وجود نہیں رکھتے'' کے عنوان تلے اپنے مضمون میں لکھا:

''اگر تم عقیدہ رکھو گے تو جنوں بھوتوں کا وجود ہو گا،لیکن اگر تم ان پر عقیدہ نہ رکھو گے تو جنوں بھوتوں کا کوئی وجود نہیں ہے''۔

عقائد سے متعلق ژوکسی کا یہ فقرہ کتنا آفاقی،کتنا ابدی اور کتنا بامعنی ہے!!

5۔پی صاحب کی اژدہوں سے محبت

چینی اور بلوچ دونوں ایک عجیب تصوراتی جانور کا وجود مانتے ہیں: ہم بلوچ اسے ''واسنگ'' کہتے ہیں۔اسی سے ملتی جلتی یا ایک ہی وجود کو ہم''راکس'' بھی کہتے ہیں۔جو کہ ''راکھشس'' سے ملتا جلتا لفظ ہے۔اس مافوق الفطرت وجود میں سانپ کی شکل وشباہت موجود ہوتا ہے مگر سانپ سے دس ہزار گنا بڑا ہوتا ہے۔اور اس سے سینکڑوں معجزے منسوب کیے جاتے ہیں۔آپ اسے خواہ اژدھا،راکھشس کہیں،واسنگ،یا،ڈریگن۔ہماری فوک کہانیوں میں یہ جانور نیکی برائی دونوں کردار ادا کرتا ہے۔یہ مافوق الفطرت قوت اور کرامات رکھتا ہے۔مگر ہمارے ہاں اس کی پوجا وغیرہ نہیں کی جاتی۔البتہ ماضی میں وہ اسے محض فرضی بھی نہیں سمجھتے تھے۔ہمارے فوکلور میں یہ باقائدہ وجود رکھتا تھا۔اس کے توڑ کے لیے جادو ٹوٹکے کیے جاتے یا پھر بھیڑ بکری کی قربانی دے کر اسے رام کیا جاتا تھا۔یہ اژدھا یا ڈریگن

بہت سے جانوروں کا ملغوبہ ہے۔سانپ، گوح، مگرمچھ۔۔۔۔یہ تیز رفتاری سے اڑسکتا ہے ،تیرسکتا ہے اور چل بھی سکتا ہے۔۔۔۔۔مگر چینی تو خود کو اس کی اولاد سمجھتے ہیں۔بالخصوص چینی بادشاہ تو خود کو اس مافوق الفطرت، مہیب طاقتور جانور کا اصل وارث سمجھتے تھے۔چینی بادشاہ ڈریگن کی اولاد ہونے کے ناطے سے گویا آسمان کے بیٹے تھے اسلیئے کہ ''ڈریگن جان'' خدائی مخلوق ہے۔چنانچہ بادشاہ سلامت جس پلنگ پر سوتے وہ اژدہے کا بستر کہلاتا تھا،ان کے تخت کا نام تھا ڈریگن کا تخت، بادشاہ کے شاہی درباری لباس کو اژدہے کی خلعت کہتے تھے۔شاہی محل کی ساری عمارتوں پر اژدہے کے مجسمے ہوتے تھے۔

اژدہے،چینی کلچر میں بارش کے فرشتے بھی تصور کیئے جاتے ہیں۔وہی فیصلہ کرتے ہیں کہ اب کہاں اور کب بارش ہو۔(اوران کا بارش کا فرشتہ ہم بلوچوں والے فرشتے کی طرح سال کے بارہ مہینے سویا نہیں رہتا)۔

پانی کے اژدہوں کا بادشاہ سمندر میں زیرآب محلات کے اندر سکونت پذیر ہے۔

اژدہے چینی جشن اور میلوں میں اہم رول ادا کرتے ہیں۔''ڈریگن کا رقص'' صدیوں کی روایت ہے۔''ڈریگن کشتی میلہ'' سارے کا سارا اژدہوں سے متعلق ہوتا ہے جسے اب بین الاقوامی تہوار کا درجہ حاصل ہے۔

چینی کلاسیکل ادب تقریباً مکمل طور پر اژدہوں کا ادب ہے۔ایک مشہور ضرب المثل جنکشی یونے سنائی:''یار یہ تو یی صاحب کی اژدہے سے محبت والی بات ہوگئی''۔اس کے پیچھے کہانی یہ ہے کہ یی نامی ایک جاگیردار اژدہوں سے بہت محبت کرتا تھا۔اس نے ہر طرف اژدہوں کے مجسمے رکھے تھے۔اور وہ ہمہ وقت اژدہوں کے بارے میں سوچتا تھا۔اژدہوں کے لئے اس کی اس بے پناہ محبت سے ایک اژدہا بہت متاثر ہوا اور ایک روز وہ اسے ملنے آ گیا۔مگر جب یی نے زندہ اژدہے کو دیکھا تو خوف سے اس کا دم نکل گیا۔

6۔چین افغان متحدہ محاذ

چین کا کیلنڈر قمری ہے۔چینیوں کے سال میں بھی بارہ مہینے ہوتے ہیں۔ان مہینوں میں باری باری 30 اور 29 دن ہوتے ہیں۔اس طرح سال میں کل 354 دن بنتے ہیں۔بارہ مکمل قمری چکر۔مہینوں کے نام بارہ جانوروں کے ناموں کے سلسلے پر ہیں۔یہ نام بالترتیب یوں ہیں: چوہا، بیل، شیر، خرگوش، ڈریگن، سانپ، گھوڑی، بھیڑ، بندر، پرندہ، مرغا، کتا اور سور۔یہی حال افغانوں کا ہے۔ان کے ہاں بھی سارے مہینے جانوروں وغیرہ کے نام پر ہیں: ثور، حوت، سنبلی، ترازو، عقرب، قوس، جدی، دلو، حملی، جوازی، سرطانی، اسدی وغیرہ۔۔۔

روایتی چینی رسومات بھی ہر جانور کے ساتھ بہت سی کرامات وابستہ کئے ہوئے ہیں۔مثلاً 2005 کا سال مرغے کا سال ہے۔تو جو مرغے کی صفات ہیں، وہی صفات اس سال پیدا ہونے والوں میں ہونگی۔قدیم زمانوں میں جب گھڑی نہیں تھی تو مرغا ہی انسان کو بتایا کرتا تھا کہ جاگنے اور کام شروع کرنے کا وقت ہوگیا ہے۔اس لئے قدیم محنتی چینی صبح سویرے جگانے والے اس جانور کی بڑی عزت کرتے تھے۔روایتی طور پر مرغے کو متبرک پرندہ سمجھا جاتا ہے جو کہ رات کو شکار کی تلاش میں پھرنے والی انسان دشمن بلاؤں ،جنوں بھوتوں کو بھگا سکتا ہے۔یہ اس لئے کہ فوک لور کے مطابق تمام جن بھوت مرغے کی بانگ کے ساتھ ہی بھاگ جاتے ہیں۔یہی تصور ہمارے ہاں بھی موجود ہے۔لہٰذا ان غیر مذہبی لوگوں میں دیوتاؤں سے حفاظت کے حصول کے عوض مرغے کی خیرات بہت مقبول ہے۔مرغے کے سال والا خوش قسمت شخص نپا تلا اور ڈسپلن والا ہوگا۔اسی طرح مرغے کی زندگی بہت سادہ ہے۔مرغا بہت بہادر تصور ہوتا ہے۔اور مرغوں کی لڑائی کے میلے بہت مقبول ہیں۔

7۔دم لے لے گھڑی بھر، مسافر۔۔۔۔

ہم رات بھر جاگے تھے اور دیئے گئے شیڈول کے مطابق صبح کو آرام کرنے کے حقدار تھے۔مگر اب ہم ایک سوشلسٹ،اور وہ بھی سوشلسٹ مارکیٹ والے، ملک کی پابندیِ وقت کو گلے کا ہار بنا چکے تھے۔مسکراتے اور بلند آواز میں باتیں کرتے جنکشی یو نے مشورے کے انداز میں کہا:''ہمارے پاس اگلے پروگرام سے قبل ڈیڑھ گھنٹہ موجود ہے۔آپ کچھ دیر آرام کریں اور ٹھیک ساڑھے گیارہ بجے ہمیں لاؤنج میں جمع ہو کر روانہ ہونا ہے''۔

ہم سب نے مل کر آرام کو تھری ناٹ تھری کی گولی مار دینے کا فیصلہ کر لیا۔اس لئے کہ ڈیڑھ گھنٹے میں یہ ممکن ہی نہ تھا۔ اس لئے کہ ناشتہ، شیو،غسل اور لباس کی تبدیلی کے بعد وقت بچتا ہی کتنا تھا۔پروفیسر داور اور اظہار الحق نے گو کہ شیو نہیں بنانی تھی مگر اس ذمہ دار چیز کو دھونا، صاف رکھنا بھی تو وقت مانگتا ہے۔اس کا نکھار سنوار تو کوئی ہم بلوچوں سے سیکھے، کہ داڑھی کو چھلہ بنانے میں کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔ویسے مجھے آج تک پتہ نہیں چلا کہ یہ پاپڑ بیلا کس طرح جاتا ہوگا!!۔ بلوچ تو بہ صد تزک و احتشام اپنے ریش مبارک کو چمکاتا سنوارتا ہے۔۔۔اچھا چھوڑیے، اظہار اور داور بلوچ تو ہیں نہیں کہ چھلا بنانے میں چار گھنٹے خرچ کریں۔

سو تیزی تیزی سے ان امور کی انجام دہی کے بعد ٹھیک وقت پر لاؤنج پہنچے۔

ہمارے تحریری پروگرام میں شام سے قبل واپسی نہ تھی اور ہمیں ''شہرِ ممنوعہ'' دیکھنے کے بعد چینی ادیبوں سے راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کرنی تھی۔اس لئے ہم نے بیجنگ کے ادیبوں کے لئے پاکستان اکیڈمی آف لیٹرز کی جانب سے لائے گئے تحائف بھی ساتھ اٹھائے۔واضح رہے کہ یہ کنگ سائز کا سفید ہاتھی یعنی سوٹ کیس افتخار عارف نے ہمیں اسلام آباد میں تھما دیا تھا۔اور تین صوبوں کے ادیبوں کے لئے اس میں موجود چھوٹے قالینوں،لکڑی اور چمڑے کے بنے ہوئے خوبصورت تحائف کی تفصیلات اور طرزِ تقسیم سمجھا دی تھی۔یوسفی صاحب نے بڑی بے بسی میں اس بڑے کیس کا حجم و وزن ملاحظہ کیا تھا اور اس کے اندر موجودات کی ہمہ نوعی اور کثیر نفری دیکھ کر مجھ ''نوجوان'' کی طرف امید بھری نظروں سے دیکھا تھا۔۔۔چاکر نے جنگی مہم پہ جانے کے لئے اپنی کنگھی' بھرے دربار میں اچھالی تھی۔چیلنج کی یہ کنگھی تو بالآخر بہادر بیورغ کو ہی اٹھانی تھی گو کہ اس کی داڑھی اتنی بڑی نہ تھی کہ بھاری کنگھی اس میں اٹک جاتی،اور کنگھی کا داڑھی سے اٹکانا ضروری تھا۔۔اور ضروری ہے۔تو جب کوئی اور سورما سامنے نہ آیا تو تیسرے دن بیورغ نے کنگھی اپنے جبڑے کے گوشت میں پیوست کر کے اٹکا لی تھی۔ سوا کیسویں صدی کے چاکر کے بیورغ نے یاجوج ماجوج بھری اس کنگھی کو اپنے کندھے پر اٹکا یا اور چینن بھر اسے اٹھائے پھرا۔

دوستوں نے اپنی اپنی تصانیف بھی ساتھ لے لیں۔کہ ادیب کا توشہ،قبیلہ، شناخت تو اس کی تصانیف ہوتی ہیں۔ہم نے بھی احباب کی دیکھا دیکھی میں سنگت کے تازہ ترین شمارے کی دو تین کاپیاں، بلوچ سمندر و ساحل پہ لکھی ہوئی اپنی کتاب ''سورج کا شہر'' اور ''بلوچ سماج میں عورت کا مقام'' اپنی خورجین میں ڈالیں۔کوسٹر میں بیٹھے اور چل سو چل۔

8۔دو بھائی تیسرا حساب

(بلوچی ضرب المثل)

ترجمان ھُو وائی کا موبائل فون بجا۔(یہاں ہر مرد و زن کے پاس موبائل فون ہوتا ہے)۔اس نے فون سنا،سن کر جنکشی یو سے چینی زبان میں گفتگو کی اور پھر جنکشی یو کی کھنکتی دوستانہ آواز کا ترجمہ کرنے لگا:''پاکستانی سفیر نے آپ سے ملنے کی خواہش کی ہے۔وہ اگلے

دودن کے لیے یہاں نہ ہونگے، وہ شنگھائی جارہے ہیں۔اس لئے اگر آپ مہمانوں کی رضا ہو تو ہم ان سے مل آئیں!! مگر وقت کی تنگی کے پیش نظر ہم انہیں صرف آدھ گھنٹہ دے سکتے ہیں ‘‘۔

دل میں سوچا دفع کرو، کوئی ملاّ ہوگا یا پھر شیروانی پہنے کوئی سفارش و رشوت کا پالا جاگیرداری کا پلا مسلم لیگی ہوگا۔ ادب آداب سکھائے گا،نظریۂ پاکستان سمجھائے گا، وہی پسماندہ بیوروکریسی والی گلی سڑی باتیں ہونگی۔انہی سفیروں نے تو بیچ کھایا پاکستان کو۔ورنہ ہم عام،غریب پاکستانیوں کو بھلا سیٹو کا کیا پتہ تھا،سنٹو کی کیا خبر تھی۔

مگر اکثریت نے جانے کا کہا اور یوسفی صاحب کی آنکھوں میں بھی اثبات کی خواہش موجود تھی۔لہٰذا ہم خاموش ہی رہے۔نو دنوں کے شکرانے،اور نظر بد کے توڑ کے بطور آدھ گھنٹہ کی قربانی دی جاسکتی تھی۔چنانچہ گاڑی ’’اسی طرف‘‘ مڑی۔یہ میں نے ویسے ہی کہہ دیا ورنہ ہم اجنبیوں کو کیا پتہ کہ کہاں مڑی۔یہ ایک کروڑ آبادی والا شہر ہے۔اس کی سمتوں کے ادراک کے لئے تو ہفتے چاہئیں۔ثقافت،معیشت اور اقتدار کے مرکز بیجنگ میں جہاں تقریباً تقریباً انگریزی نہیں بولی جاتی اور سڑکوں کے نام کے بورڈ چینی زبان میں ہوتے ہیں وہاں ’’واسکوڈے گاما گیری‘‘ بہت دشوار کام ہے۔ بالآخر جب ہم نے چاک چوبند سپاہی دروازوں پر کھڑے دیکھے اور عمارتوں پہ مختلف ممالک کے لہراتے ہوئے جھنڈے نظر آنے لگے تو اندازہ ہوا کہ ہم سفارتی ’’نوگوایریا‘‘ میں آچکے ہیں۔تمام تر سیاسی،صوبائی،طبقاتی اختلافات کے باوجود جب اپنا سفارتخانہ نظر آیا تو دل کو ایک حیران کن مسرت ہوئی۔حالانکہ یہاں 55افراد پر مشتمل سفارتخانے میں بلوچ قوم کا ایک بھی فرد نہیں ہے سب کے سب پنجابی ہیں، ایک آدھ ایبٹ آبادی بھی ہوگا۔ پردیس میں سوائے کڑھنے کے آپ اور کربھی کیا سکتے ہیں۔لیکن گھر میں حساب کتاب نہ ہو تو وہ گھر برباد ہوجاتا ہے۔اس لئے ہم سب کو مشترکہ طور پر،مل کر،مسکراتے ہوئے، بہت ذمہ داری کے ساتھ ہمہ وقت حساب کتاب کرتے رہنا چاہیے۔بلوچ کہتے ہیں اگر تم دو بھائی ہو تو خود کو تین کہتے رہو۔اور تیسرے بھائی کا نام باہم ’’حساب کتاب‘‘ ہے۔

9۔ملاّؤں میں بھی مسلمان ہوسکتے ہیں

(پشتو ضرب المثل)

بیجنگ میں ہمارا پاکستانی سفارتخانہ ایک اچھے خاصے وسیع رقبے پر قائم ہے۔وفد کے کسی دوست کو پتہ نہیں تھا کہ آجکل چین میں ہمارا سفیر کون ہے۔گیٹ پر پوچھا تو پاکستانی اہل کار نے بتایا یہاں ریاض احمد خان ہمارے سفیر ہیں۔ ہمارے لئے یہ بہت ہی خوشگوار حیرت کی بات تھی۔اس لیے کہ ہم انہیں ٹی وی پہ بہت دیکھا کرتے تھے جب وہ اسلام آباد میں وزارت خارجہ کے ترجمان کے طور پر ہر ہفتے پریس بریفنگ دیا کرتے تھے۔ہمیں ان کے تعلیم یافتہ اور مفکر ہونے کا علم تھا۔وہ بہت سینیئر سفارتکار ہیں اور امور خارجہ کے ماہر ہیں، وہ عوامی جمہوریہ چین میں پہلے بھی 1970 سے لے کر 1973 تک سفیر رہ چکے ہیں۔بعد کے 35 برسوں میں بھی چینی امور کے بہت قریب رہے ہیں۔وہ یہاں کی تاریخ، ثقافت اور معاصر تبدیلیوں کا گہرا ادراک رکھتے ہیں۔انہیں چینی زبان پہ عبور حاصل ہے۔وہ ہمارے ساتھ آئے ہوئے جنکشی یو سے اس روانی سے چینی بول رہے تھے جیسے خالہ زاد بھائی ہوں۔

ریاض صاحب نے بہت فاضلانہ باتیں کیں۔انہوں نے پاکستانی معاشرے کو مجموعی طور پر ملاّؤں کا یرغمال معاشرہ قرار دیا۔مختصر وقت میں انہوں نے عوامی جمہوریہ چین کی ترقی کی جو خوبصورت جھلک دکھائی اس سے ہم بہت متاثر اور حیران ہوئے۔انہوں نے اظہار صاحب کی اس بات کو تسلیم کیا کہ تعلیم، ترقی،(اور محبت) کی راہ میں فیوڈل نظام رکاوٹ ہے۔فیوڈل ازم جب تک ختم نہیں ہوگا، سکولوں کی عمارتیں، بیٹھکوں کے طور پر ہی استعمال

ہوتی رہیں گی اور ڈسپنسریاں فیوڈل لارڈ کی بھینسوں کے باڑے بنی رہینگی۔

انہوں نے تصدیق کی کہ جدید چین میں پہلا کام ہی یہ ہوا تھا کہ جاگیرداروں کی جاگیریں ضبط کی گئی تھیں اور ملک میں سے فیوڈل ازم کا مکمل خاتمہ کردیا گیا تھا۔ان کا مشورہ تھا کہ پہلے چین کی ترقی دیکھئے، مشاہدہ کیجئے اور پھر اس پر لکھیے۔

ہم اسلام آباد کی طرف سے دنیا کے کسی بھی سفارت خانے میں مقررہ کردہ ایک اچھے خاصے عالم شخص سے مل کر بہت متاثر ہوئے۔

چرسی اتنا بہت چرس پی گیا تھا کہ ٹُن ہو کر تیز دھوپ میں گر پڑا۔ راہ گیر گزرتے رہے، کسی نے بھی اس کی پرواہ نہ کی۔ خود اس میں دم نہ تھا کہ ہل جل سکے۔ پھر ایک سفید پگڑی اور سیاہ لمبی داڑھی والا ملاّ وہاں سے گزرا اور سے ٹانگ سے کھینچ کر سائے میں ڈال دیا۔ چرسی ایک آنکھ بند اور ایک نیم کھلی آنکھ سے سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ بڑی حیرانگی سے کہنے لگا:''

''ارے ملاّؤں میں بھی مسلمان ہوتے ہیں!!۔''

جی ہاں۔ پاکستانی بیوروکریٹوں (سفیروں) میں بھی انسان ہوسکتے ہیں۔ ہم آدھ گھنٹہ اس اچھے آدمی کے پاس گزار کر،اور پاکستانی کڑک چائے کا پیالہ پی کر نکل کھڑے ہوئے۔

10۔عوامی جمہوریہ سائیکلستان

باہر سڑکوں پر ہمیں ماحولیات دوست سائیکلیں ہی سائیکلیں نظر آئیں۔ ہلکی پھلکی، میڈ ان چائنا سائیکلیں۔ کہتے ہیں کہ چین میں 500 ملین سے زائد سائیکلیں ہیں۔ ان میں سے ایک کروڑ صرف بیجنگ میں ہیں۔

مگر یہ لوگ اپنی سائیکلوں کی دیکھ بھال بالکل نہیں کرتے۔ ان کی سائیکلیں کراچی اور لاہور کے رکشوں کی طرح سادہ ہیں۔ نہ تلّی کے سیلاچیوں کی طرح ہینڈلوں پر رنگین پلاسٹک لپیٹے ہوئے ہیں، نہ دکی کے ناصروں کی سائیکلوں کی طرح چار چار مختلف سائزوں کے آئینے لگے ہوئے ہیں۔ نہ بیل پٹ والوں کی سائیکلوں کی طرح کوئی جھالر یا رنگین رومالیں لٹکی ہوئی۔ نہ ٹن ٹن کرتی گھنٹیاں ہیں، نہ بزر ہیں۔ ہم نے تو بزنجو کے نال میں ایک سائیکل پر زور زور سے ٹیپ بھی بجتا ہوا دیکھ رکھا تھا۔ ادھر کیا ہے۔ بس سادہ لوہے کی سائیکلیں۔ اپنی گھوڑی کو بھلا کوئی ایسا بھی رہنے دیتا ہے!!

چینی اپنی سائیکل کی ایک اور طرح سے بھی بے عزتی کرتے ہیں: وہ اس سے بار برداری کا کام بھی لیتے ہیں۔ سائیکل کو پیچھے سے ریڑھی بنا لیتے ہیں یا پھر اس کے ایک طرف ٹرالی لگا لیتے ہیں۔ اور اس پر کدّو ڈھوتے ہیں۔

گو کہ چین میں کار موٹریں تعداد، ماڈل اور میک کے لحاظ سے بڑھ رہی ہیں، یہاں بسوں کا بھی بہت ہی بڑا اور منظّم نیٹ ورک موجود ہے، ٹیکسی بھی وافر تعداد میں موجود ہیں۔ مگر سائیکل تو گویا بوڑھے کے عصا کی مانند ہر ایک نے رکھی ہوئی ہے۔ روزمرہ زندگی میں بائیسکل ایک مضبوط لازمہ ہے۔ یعنی ہر شخص کے پاس اپنی سائیکل ہوتی ہے۔ ایک لحاظ سے یہ سائیکل سٹیٹس سمبل ہوتی ہے۔ ہمارے پوچھنے پر دوستوں نے بتایا کہ لوگوں کی اکثریت ہر صبح سائیکل پر سٹیشن یا بس سٹاپ جاتی ہے، پھر یہ اپنی سائیکل فولڈ کر لیتے ہیں جو کل دس کلوگرام وزن کی ہوتی ہے اور اسے ٹرین یا بس میں ڈال کر مطلوبہ سٹیشن جاتے ہیں۔ وہاں پہنچ کر دوبارہ اپنی سائیکل اَن فولڈ کی، اس پر بیٹھے اور چلاتے ہوئے دفتر چلے گئے۔ رش کے گھنٹوں میں سفر کا یہ طریقہ بہ نسبت کار یا بس کے سستا بھی پڑتا ہے اور تیز تر بھی ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ورزش الگ۔

یہاں مصروف سے مصروف کاروباری سڑکوں اور اہم ترین شاہراہوں پر بھی دو رویہ چوڑے سائیکل ٹریک ہیں جنہیں لوہے کے جنگلے بنا کر سڑک سے علیحدہ کیا گیا ہے تاکہ

گاڑیاں اس ٹریک پر دخل انداز نہ ہو سکیں۔یعنی گاڑی والے الگ، سائیکل والے الگ اور پیادوں کے فٹ پاتھ الگ۔

مجھے سوجھی کہ ترجمان سے پوچھ ہی لوں کہ ان کے ادب میں سائیکل کا کیا مقام ہے ۔اس لئے کہ بلوچ کی شاعری میں اپنی سواری کا بہت تذکرہ موجود ہے۔گھوڑی خواہ حمل کی ہو یا بیورغ کی، چاکر کی ہو یا گوہرام کی، رامین کی ہو یا نوذ بندغ سخی کی، قادر کھیتر ان کی ''کنڈھی'' ہو یا جام درک کی ''مہلب''۔اس کا تذکرہ ہماری شاعری میں خوب ہوا ہے۔جام تو یوں کہتے ہیں:

ہم نے اسپ تازی کو حال دل سے آگاہ کیا
(وہ) سبک رفتار دشت پیما صورت حال سے مطلع ہوا
اس نے زامر (1) جیسی اپنی دم مور کے پنکھ کی طرح پھیلا دی
اور اپنی نازک رانوں پہ چابک کی طرح مارنے لگا
اے میرے آقا (جو بھنگ اور مشک کی خوشبو کا شائق ہے
جس کے دستار میں خراسان کے مشک کی خوشبو بسی ہوئی ہے)
خدائے قادر حادثات سے بچائے
میں تجھے شام تک وہاں پہنچا دونگا
اس شاندار خیمے کے سامنے جہاں وہ آہو مثال حسینہ رہتی ہے
جو سرو قد گہر رنگ اور خوش آواز ہے
جو لعل اور ہیرے کی مانند ہے اور یاسمین کی خوشبو سے معطر
(جو) ہرات کے محلات میں محوخرام ہے

بلوچستان میں گھوڑی کے بعد سواری کے بطور مہاری اونٹ بہت استعمال ہوتا ہے اسی مہاری اونٹ پہ بھی بہت ضخیم شاعری موجود ہے۔خواہ یہ پنوں کی مہری ہو، یا شہ مرید کا شترِ خضر۔۔۔

آیئے جام ہی سے بلوچوں کی دوسری سواری یعنی اونٹ کے بارے میں سنتے ہیں:

خواتین نے سامان باندھ رکھا ہے
جو شتر بانوں نے بار کے اوپر لاد دیا ہے
بَن کی چڑھائی اور ناگا ہو کا راستہ
اونٹوں نے اپنے پیروں تلے روند ڈالا
اونٹ قطار اندر قطار جا رہے ہیں
ان پر خماری آنکھوں والی دوشیزائیں سوار ہیں

ٹرک پہ تو وافر مقدار میں شاعری ہوئی ہے۔تو چینی لوگ اپنی یا اپنے محبوب یا محبوبہ اور یا پھر رقیبِ روسیاہ کی سائیکل کی قصیدہ یا ہجو گوئی میں کیا کچھ تخلیق کر چکے ہونگے۔

11۔رنگی برنگی کاروں کو

کاریں بہتات میں نظر آتی ہیں۔اور وہ سڑکوں پہ نہیں بلکہ عملاً عیدگاہ کی لمبائی جتنی چوڑی دو طرفہ شاہراہوں پہ آجا رہی ہیں۔کار بنانے میں چین کے اندر ملٹی نیشنل کارپوریشنوں نے باقاعدہ مشترکہ سرمایہ کاری شروع کر رکھی ہے۔اس لئے اب یہاں ہر برانڈ کی گاڑی ملتی ہے۔سوزوکی سے والکس ویگن تک، KIA سے لے کرٹو اوڈی ٹویوٹا تک، ہنڈا سے لے کر ۔۔۔۔پتہ نہیں الا بلا سب ہے یہاں پر۔مرسڈیز میں بیٹھے موٹے گردنوں والے ایک آدھ ''صاحب'' بھی ہمیں نظر آئے۔میں نے پوچھ ہی لیا کہ یہ موٹی گردن والا اکڑ خان کون ہو سکتا ہے۔چین میں جاگیرداری پھوں پھاں کی تو گنجائش نہیں ہونی چاہیے کہ اسے تو آپ لوگوں

نے پچاس برس قبل ختم کر دیا تھا۔ جنکشی یو کا ترجمہ آلود جواب تھا کہ بیوروکریٹ ہوگا۔ میں تصور میں آن کی آن میں واپس بلوچستان میں تھا۔ بیوروکریسی تو تہذیب کی استرداد ہے۔ میرے وطن کی دولت، تعلیم، رعونت، فرعونیت ، شہرت ، غیرملکی دورے، مزے، حجوں پہ حج، پلاٹ، زمین، کانیں۔۔۔۔۔سب نعمتیں انہی کی ہیں۔ میں نے چینی بیوروکریسی کا پوچھا تو جو جواب آیا وہ عبرت کے لئے کافی تھا:

’’......مثلاً سرکاری کاروں کی بات لے لیں۔ یہ بالکل عوام کی جیبوں پہ بوجھ ہیں۔ اگر سرکاری کار کی بجائے افسر کو ایک ٹیکسی کی سہولت مہیا کی جائے تو سال میں خرچہ 87 فیصد بچتا ہے۔ ایک تحقیق سے پتہ چلا کہ سرکاری کار جتنے میل چلتی ہے اس سب میں سے صرف ایک تہائی میل سرکاری کام کے ہوتے ہیں، بقیہ سارے میل افسر صاحب اور اس کی فیملی کے ذاتی استعمال کے لیے ناجائز استعمال ہوتے ہیں۔۔۔۔،،

میں نے پوچھا کہ آپ کی اپنی کار کس نام کی ہے تو وہ استھزائیہ انداز میں بولا’’یہ سب نام کی گاڑیاں ہماری اپنی ہیں۔ ہم ہی انہیں بناتے ہیں‘‘۔ مثلاً جاپان والی ہونڈا کار ’’میڈ ان چائنا‘‘ ہے اور چین کی ’’گوانگ ژو آٹو موبائل کارپوریشن‘‘ اس میں شریک ہے اور اب یہ کاریں یورپ بھر میں اور بالخصوص جرمنی میں دھڑا دھڑ برآمد ہو رہی ہیں‘‘۔ آپ خود یہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ خود چین کے اندر کتنی بڑی مارکیٹ ہے۔ چین آٹو موبائل میں دنیا کی تیسری بڑی مارکیٹ ہے۔ کوریا والے ہونڈائی موٹرز نے اسی بڑے موقع کو دیکھ کر گوانگ ژو آٹو والوں سے شراکت داری کر کے ’’گوانگ ژو ہنڈائی‘‘ کے نام سے چین کے اندر بڑے پیمانے پر ’’کارسازی‘‘ شروع کر دی۔ واضح رہے کہ ’’گوانگ ژو آٹوز‘‘ ہنڈا اور ہنڈائی کے علاوہ ٹویوٹا کے ساتھ بھی کاریں بنا رہا ہے۔ ہنڈائی والے ’’بیجنگ آٹوز‘‘ کے ساتھ بھی کاریں بناتے ہیں اور ’’ڈونگ فینگ موٹرز‘‘ کے ساتھ مل کر بڑے پیمانے کی ٹرک سازی میں مصروف ہیں۔

چین میں ماحولیاتی آلودگی بالکل نہیں ہے۔ دھواں اور غبار نہیں۔ ہارن اور چیخ و پکار نہیں۔ بسیں بجلی سے چلتی ہیں۔

12۔ قسم مجمعے کی، قسم سردار کی، قسم دنبوں کی

(بلوچوں کی قسمیں)

راستے میں ہمیں ایک ریوڑ نظر آیا۔ میں تو خوشی کے مارے اچھل پڑا۔ ہم بلوچوں کی تو رزق روزی بھیڑ ہے۔۔۔۔ ٹک کر رہ گئیں نگاہیں۔ بھیڑ۔۔۔۔۔ ہماری آمدن، ہمارا راشن پانی ، ہماری دولت مندی ، ہمارا جاہ و جلال، ہمارا زرمبادلہ ، ہمارا گزر بسر ، ہماری شناخت۔۔۔۔ بھیڑ ہمارا ادب، ہماری شاعری، ہمارا مست، ہماری سمو، ہماری خانہ بدوشی ، ہماری چراگاہ۔ مگر سنیئے یہاں چین میں چراگاہوں کی ضرورت ہی نہیں۔ ہر جگہ سبزہ ہی سبزہ ہے ۔ سڑکوں کے کنارے اتنے گھنے درخت لگے ہیں کہ عملاً جنگل ہیں۔ ریوڑوں کے لئے اس جنگل میں درختوں کے سوکھے پتے ہی کافی ہیں۔ میں نے دیکھا کہ اس ریوڑ کی بھیڑیں قحط زدہ، پیدا گیر اور لاغر بالکل نہیں دِکھتیں۔ ہمارے ریوڑوں کے برعکس اس ریوڑ میں راہنمائی اور کنٹرول کے لئے ’’سربز‘‘ نامی دو تین بکریاں موجود نہیں ہیں۔ ان کا چرواہا چرواہن ہے۔ جی ہاں عورت مال چرا رہی ہے۔ اور یہ بلوچ چرواہن جیسی بالکل نہیں ہے۔ ارے اس عورت نے تو جوتے پہن رکھے ہیں۔ جی ہاں جوتے۔ اس کے کپڑے پھٹے نہیں ہیں بلکہ اس نے کوٹ پہن رکھا ہے اور پتلون بھی۔ یس سر، سوٹڈ بوٹڈ چرواہن۔ یا مست توکلی ! بدل دے ہماری حالت، دفعان کر ہماری غربت، دور کر ہماری پسماندگی ! اس گڈرین نے مشکیزہ نہیں، ایک کالا ساڈبہ کندھے سے لٹکا ہوا تھا۔۔۔۔ جی، یہ ریڈیو تھا۔۔۔۔ چین زندہ باد۔ اس کا سوشلزم زندہ باد۔

13۔خوردم خوردم گاؤ شدم

چین، دنیا بھر میں کھانے کے اوقات کے سلسلے میں ممتاز ملک ہے۔ یہاں کے لوگ دن کے ٹھیک بارہ بجے کھانے کی میز پر ہوتے ہیں۔اسی طرح اُدھر سورج ڈوب رہا ہوتا ہے اور اِدھر چینی رات کے کھانے کے لئے دسترخوان پہ موجود ہوتے ہیں۔ یہ ہمارا پہلا دن تھا ان کے دیس میں۔اور میزبان ہمیں اولین ''نمک خوری'' پہ لئے جارہے تھے۔بلوچ کے یہاں بارہ بجے کھانا کھانے کا تصور موجود نہیں۔اس کے پاس تین نہیں دو وقت کا ''کھانا'' پایا اور کھایا جاتا ہے۔بلوچ شیعوں کے نماز کی طرح کھانا صبح چھ بجے ناشتہ بھی کرتا ہے وہی اس کا دوپہر کا کھانا بھی ہوتا ہے۔اور پھر ایک روٹی چادر کے پلو میں باندھ کر کام پر روانہ ہوتا ہے ۔۔۔کھیتوں کو یا چراگاہ کو۔

چینی لوگ کھانے سے متعلق بہت دلچسپ اور فرق لوگ ہیں۔ان کے ہاں ضرب المثل ہے کہ ''جسم گرم ہو، پیٹ بھرا ہو، ذرا سی تاریکی ہو، ذرا سی نمی ہو''۔ان کا ایک شاعر کہتا ہے کہ: بھرا پیٹ بڑی چیز ہے، باقی سب عیاشی ہے۔(2)۔ان کے ہاں پیٹ بھرا ہوا ہونا زندگی میں بہت بڑی نعمت ہے۔وہ اسے ضرب المثل کی طرح استعمال کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں۔۔۔فلاں شخص بھر پیٹ خیالات۔۔۔یا۔۔بھر پیٹ علم۔۔یا۔۔۔بھر پیٹ شعر و ادب کا مالک۔۔۔ہے۔

بہرحال کھانے کی عادات کے لحاظ سے ہم پاکستانی وفد والے سب کے سب انگریز ہیں۔ چھ بجے بیڈ ٹی پیتے ہیں، بریک فاسٹ آٹھ بجے تناول فرماتے ہیں۔لنچ جا کر ڈھائی بجے ہوتا ہے۔اب یہاں چین میں ہم جید پاکستانی علماء و حکما بارہ بجے لنچ پر انڈیل دیے جا رہے تھے۔انہیں کیا خبر۔۔۔۔وہ تو محنتی لوگ ہیں۔ایڈوانس ترین ٹیکنالوجی کو بھی اپنی سرزمین اور اپنی روایتوں کی ہم آہنگی میں بڑی خوش اسلوبی سے چلا رہے ہیں۔یہ بے نخرے، بے اٹھکیلی لوگ شام کو بھی ٹھیک چھ بجے رات کا کھانا کھاتے ہیں۔اور آٹھ بجے رات کو بستر پر ہوتے ہیں۔

میزبان جنکشی یو نے چینی خوراک میں بڑی ورائٹی کے بارے میں بتایا: ''ماؤ کے صوبے ہونان کی خوراک سب سے زیادہ چٹپٹی ہوتی ہے۔شنگھائی والے سمندری خوراک کھاتے ہیں۔شمالی چین کا طرز نسبتاً سادہ ہے جہاں پیاز، تھوم اور دوسری سبزیاں شامل ہیں۔بیجنگ ، بیجنگ مرغابی جیسی شاہی ڈشوں کی وجہ سے ممتاز ہے۔شمال میں نوڈلز عوام کی خوراک ہیں جبکہ جنوب میں چاول ہے۔چین بھر میں سؤر اہم ترین گوشت ہے۔شمال مغربی چین میں چاول پلاؤ، مصالحہ دار نوڈلز اور دنبے کے کباب عام ہیں۔جبکہ تبت میں روسٹ کیا ہوا جو کا آٹا... ہے جس میں یاک کا گوشت ملا ہوتا ہے۔اور یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ چینی عوام خوراک میں کچھ بھی ضائع نہیں کرتے۔کتے سے لیکر چھپکلی تک۔اور مچھلی سے لے کر ٹڈی تک۔

ہمارے اچھے میزبان، ہمارے دوست جنکشی یو ہمیں بڑے غرور و افتخار کے ساتھ ''ریڈ روز'' نامی ہوٹل لے گئے۔''یہ ایغور قومیت والے کی ملکیت ہے'' اس نے کہا۔''ارے ایغور؟'' میں نے تقریباً چیختے ہوئے اس کی بات کاٹ دی۔سب دوست حیران ہوئے۔میں نے انہیں ایغوروں سے وابستہ بلوچستان کی کہانی سنائی:

اب سے نصف صدی قبل چین والے ترکستان (موجودہ سنکیانک) میں کاشغر سے کچھ دور ضلع ''آقتو'' میں ''بارین'' نامی ایک گاؤں تھا۔وہاں سے حاجی توختہ نامی شخص جو کہ دو بچوں کا باپ تھا۔بغرضِ تجارتِ ریشم متحدہ ہندوستان روانہ ہوا۔اس کے ساتھ اس کا بھائی عبدالباقی تھا۔دونوں بھائی پہلے بدخشاں گئے۔ایک بھائی بدخشاں میں رہ گیا اور حاجی توختہ ڈیرہ اسماعیل خان اور پھر وہاں سے ژوب بلوچستان پہنچ گئے۔ژوب میں انھوں نے ڈرائی

فروٹ کا کام شروع کیا اور وہیں شادی کر لی۔

ان کے ہاں دو بیٹے پیدا ہوئے ۔ بڑا محمد الیاس اور دوسرا غیاث الدین ۔ 1950 میں حاجی توختہ دورانِ سفر بدخشاں میں انتقال کر گئے اور وہیں دفن ہوئے۔اِدھر بلوچستان میں یہ دونوں بے یار و مددگار یتیم بچے والدہ کی شفقت اور مشقت میں پلتے رہے ۔اب جبکہ غیاث اور الیاس خود بوڑھے ہو چلے ہیں تو کہیں جا کر ان دونوں بھائیوں کا خط و کتابت کے ذریعے دوبارہ اپنی ایغور خاندان سے رابطہ ہو سکا ہے۔ایک آدھ چکر انھوں نے وہاں کا لگایا اور وہاں سے ایک رشتہ دار بلوچستان آیا۔اس طرح سنکیانگ اور بلوچستان باہم رشتے دار ہیں۔کہاں بارین گاؤں ،کہاں ژوب ۔انسان کیا عجیب خلقت ہے ۔ یہ دونوں ایغور، یہ دونوں پٹھان، یہ دونوں بلوچ، یہ دونوں انسان، یہ دونوں بھائی میرے بہترین دوست ہیں۔''

جنکشی یو اتنا متاثر ہوا کہ آبدیدہ آنکھوں کے ساتھ بھاگ کر ہوٹل کے دفتر گیا اور مالک کو کھینچ لایا۔ ہاتھ ہلا ہلا کر بہ آواز بلند اسے ساری کہانی سنائی۔سب حاضرین کی طرح غیاث والیاس کا یہ کزن بھی حیرت زدگی میں سنتا رہا۔پھر اچانک عربوں کی طرح تین بار حملہ آور ہو کر گلے لگا اور بہت گرم جوش خاطر مدارت کی۔

جنکشی یو کے بقول یہاں ''مسلم'' کھانا ملتا ہے ۔ہم پریشان بھی ہوئے اور ٹھٹکے بھی۔۔۔کہ یہ مسلم کھانا کیا ہوتا ہے ۔لگتا تھا ہم پھر ضیاء الحق عہد کے پاکستان میں داخل کر دیئے گئے ہوں۔بلا شبہ ہم بلوچ بلکہ سارے پاکستانی ،سندھ کے خانہ بدوش قبائل کے سوا، مینڈک ،سور، گدھا، گھوڑا، چھپکلی وغیرہ نہیں کھاتے ۔لیکن اصلی تے وڈے مسلمان تو عرب ہیں جن کے بارے میں فردوسی نے ''سوسمار خور'' اور ''اونٹنی کا دودھ پینے والے'' کہہ کر انہیں حقیر قرار دیا تھا۔ابھی بھی جب دولت سے چھلکتے ہوئے عرب شیخ شکار کھیلنے پاکستان جلوہ افروز ہوتے ہیں تو صحرا میں دریاں بچھاتے ہیں۔اور ریت پہ جب دری بچھ جائے تو اس کے نیچے ریت میں موجود کیڑے مکوڑے، گوح اور چھپکلیاں فرحت محسوس کر کے سطح پر آجاتی ہیں اور دری کے نیچے چہل قدمی فرماتی ہیں۔ ہمارے پاکستانی ہرکارے گواہی دیتے ہیں کہ جونہی دری کے نیچے چھپکلی حرکت کرتی نظر آئے تو عرب کی باچھیں کھل جاتی ہیں اور وہ جھپٹ کر دری پر سے اسے پکڑ لیتا ہے اور قریبی آگ میں پھینک دیتا ہے۔اور اس کی زبردست کچی پکی باربی کیو بنا کر جشن کے انداز میں چیختے چلاتے ہڑپ کر جاتا ہے۔۔۔۔اسی کے پیشِ نظر تو فردوسی نے ''شاہنامہ'' میں لکھا تھا:

زِ شیرِ شتر خردن و سوسمار
عرب را رسید است جائے بکار
کہ تختِ شہان را کنند آرزو
تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

ایک اور جگہ یوں کہا گیا ہے:

عرب در بیاباں ملخ می خورد
سگِ اصفہاں آبِ یخ می خورد

اسی طرح ذبح کئے ہوئے یا نہ کئے ہوئے گوشت کا معاملہ ہے جو ہر جگہ مختلف ہے۔ مثلاً شکار، خواہ وہ پہاڑی بکرے کا ہو یا پرندے کا، اسکا ذبح کیا جانا ہر وقت ممکن نہیں رہتا، لہذا شکار اگر ذبح ہونے سے پہلے ہی دارفانی سے کوچ کر جائے تو اسے ہم اسی طرح ہی کھا لیتے ہیں۔ ماہی خوری کے بارے میں مشرقی بلوچ کے تحفظات کے بارے میں ساری دنیا جانتی ہے۔ہمیں یاد ہے کہ بچپن میں جب ٹڈی دل وبائی صورت میں آتا تھا تو ہمارا پورا گاؤں انہیں پکڑنے، اور ٹڈی کو لکڑی کی سیخوں پر پرونے اور سیجی کر کے کھا جانے کیلئے امڈ آتا تھا۔۔مرد و زن، پیر و جواں ٹڈی خور بن چکا ہوتا۔ ''مسلم فوڈ''!!۔جنکشی یو بھولا بادشاہ ہے۔

جنکشی یو چونکہ پہلے پاکستان آچکے تھے اس لئے انہیں ہمارے مزاج سے بڑی حد

تک شناشائی تھی۔ چنانچہ انہوں نے روٹیوں کا آرڈر بھی دے دیا حالانکہ عام چینی روٹی نہیں کھاتے۔

چین میں کھانے کی میز بالکل گول ہوتی ہے۔ سب لوگ بیٹھ جاتے ہیں۔ ہر ایک کے سامنے خالی برتن مثلاً ایک پرچ جیسی چھوٹی پلیٹ، قہوہ کے لئے ایک مگ نما کپ' جوس وغیرہ کا گلاس، چائے کا کپ، چاپ سٹک کی جوڑی اور چمچ رکھ دیئے جاتے ہیں۔ سالن وغیرہ کے ڈونگے اس میز کے مرکز میں موجود ایک اور گول شیشے پر رکھے جاتے ہیں جو ہاتھ لگانے سے گول گھوم گھوم کر مطلوبہ ڈونگا مطلوبہ شخص کے سامنے لاتا جاتا ہے۔ خوبصورت جوان ویٹریسیں کھانے کی ڈشیں درمیان والے شیشے پر سجاتی رہتی ہیں۔ پہلے خالی مگ میں چائے یا جوس یا کوک یا Yogurt بھر لیتی ہیں۔ پھر کھانا رکھتی جاتی ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ یوگرٹ دہی کو کہتے ہیں۔ مگر یہ دلچسپ ہے کہ دودھ نما مائع، بطور جوس یا کوک گلاسوں میں ڈالا جا رہا تھا۔ اور اس کا پیک بھی ہمارے ہاں کے کاغذی ''حلیب'' دودھ وغیرہ کا سا تھا۔ چکھ کر دیکھا تو یہ ہماری لسی تھی۔ اور یہ تو گویا ہم اپنے پاکستان میں آ گئے تھے۔ مشکیں بھر بھر کر گلاس پی لئے گئے۔ وہاں تو ہم نے دوستوں کو کچھ نہ کہا۔ آج آپ کو بتا رہا ہوں کہ ماسکو عالمی یوتھ فیسٹول میں منگولیا کے وفد کے لیڈر نے ہمیں مدعو کیا تھا۔ ہم لوگ جب وہاں گئے تو بالکل حیران رہ گئے کہ بالکل ایک بلوچ کا سا گھر اور گھرہستی ہے۔ وہی خیمہ، اس میں وہی سامان جو ہمارے ہاں ہے۔ انہوں نے بھی جو مشروب پلائی وہ میں نے چکھ کر دیکھا تو لسی ہی تھی۔ بس پھر کیا تھا میں نے گلاس ختم کر ڈالا۔ دنیا کے اکثر علاقوں میں رواج ہے کہ آپ کا جام خالی ہو تو آپ گویا اور پینا چاہتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ اس لذیر، گاڑھی اور دلکش لسی کے کنگ سائز تین گلاس چڑھا کر چوتھا بھروا بیٹھا تو ساتھ میں بیٹھے ایرانی وفد کے سربراہ نے پوچھا ''می دانی چہ است؟'' (جانتے ہو کیا ہے؟)۔ ''شیرِ ترش است'' (لسی ہے) میں نے جواب دیا تھا۔ اس نے کہا کس جانور کی ہے؟ میں نے لاعلمی کا اظہار کیا تو اس نے انکشاف کیا کہ یہ تو گھوڑی کی لسی ہے۔ دل چاہا سب کچھ انڈیل دوں، میں بلوچ ماما وہاں قے کر کے جگ ہنسائی تو نہ کر سکتا تھا مگر وہ دن میں نے جس طرح گزارا وہ مجھے اور میرے رب کو پتہ ہے۔ اگر میں آج یہاں صرف یہ اشارتاً بھی کہہ دیتا کہ ''ایں شیرِ ترش از اسپ است'' تو آپ اندازہ کریں کہ بارلیش و باوضو، داور صاحب میز کرسی، اپنے کپڑوں کا کیا حشر کر لیتے اور موزہ پوش ومشرع اظہار الحق کس واش روم بھاگتے پھرتے!!

یہاں بھی یورپ کی طرح گلاس یا کپ کو خالی نہیں ہونے دیا جاتا۔ خالی ہونے سے پہلے ہی بھر دیا جاتا ہے۔ پھر ڈشیں اور پکوان لائے جاتے ہیں ایک کے بعد دوسری۔ یہ سلسلہ گھنٹہ دو گھنٹے تک چلتا ہے اور ان دو طویل گھنٹوں کے دوران لگا تار کھاتے رہنا تھا۔ اب جب ہم نے حساب لگایا تو تقریباً قصہ برابر ہوا۔ یہ لوگ بارہ بجے شروع کرتے ہیں اور 2 بجے ختم کرتے ہیں۔ اور ہم دو بجے شروع کرتے ہیں اور سوا دو بجے ختم۔ اپنی اپنی ثقافت ہے۔ ہمارے سلیم اختر 26 ڈشوں تک گنتی کرتے رہے بعد میں ایک ''بے کار ایکسر سائز'' قرار دے کر انہوں نے گنتی ترک کر دی۔ ہلکے پھلکے زود ہضم کھانے۔ پیٹ بھر کر کھانے پر بھی گرانی نہیں ہوتی۔ نہ کیلوریز کا معاملہ نہ کولیسٹرول کی پیمائش کی حاجت۔ ابلی ہوئی سبزیاں، ان کے کھانے کا اسی فیصد حصہ تشکیل دیتی ہیں۔ آلائشوں سے پاک معاشرے میں آلائشوں سے پاک خوراک!! یہ لوگ مرچ نہیں کھاتے، یہ لوگ گھی نہیں کھاتے۔ یہ لوگ میٹھا نہیں کھاتے، یہ لوگ محنت بہت زیادہ کرتے ہیں، یہ لوگ محبت بہت زیادہ کرتے ہیں،۔ یہ لوگ فطرت سے ہم آہنگ ہو کر زندگی بسر کرتے ہیں، یہ لوگ ملاّ کو نہیں مانتے۔۔۔ اس لئے صحت مند ہیں باوقار ہیں۔

ڈشیں آتی رہیں، حوریں ڈھوتی رہیں، ہماری حیرت زدہ آنکھیں پھیلتی رہیں، تحیر بھرے تحسینی تبصرے ہوتے رہے۔

تب جناب عالی! ایک ڈش آئی اور ہم حیران رہ گئے۔۔۔ یہ بچی کی پوری ران تھی۔

جی بالکل ہماری بلوچی سجی۔ کدھر سنکیانگ کدھر ماوند، کدھر ایغور کدھر مری۔ اللہ تیری قدرت۔ نہ رابطہ، نہ مشترکہ منڈی نہ رسل ورسائل، نہ زبان ایک نہ کلچر ایک۔ یہاں یہ باقاعدہ ایغوروں کی ڈش ہے۔ وہاں یہ خالص بلوچوں کی ڈش ہے۔ بلوچ ایغور اتحاد!! بولو "زندہ باد"۔

اور جو میں نے کھایا اور جو میں نے کھایا۔ بلوچستان کی بھرپور نمائندگی کی میں نے۔ مجھے پتہ تھا پاکستانی بزرگوں نے کھانا نہ تھا، باقی رہ گئے دو عدد چینی تو انہیں بھی سبزی پر لگا کر خود وحشیوں کی طرح شروع ہو گیا۔ میرے معدے نے اپنی کم خوری، قبل از وقت لنچ کے بہانے وغیرہ سب تج دیے۔ ایغور بیروں، مگر یہاں بیرے نہیں ہوتے بھائی، بیرنیں ہوتی ہیں اور بیرنیں بھی ایسی کہ ہندو کو گائے کا گوشت کھانے پر مجبور کر دیں، ان کیلئے ہڈیاں ہی ہڈیاں بچ گئیں تھیں۔

میزبان نے بتایا کہ ایغور لوگ بھی بکرے یا بھیڑ کے بڑدست (شانے) کی ہڈی کو اخبار کی طرح پڑھتے ہیں، اور پڑھ کر پیش گوئیاں کرتے ہیں۔ بالکل ہم بلوچوں کی طرح۔ دادا ، وزیر خان زندہ ہوتے تو یہاں بھی ایک نکاح کر لیتے اور بلوچ ایغور مشترکہ اقدار کو مزید مضبوط کرتے۔

چینی لوگ چھ انچ باریک ٹہنیوں جیسی چھڑی کی جوڑی کو لقمہ اٹھا کر منہ تک لے جانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ جنکشی یو نے ان کا نام چینی زبان میں بتایا مگر بے شک مجھ سے پورا دعائے قنوت سن لو مگر چینی ایک لفظ بھی یاد رکھنا مشکل ہے۔ انہیں انگریزی میں چاپ سٹک کہتے ہیں۔ یہی موٹے تنکے انکی انگلیاں ہوتے ہیں، یہی چمچ، کانٹا اور چھری ہوتی ہے۔ وہ بڑی بے دردی سے اسے استعمال کرتے ہیں اور بڑی بے دردی سے کھاتے ہیں۔ چینی لوگ بڑی بے دردی سے کھاتے ہیں۔ کھانا کھانے کی چپک چپک آواز سمرقند تک جاتی ہے۔ چاپ سٹکس ایک ہزار سال قبل مسیح ایجاد ہوئے تھے اور انہوں نے چینیوں کے کھانے کے طور اطوار بدل ڈالے۔

ہمیں یہاں کھانے میں تربوز بھی ملا۔ بہت ہی لذیذ بہت ہی میٹھا۔ لیکن جناب، ان کے پیش کرنے کا طرز بہت دلکش اور نرالا ہوتا ہے۔ ویسے چینی کھانے اپنی نمود و نمائش میں ثانی نہیں رکھتے۔ انہوں نے تربوز کی کاشیں تکون بنائی ہوئی تھیں اور ہر کاش ڈبل روٹی جتنی موٹی تھی۔ مگر اس کا مطلب نہیں کہ عام چینی بھی تربوز اسی اہتمام سے کھاتا ہے۔ نہیں نہیں۔ وہ تربوز ہماری طرح ہی کھاتے ہیں۔ چاقو ملا تو کاٹ کر وگرنہ توڑ کر کھاتے ہیں اور چھلکے ٹوکریوں میں ڈالتے ہیں۔ میں نے تربوز کھاتے ہوئے حاضرین کو **De Mello** کی کتاب کا یہ واقعہ سنایا:

تربوز چوری کے الزام میں تین لڑکوں کو عدالت میں لایا گیا۔ وہ بہت سہمے ہوئے تھے اس لئے کہ جج بہت سخت آدمی تھا اور بدترین سزائیں دینے میں مشہور تھا۔

مگر وہ ایک دانا معلم بھی تھا۔ اس نے کہا: "یہاں اگر کوئی ایسا شخص موجود ہے جس نے اپنے لڑکپن میں کبھی تربوز نہ چرایا ہو، تو وہ ہاتھ اٹھائے"۔ اس نے انتظار کیا۔ مگر عدالت کے اہل کار، پولیس والے، تماشائی ____ اور خود جج ____ سب کے ہاتھ اپنے سامنے کے ڈیسک پہ ہی رہے۔

جب اسے اطمینان ہوا کہ کمرۂ عدالت میں ایک بھی ہاتھ نہ اٹھا تو جج نے کہا: "کیس ڈسمس" (4)

یہ "کیس ڈسمس" بعد میں پورے دورانِ سفر ہمارے انگریزی دان مترجم ہو وائی کا تکیہ کلام بن گیا۔

چینی مزدور اپنا دوپہر کا کھانا صبح ہی ساتھ لاتے ہیں۔ اور جونہی بارہ بجے کھانے کا وقفہ ہوتا ہے وہ اپنے ڈبے کھول کر بیٹھ جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ان ڈبوں میں زیادہ تر نوڈلز کے اوپر ابلی ہوئی موسمی پتے دار سبزیاں یا پھلیاں ہوتی ہیں۔ ساتھ گوشت کا ایک ٹکڑا۔ کسی ڈبے میں ابلے ہوئے موٹے چاولوں پر گوشت یا سبزی کا آمیزہ پڑا ہوتا ہے جسے وہ بہت شوق

سے کھاتے ہیں(5)

14۔خوراک میں بھی مارکیٹ اکانومی

اکیسویں صدی کا انسان اشتہاروں کا غلام ہے۔اشتہار اس کے پنگھوڑے سے ہی اس کا پیچھا شروع کر دیتے ہیں اور اس کی قبر تک میں انڈیل دیے جاتے ہیں۔ڈیمانڈ کو سپلائی بنانا اور سپلائی کو ڈیمانڈ میں بدل دینا اشتہاروں کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔۔۔۔۔سڑکوں پر سیدھے سادھے اشتہار۔جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے مرغن ومزین کردہ اشتہار۔کہیں جلتے بجھتے برقی قمقموں سے کنزیومرازم بڑھائی جا رہی ہے تو کہیں بڑی ٹی وی سکرینیں یہ کام کر رہی ہوتی ہیں۔بڑے بڑے بورڈ ہیں۔۔۔۔حتیٰ کہ راستے میں کھڑے ہوئے کرائے کے آدمی بھی پمفلٹ یا کارڈ کی صورت میں اشتہار بازی میں مصروف ہوتے ہیں۔۔۔۔چین ایک دلچسپ سمت رواں دواں ہے۔

عوامی جمہوریہ چین میں میکڈونلڈ اور KFC کی بے شمار طعام گاہیں آپ کو نظر آئیں گی۔پاکستان کی طرح یہاں بھی نوجوان نسل کے اندر یہ کھانے بہت مقبول ہیں۔KFC سے بنتا ہے:Kentucky Fried Chicken۔یہ 1987 میں چین میں داخل ہوئی۔اب یہ اس ملک کے 260 شہروں میں 1200 شاخوں کی مالکن ہے۔ایک دفعہ ہمارے دوست جنکشی یو نے محفل کو خوشگوار بنانے کے لئے دوسری زبانیں سیکھنے کے فوائد والا لطیفہ سنایا۔تب ہمیں اندازہ ہوا کہ اشتہار بازی نظر آتی ہو یا نہ آتی ہو، کہاں کہاں پہنچ جاتی ہے۔لطیفہ آپ بھی سنیئے: چوہیا نے اپنے بچوں سے کہا''بچو' آج کھانا کہیں باہر کھاتے ہیں۔ بچوں کے اصرار پر وہ KFC کی جانب روانہ ہوئے۔چلتے ہوئے جب وہ ایک موڑ مڑ گئے تو اچانک انہیں سامنے سے ایک بڑی عمر کی تنومند بلی نظر آئی۔بچے سہم گئے۔اور معمر بلی نے بھی بال کھڑے کر دیئے ان کی طرف جھپٹنے کے لئے۔چوہیا کو کچھ اور نہ سوجھا تو اس نے کتے کی آواز نکال کر بھونکنا شروع کر دیا۔معمر بلی نے خود کو کوسنا شروع کر دیا کہ بڑھاپے میں اس کی نظر اتنی کمزور ہو گئی ہے کہ اتنا بڑا کتا بھی اسے صحیح نظر نہیں آتا۔لہٰذا بھاگ کھڑی ہو گئی۔چوہیا کے بچے بہت خوش ہوئے اور ماں کی عقلمندی کی بڑی تعریف کی۔ماں چوہیا نے کہا:''دیکھا غیر ملکی زبان سیکھنے کے کیسے فائدے ہوتے ہیں''۔

ہم نے کہا''دوست باقی سب تو ٹھیک ہے مگر KFC ہی کیوں؟''یار فکر میں پڑ گیا۔ہمارا مقصد پورا ہو گیا تھا۔

عارف کی یہ بات اب چینیوں نے غلط کر دکھائی کہ۔''چین میں بڑی توند والے کی تلاش میں کافی تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔۔۔۔(6)۔۔۔نہیں نہیں۔اب تو ماشاءاللہ ایک ڈھونڈو ہزار ملتے ہیں۔چین مین اٹھارہ ملین افراد Obese ہیں۔کھانے کی بری عادتوں اور کم ورزش کی وجہ سے یہ تعداد بڑھتی جا رہی ہے۔خوراک میں میٹھا بہت کم استعمال ہونے لگا ہے،سوڈا اور گھی کا استعمال بڑھتا جا رہا ہے(7)۔

حوالہ جات

1۔بلوچستان میں ایک خوبصورت،سدا بہار پودا جو چٹانوں پر اگتا ہے۔

2۔لین یوتانگ۔جینے کی اہمیت۔2002۔فکشن ہاؤس لاہور۔صفحہ نمبر 60

3۔گامر، رابرٹ ای : انڈرسٹینڈنگ کنٹمپریری چائنا۔لینے رائینر۔لندن۔999 1۔ صفحہ 17۔

4۔ڈی میلو:The prayer Of the Frog ۔گجرات سہتیا پرکاش انڈیا۔993ا

1۔صفحہ۔31۔

5۔کوکب،خواجہ:نی ہاؤ۔1990۔فیروزسنز لاہور۔صفحہ 25۔

6۔عارف ،سید ارشاد احمد۔ دیوارچین کے اس پار۔ 2000 ۔خزینہ علم و ادب
لاہور۔صفحہ 741

7۔Peoples Daily online April 2005۔

FORBIDDEN CITY

1۔شہرِ ظلمات کو ثبات نہیں

چینی دوست ''فار بڈن سٹی'' کا نام اتنا زیادہ لے رہے تھے کہ ہم سب کو اسے دیکھنے کا اشتیاق ہو گیا تھا۔ یہ دراصل بادشاہوں کے عہد میں شہنشاہ کے محلات پہ مشتمل علاقہ تھا۔ ظاہر ہے یہ علاقہ غریب غرباء اور عوام کے لئے شہرِ ممنوعہ ہی تھا۔اور عام لوگ سوائے جبری مشقت کے وہاں نہیں جا سکتے تھے۔اسی لئے یہ شہرِ ممنوعہ کہلاتا ہے۔ہم چونکہ اس بات سے باخبر نہ تھے اس لئے جب ہم نے اپنے چھپے ہوئے پروگرام کے کتابچے میں **Forbidden City** لکھا دیکھا تو بہت حیران ہوئے تھے۔ ہمارے ایک ساتھی تو بہت دور کی کوڑی لائے۔انھوں نے اس انگریزی لفظ کی تعبیر قدیم بادشاہی چین میں بازارِ حسن کی موافقت میں کر ڈالی۔ پتہ نہیں اس دوست نے اس روز اچھی شرٹ پہ چمکدار ٹائی کیوں پہن رکھی تھی۔

جس طرح ہمارے برصغیر میں مغل یا پھر خاندانِ غلامہ کی بادشاہی نسل در نسل چلتی رہی ہے، بالکل اسی طرح چین میں بھی مختلف خاندانوں کی حکمرانی پشت در پشت جاری رہی۔ آخری دو خاندانوں کی بادشاہتیں اسی شہر ممنوعہ کے محلات میں قائم تھیں۔یہیں ان کے دفاتر اور دربار تھے اور یہیں انکی رہائش تھی۔ یہ شہر گویا چین کی قدیم سلطنت کی شان وشوکت کا مجموعہ ہے۔روایتی چینی طرزِ تعمیر کا چمکتا دمکتا جوہر،اور انسانی تاریخ وثقافت کا عہد نامہ۔عوام اسے چینی زبان میں ''مرکزی بادشاہت'' کہتے ہیں۔

تانگ عہد کے ایک شاعر کا قول ہے کہ شاہی محلات کی عظمت دیکھے بغیر آپ کسی بادشاہ کی عظمت کبھی نہ جان سکیں گے۔مگر مجھے تو اپنے استاد نے یہ بتلا رکھا تھا کہ دنیا میں ہر شاہی عجوبے کی طرح اس ''شہرِ ممنوعہ'' کو بھی اس کی پوری متشددانہ عیاری اور بھرپور فیوڈل پس منظر کے ساتھ دیکھنا چاہیے۔

شہر ممنوعہ ایک مستطیل شہر ہے۔اس کے گرد 52 میٹر چوڑی اور چھ میٹر گہری حفاظتی خندق بنی ہوئی ہے۔جی ہاں حفاظتی خندق۔حفاظت کس سے؟ لوگوں سے،عوام سے،خلق خدا سے۔بادشاہ سلامت کو عوام سے بچانے کے لئے دوسرا حفاظتی حصار وہ فصیل ہے جو شہر کے گرد کھڑی کر دی گئی تھی۔اس کی لمبائی ساڑھے تین ہزار گز بنتی ہے۔اس فصیل کے چاروں کونوں پر مضبوط،نمایاں اور خوبصورت مینار ہیں جہاں سے محلات کو باہر سے عوام کے ''شر'' سے بھی بچایا جا سکتا تھا،اور ''ممنوعہ شہر'' کے اندر کی نگرانی بھی کی جاتی تھی۔اس دوہرے اقدام کے علاوہ ان فصیلوں کے دامن میں ایک حفاظتی نہر بھی ہے۔۔۔۔جس میں آج کا عام آدمی مچھلیاں پکڑ رہا تھا۔''ممنوعہ'' کا انجام!!۔ بالآخر ساری حاکمی فصیلوں کے گرد قائم حفاظتی

نہروں میں عام شہریوں کو مچھلیاں ہی پکڑنی ہیں۔آج نہیں تو کل،کل نہیں تو پرسوں۔

شہر ممنوعہ کو ''امپیریل پیلس'' بھی کہا جاتا ہے۔یہ شہر بیجنگ کے وسط میں واقع ہے ۔یہ دنیا کے سب سے زیادہ قدیم محلات پر مشتمل ہے۔دنیا کے دیگر قدیم محلات کی بہ نسبت اس کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ان سب سے زیادہ وسیع محل ہے۔یہ کل بارہ ہزار مربع میٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔اس شہر کے محلات،درباروں،مہمان خانوں،شاہی نوادرات، تفریح گاہوں،تالابوں،نہروں اور ان نہروں پہ بنے پلوں والے اس عجوبہءِ زمانہ کو اقوام متحدہ نے **1987** میں عالمی ثقافتی ورثہ قرار دیا ہے۔

ہم جب مین گیٹ سے داخل ہوئے تو خود کو ایوب اسٹیڈیم کوئٹہ سے بھی بڑے احاطے میں پایا۔یہ انسانوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔کہیں پہ کسی سکول کے بچے اپنے ٹیچروں کے ساتھ یونیفارم میں ملبوس،ہاتھوں میں چھوٹے چھوٹے جھنڈے لئے قطار میں کھڑے ہو ئے تھے،کہیں یورپی سیاحوں کا کوئی جتھہ اپنی مخصوص وضع قطع اور اپنی مخصوص حرکات وسکنات میں نظر آرہا تھا۔سینکڑوں کیمرہ باز کرایہ پہ بھرتی ہونے کے لئے آس پاس منڈلاتے ملیں ،محبوبائیں اپنے دل کے مراکز، کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے باہم نگاہیں پیوست کئے زمین و آسمان سے بے تعلق کھڑی،بوڑھے اپنی لاٹھیوں،چھتریوں اور جوگروں میں کھٹ کھٹ کرتے ہوئے،یخ ہوائیں کانوں کو سرخ کرتی،مفلروں کو اونچا کروارہی،مائیں اپنے کم سن شرارتیوں کو قابو کرتیں۔اور ہم پانچ پاکستانی جو اچانک اس مجمع میں آٹپکے تھے،حیران اور گم سم کھڑے تھے۔ہمارے میزبان جنکشی یو اور ہانس مجمع میں غائب ہوئے،پھر آئے۔پھر گم ہوئے اور پھر آئے تو ٹکٹیں لے کر آئے۔اچھا؟تو یہ بادشاہی محلات،یہ ممنوعہ شہر،یہ ناقابلِ رسائی جگہ ٹکٹوں کی محتاج ہوگئی ہے۔محض ایک میوزیم ہے۔کسی نے کیا سچ کہا تھا کہ ''ہم انہیں آثار قدیمہ کے عجائب گھر میں پرانی کلہاڑیوں چاقوؤں کے ساتھ رکھیں گے''۔ارے،واہ۔دل خوش ہوا۔ ظلِ الٰہی کے محل کا ٹکٹ دیکھ کر۔اللہ کرے ہر جگہ ایسا ہو،اللہ کرے ہر روز یہی روز عطا ہو

۔(بلوچی دعا)۔

2۔اک دعا بلوچ کے لیے

وہاں ہمیں بہت اچھا گائیڈ ملا جو ابھی ابھی یونیورسٹی سے تاریخ پڑھ کر فارغ ہوا تھا ۔برطانوی لہجے کی انگریزی بولتا تھا اور بہت رٹا رٹایا بولتا تھا۔ہم نے اس کی قیادت میں مناظر بینی کا آغاز کیا۔

یہ محلات کوئی ایک دو نہیں ہیں بلکہ محل در محل،ایک پورا سلسلہ ہے،اژدھے سے لمبا اور ڈائن کے دانتوں کی طرح چبھتا ہوا سلسلہ۔ایک محل کے پیچھے دوسرا محل۔کم بخت ختم ہی نہیں ہوتے۔جس طرح کاہان تا سبی سفر کے دوران ہر پہاڑ کے پیچھے ایک اور پہاڑ نمودار ہوتا جاتا ہے۔

میرا اندازہ تھا کہ محلات کا یہ سلسلہ مشرق سے مغرب کو چلتا ہے۔میں نے یہی تبصرہ کیا،مگر نوجوان ہانس نے دل میں کہا ہوگا:''بھائی صاحب۔پہلے اپنا کھلا منہ بند کرو،ہوش اور حواس کے ناخن لو،بادشاہوں فیوڈلوں سے اپنی عمیق نفرت کو چار گھنٹے کی رخصت پر بھیجو، ٹھنڈی آکسیجن کی دو تین گہری سانسیں لو،اور اوپر آسمان کی طرف دیکھو،تمہیں معلوم جائے ہو گا کہ تمہاری ساری سمتیں خلط ملط ہو چکی ہیں''۔مگر وہ بے چارہ ترقی یافتہ کلچر کا شہری،یہ سب کچھ کہہ نہ سکا۔اس نے صرف اتنا کہا کہ ''نہیں۔شہر ممنوعہ شمالاً جنوباً بنایا گیا ہے اور تختِ شاہی عین محور میں واقع ہے!!۔۔۔۔''۔سمارٹ گائیڈ،ہانس کے فقروں کے بیچ میں کود پڑا اور ساری قصہ خوانی خود سنبھال لی۔کیا تیز جوان تھا،دل کی اتاہ گہرائی اور شوق کی فلک بوس چوٹی سے انگریزی بول رہا تھا۔صرف ہمارا ہی نہیں یہاں تو سینکڑوں گائیڈ تھے جو آنے والے گروہوں

کیلئے کرایہ پہ بولتے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی دوسرے گروہوں کے افراد ہمارے گائیڈ کی مشتاق دیکھ کر چپکے سے ہمارے گروہ میں شامل ہوتے تھے اور کبھی کبھی ہمیں کوئی ''روح کو باندی بنانے والی'' آواز کھینچ لیتی تو ہم وفاداریاں بدل کر اپنے گروہ سے وہاں کھسک جاتے ۔ ہر انسان کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی صورت ٹریڈنگ والا ہارس بن ضرور جاتا ہے۔ جو آنسال بگٹی والے ''رنگی بادشاہ'' نے رنگوں کی بارات سجادی تھی یہاں۔ آسمان، عمارات اور ہجوم سب کچھ رنگین، کل جہاں شوخ۔ مگر کس کافر کو لباسوں کی رنگینی دیکھنے کی فرصت تھی۔ یہاں تو اعضا کی رنگینی، چہروں بالوں، آنکھوں کی رنگت ہی عقل کو دنگ کیے دیتی تھیں۔۔۔۔۔، ہم نے بھی کوئی کنجوسی سستی نہیں دکھائی۔ حسینوں کے محلّے سے یا تو ''عزتِ سادات'' ہی ہمیں واپس دھکیل لاتی یا پھر یوسفی صاحب کا ہماری ''نوجوانی'' پہ چست کیا ہوا کوئی زبردست فقرہ ہماری مہار کھینچ ڈالتا۔ یوسفی کے فقرے اس قدر چٹ پٹے ہوتے کہ دوبارہ جوان ہونے کو دل کرتا۔ میں یا تو کسی بہت ہی دلکش آدم زاد کی قربت کیلئے اپنی ڈار سے جدا ہو جاتا، یا پھر محض یوسفی کا ایک اچھا فقرہ سننے کسی قریبی انجمنِ ماہ جبیناں میں جا وارد ہوتا۔ میں سوچتا ہوں کہ یہ شخص خود اپنی جوانی میں یورپ کے اندر نظریہِ پاکستان کی کیا کیا خلاف ورزیاں کر چکا ہوگا۔ ایسے ''نوجوان دل'' والے کی لیڈری ملتی تو ہم تو بہت کم عرصہ اور کم نقصان اٹھائے عوامی انقلاب لا چکے ہوتے۔ مگر کیا کریں وہ عوام کی لیڈری کرنے کی بجائے ''آبِ گم'' میں گم رہے تھے۔ ساری زندگی ستارہ امتیاز، ہلال امتیاز، ہجرہ ایوارڈ، آدم جی ایوارڈ اور کمال فن ایوارڈ جیتتے رہے۔ لوگ کس طرح اپنی گوشہ گیری کی عصمت بچا پاتے ہیں۔ پانچ لاکھ روپے کمال فن کے ایدھی ویلفیر اور شوکت خانم ہسپتال کو عطیہ کر ڈالے۔ اور کسی طرح بھی اس کی کوئی تشہیر نہ کی۔ ہمارا لیڈر زندہ باد، ہمارا یوسفی زندہ باد۔

لیکن ایک دعا بلوچ کے لئے بھی!! اے سبز آسمانوں میں رہنے والے مرے رب! مجھ سے اگلی نسل کے بلوچ نوجوان کو کم از کم یہ آزادی تو نصیب کر، کہ وہ جب شاہی محلات گھومنے آئے تو دوسرے گروہوں میں گھس بیٹھیا بننے کی بجائے خود اپنے بلوچ وطن کی، اپنی جوڑی دار کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، آسکے۔

3۔ کیا کروں، روؤں، ہنسوں رقص کروں یا ماتم

یہ محلات بے شمار سرخ دیواروں پر مشتمل ہیں جن کی چھتوں پہ شیشے جیسی چمکتی ہوئی ٹائلیں لگی ہیں۔ ان کے ہاں سرخ رنگ خوشی اور خوشحالی کی علامت ہوتی ہے اور پیلا رنگ بادشاہی کا نشان۔ چھتوں کی چکنی ٹائلیں زرد رنگ کی، بادشاہ کی پالکی زرد رنگ کی، اسکی کرسیوں کی گدیوں کا رنگ زرد تھا، اسکی ٹوپیوں اور ملبوسات کا رنگ زرد، اس کا پٹکا زرد رنگ کا، کھانے پینے کے برتن، غلاف، کتابیں لپیٹنے کا کپڑا، کھڑکیوں کے پردے، اسکے گھوڑے کی لگام، الغرض ہر چیز زرد تھی۔

اس محل میں کل 9999.5 کمرے ہیں۔ جہاں وحشی سازشوں اور اقتدار کی کشمکش کی لا تعداد کہانیاں دفن ہیں۔ جن کے کردار بادشاہ ہیں، وزیر ہیں، جرنیل ہیں، خواجہ سرا ہیں، ملکائیں ہیں اور داشتائیں ہیں۔ کسی بھی ملک کے شاہی محل کی کہانی میں جھانک کر دیکھیے آپ کو سازشوں، جنسی بے راہ رویوں، عہد شکنیوں، نارو ائیوں کی داستانوں کی بھر مار ملے گی۔ دارالحکومت بیجنگ شہر میں کیسے قائم ہوا، یہ بھی سازشوں، بغاوتوں کے نتیجے میں عمل میں آیا۔ منگ سلطنت کے بانی ژو یوآن ژانگ نے ''نان جنگ'' نامی علاقے کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ اپنے بیٹے ژودائی کو شہزادہ کا خطاب دیا اور اسے بی پنگ گورنری میں رہنے کے لئے بھیج دیا۔ بادشاہ جب اللہ کو پیارا ہوا تو اس کا پوتا ین وین بادشاہ بنا۔ جون 1402 میں ژودائی نے خود اپنے بھتیجے کے خلاف بغاوت

فرمائی، اس سے تخت اچک لیا اور خود بادشاہ بن بیٹھا۔ 1403 کے اوائل میں اس نے بی پنگ گورنری کو بیجنگ شہر میں ڈھال دیا۔ اب مسئلہ یہ تھا کہ اس شہر کو بڑا کیسے بنایا جائے!۔ اس شیر کے بچے نے ہزاروں لوگوں کو شانکسی، نان جنگ اور ژی جنا نگ سے ڈنڈے کے زور سے یہاں ہانک دیا۔ 1406 میں وہ خود بیجنگ تشریف لائے تا کہ خود امپیریل پیلس کی تعمیر کی نگرانی فرمائیں۔ یہ تعمیر 1413 میں مکمل ہوئی۔ مگر اللہ کی قدرت کہ اس مکمل شدہ محل کو پہلے آگ لگ گئی اور پھر زلزلہ آیا۔ پورا محل زمیں بوس ہو گیا۔ مگر کسان کی ماں، اس کا باپ، وہ خود اور اس کی بیوی بچے کب تک خیر مناتے۔ چنانچہ شاہی استبداد کے تحت پھر 1416 میں اس کی تعمیر شروع کر دی گئی اور 1420 میں یہ محل مکمل ہوا۔ اور اس طرح 1421 میں ژو دائی نے اپنا دربار باقاعدہ بیجنگ میں منتقل کر دیا۔

اس خاندان کا پہلا بادشاہ اپنے وزیر اعظم کی سازش کے ہاتھوں مرتے مرتے بچا تھا۔ اس نے جب یہ سازش پکڑ لی تو نہ صرف وزیر اعظم کا سر قلم کر دیا بلکہ اس کے پورے خاندان کو تہہ تیغ کر ڈالا۔ اس نے ہر شخص کو قتل کر دیا جس پہ اس سازش میں ملوث ہونے کا ذرا سا بھی شائبہ تھا۔ اس نے اس کیس میں چالیس ہزار انسان قتل کر دیے۔ (اور یہ تعداد املا کی غلطی نہیں ہے)۔

طوطا جیسا ہمارا گائیڈ بول رہا تھا: ''تخت کا عین محور میں واقع ہونا بہت پر معنی بات ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ بادشاہ کائنات کا مرکز ہے۔ چین کے سارے بادشاہ خود کو ''آسمان کا بیٹا'' سمجھتے تھے۔ اللہ کا سایہ نما کوئی چیز۔ کوئی ظلِ الٰہی جیسا وجود۔ رضا شاہ پہلوی نے ایک انٹرویو میں اوریانا فلاسی کو بتایا تھا کہ ایک بار وہ پہاڑ پہ گھوڑی سے گر پڑا اور دور نیچے ایک کھائی پر جا گرا مگر اسے کوئی چوٹ نہ آئی اس لئے کہ اس نے دیکھا کہ اس کے اور سنگلاخ زمین کے درمیان ایک اور شخص لیٹا ہوا تھا۔ اور وہ حضرت علی تھے۔ رضا شاہ اس جھوٹ سے خود کو دھوکے دیتا رہا۔ مگر جب عوام نے اس کا تختہ الٹ دیا تو علی علی کہہ کر ہی ایسا کیا تھا۔

ساری دنیا کے بادشاہ اسی طرح کسی عوامی روحانی مقدس ہستی کو اپنا گارڈ بنائے رکھتے تھے۔ اب اگر ان محلات کے مغرور و متکبر مکینوں نے خدا کا بیٹا ہونے کا دعویٰ کر دیا تو کیا بعید القیاس کام کیا!!۔

4۔ یہ عمارات و مقابر، یہ فصیلیں، یہ حصار

عرش کے یہ بیٹے فرشی غریب انسانوں سے کیا واسطہ رکھتے؟ وہ ان کے نجس و ناپاک قدموں اور ارادوں سے اپنے محلات کو بہت دور رکھتے تھے اور اسی لیے انہیں ''شہرِ ممنوعہ'' قرار دیتے تھے۔ صرف چین ہی کیوں؟ ہر عہد اور ہر جگہ حاکم کا محل و دفتر عام انسان کے لئے شہرِ ممنوعہ ہی تو رہے ہیں۔ بلوچستان کا ''گورنر ہاؤس'' شہر ممنوعہ ہی تو ہے کہ وہاں عام کرم خان اور جمعہ خان نہیں جا سکتے۔ کیا لٹن روڈ کوئٹہ پہ واقع وزیر اعلیٰ سیکرٹریٹ ''شہرِ ممنوعہ'' نہیں؟ کیا کور کمانڈر کا بنگلہ (اڑے بنگلہ نہیں، محل کہو۔) No Thoroughfare نہیں ہے؟ قرۃ العین طاہرہ! میں تمہاری بزرگ ہستی سے مخاطب ہو کر تمہارے ہی فارسی الفاظ دوہرا رہا ہوں کہ یہی گورنر ہاؤسز، یہی وزرائے اعلیٰ سیکرٹریٹ، یہی ایوانِ صدر و وزیر اعظم، اگر دو دو روپے ٹکٹ لگا کر تماشا گاہ نہ بنا دیئے گئے تو:

۔۔۔۔مرا سزا

(قرۃ العین طاہرہ)

پندرھویں صدی کے بے ٹیکنالوجی والے پسماندہ سماج میں ایسے شاندار محلات کی تعمیر مذاق کی بات تھوڑی تھی؟ 9999.5 کمروں پر مشتمل اس شاہی کمپلیکس کی ساری تعمیر

غیر مشینی، نہتے ہاتھوں سے ہوئی۔ کہتے ہیں کہ اس پروجیکٹ پہ ایک لاکھ صناع اور دس لاکھ مزدور جھونک دیئے گئے تھے(1)۔ دور دراز واقع صوبوں، سی چوآن۔ گوئی ژو، گوناگ سی، ہونان اور یوں نان کے گھنے جنگلات سے بڑے بڑے درخت کاٹ کر پانی میں بہا کر بیجنگ تک لائے گئے تھے۔ سفید مرمر فانگ شان سے حاصل کیا گیا، رنگدار پتھر اور گرینائیٹ ہبئی صوبہ سے منگوائے گئے۔ محلات کی دیواروں کی لئے اینٹیں شینڈ ونگ صوبے سے لائی گئیں اور فرشی مربع اینٹیں جیانگ سو صوبے سے۔ یہ ایسی ویسی بھٹے والی اینٹیں نہ تھیں۔ بلکہ اس قدر خوبصورت تھیں کہ ''سنہری اینٹیں'' کہلاتی تھیں۔ آخر ظلِ سبحانی، شہنشاہ چین اور آسمانوں کے بیٹے کے محلات بن رہے تھے کسی نبی بخش، نبو کی جھونپڑی نہیں!!۔ تلخ ترین سردی میں بیجنگ کی طرف جانے والی سڑکوں پہ پانی گرادیا جاتا تھا تا کہ یہ جم کر برف بن جائے اور اس برف کے اوپر پھسلنے والی گاڑی پر عمارتی پتھر کی بڑی بڑی چٹانیں کھینچ کر لائی جاتیں۔ اس مقصد کے لئے پورے راستے پر ہر 500 میٹر کے فاصلے پر کنویں کھودے گئے۔ اور انھیں کھودنے والے؟ وہ مرضی سے آئے تھے یا بہ زور لائے گئے تھے؟ وہ معاوضہ والے تھے یا محض بیگاری؟ چھوڑیئے قارئین! اس بحث سے سوشلزم کی بو آتی ہے۔

یہاں ہم نے چلتے چلتے میں ایک دلچسپ بات نوٹ کی۔ انسانوں کے شوق بھی عجیب ہوتے ہیں۔ مثلاً ہم نے دیکھا کہ ڈنمارک والے سیاحوں کے گروہ میں ایک بوڑھا شخص تصویر کھچوانے کا بہت ہی زیادہ دلدادہ تھا۔ اور وہ بھی ون مین فوٹو گراف۔ نظارے جائیں جہنم میں، مناظر جائیں بھاڑ میں، ہمسفر جائیں کھڈے میں۔ وہ ہر جگہ کسی راہ گیر کے سامنے جھک جاتا اور اس سے اپنی تصویر کھینچنے کی درخواست کر ڈالتا، وہ اسے اپنا کیمرہ تھما دیتا اور خود آئی ایم ایف کے بھک منگے قرضداروں کی طرح منہ ٹیڑھا کر کے آڑھا ترچھا کھڑا ہو کر پوز بنا لیتا۔۔۔۔۔۔۔۔

واضح رہے کہ گزشتہ تیس برس کے دوران انگریزی زبان چین میں کامیابی، ترقی اور روزگار کی کنجی سمجھی جانے لگی ہے۔ ہمارے گائیڈ کو بھی انگریزی بولنے اور بولتے چلے جانے کا شوق تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ شہرِ ممنوعہ دو حصوں پر مشتمل ہے: بیرونی محلات اور اندرونی محلات۔

بیرونی محل میں ''سرکاری'' امور بھگتائے جاتے تھے۔ بادشاہ کا دربار سجتا تھا، باادب باملاحظہ کے احکامات پیٹے جاتے تھے، وزیر و مشیر و کھڑ پے چمچے اور اسی قبیل کے بے شناخت چہرے، دفاتر کو چہچک زدہ کر دیتے تھے۔ بیرونی محلات میں موجود کروفر والے بنگلوں کے صرف نام ہی سن لیجئے: ،آسمانی امن کا گیٹ (تیاناں من)، اوجِ کمال کا گیٹ، سپریم ہارمنی ہال، مرکزی ہارمنی ہال، دائمی ہارمنی ہال۔ اور ان سب کے مشرق میں ہے''ادبی پھولوں کا ہال''۔ ان کے مغرب میں ہے''فوجی قوت کا ہال''۔

اندرونی محلات شاہی گھرانے کی رہائش گاہیں ہیں۔ اور شاہی گھرانے کا مطلب ہے، بادشاہ اور شہزادے اور ان کی ملکائیں اور ہزاروں داشتائیں۔ ان محلات کے نام بھی سنتے جایئے: ''آسمانی پاکیزگی کا محل''۔ ''بہشتی اور زمینی یونین ہال''، "ارضی سکون کا محل''، نفاست و شائستگی جمع کرنے کا محل، ''نمایاں ہارمنی محل''، ''پاکدامن خواتین محل، ''دائمی موسم بہار محل''، "سپریم تکمیل محل"، اور "دماغی زرخیزی محل''۔ سب پڑھو لاحول ولا۔۔۔۔

ارے ابھی کہاں چلدیے۔ ان محلات کا نام پڑھے بغیر میں آپ کو جانے نہ دونگا۔ آپ کو نہ تو ان میں رہنا ہے نہ انہیں دیکھنا ہے، نہ ان کے اندر کے مکینوں کی جاہ وحشمت بھگتنا ہے، نہ ان کی تعمیر پہ لاگت کا حساب لگانا ہے اور نہ ہی ان کوڑوں کو شمار کرنا ہے جو بیگار کرنے والی رعایا کی پیٹھ پر پڑتے تھے اور نہ ہی ان اموات کی فہرست بنانی ہے جو اس جاں گسل مشقت سے ہوتی رہی تھیں۔ بس نام ہی تو پڑھنے ہیں، پڑھیے: ''عظیم فیض رساں محل''، بہشتی مہربانی کا محل''، کامل صفت کا محل''، عظیم آب و تاب کا محل''، مسرت کا نقیب محل''۔۔۔۔۔۔ اور پرہیزگاری محل۔

پلیز، بس دو چار محل ہی اور بتانے ہیں آپ کو۔ تفصیلات نہیں۔ بس ان کے نام سنتے جایئے۔ اور نام کے پیچھے ان کا شان سوچیئے تا کہ آپ کو پتہ چلے کہ کچلے ہوئے عوام کے لیے کمیونسٹ کیوں اور کس طرح نجات دھندہ ہوا کرتے ہیں۔ اور عوامی انقلاب کیوں آتے ہیں۔ یہ محلات ہیں: ''آبائی عبادت محل، نوا اژدھوں کا پردہ''، ''شاہی عظمت محل''، پرسکون طویل عمری کا محل''، مسرور نغمہ ہائے شیریں کا خوش نما محل''، ''مسرت آمیز طویل عمری کا محل''۔ انا لِللہ وانا الیہ راجعون۔

اب اگلی بات سنیے۔ آپ کو قحط زدہ، پسماندہ، اور افیونی چینیوں کا ذلت بھرا ماضی سمجھ میں آجائیگا۔ نو ہزار نو سو ننانوے محلات پہ مشتمل اس عمارت میں جو چیز بطورِ سیمنٹ استعمال ہوئی وہ لیس دار چاول اور انڈے کی سفیدی سے بنائی گئی تھی۔ جی ہاں نو ہزار نو سو ننانوے کمرے انڈے کی سفیدی اور چاول کے پانی سے تعمیر کیے گئے تھے!!!۔ (بلوچوں میں روجھان میں سردار کے قلعے کے بارے میں مشہور ہے کہ وہاں سردار کا قلعہ پانی کی بجائے اونٹنی کے دودھ سے بنا ہوا ہے)۔ اسی طرح شہر ممنوعہ کے اس قدیم آرکی ٹیکچر میں لکڑی کے تمام کام میں میخیں کہیں بھی استعمال نہیں ہوئیں۔ بلکہ لکڑی کو تراش خراش کر باہم جوڑ کر پیوستگی دی گئی۔

ان محلات کی تزئین و آرائش میں کتنا سونا چاندی استعمال ہوا ہوگا، دماغ مت تھکایئے اپنا۔ ان میں کتنا فرنیچر رکھا ہوگا، آرٹ اور کرافٹ کے کیا کیا خزینے ہونگے۔۔۔ ہم آپ اس کا اندازہ تک نہیں کرسکتے۔ اور ان نو ہزار نو سو ننانوے محلات کی نگہداشت، صفائی، مرمت اور دیکھ بحال پہ کتنا خرچہ اٹھتا، اس پہ بھی غور فرمایئے۔ لیکن ان کا کیا؟ دعوے تو بادشاہ ہمیشہ حب الوطنی کے کرتا ہے۔ مگر وہی ملک وقوم کو اپنی شاہ خرچیوں سے تباہ و برباد کردیتا ہے۔

ایک روز ملا نصیرالدین نے ایک امیر آدمی سے کچھ پیسے مانگے۔

''تمہیں یہ رقم کس لیے چاہیے؟''

''ایک ہاتھی خریدنے کے لیے''۔

''اگر تمہارے پاس پیسہ نہیں ہے تو تم ہاتھی رکھو گے کیسے؟''

''میں نے پیسے مانگے''، نصیرالدین نے کہا۔ ''نصیحت نہیں''۔

مگر بادشاہ سے یہ بھی نہیں پوچھا جاسکتا۔۔۔ جس ملک کے بادشاہ کے محلات کی شان اور آن بان ایسی ہوں تو اس قوم کے عام آدمی کی غربت کی سطح کیا ہوگی؟ یہ تو واضح ہے کہ بادشاہ اور رعایا کی دولت میں تعلق معکوس ہی ہوتا ہے۔ جتنا بادشاہ کا خزانہ بھرا ہوگا اتنی ہی رعایا کی پھٹی ہوئی جیب خالی ہوگی۔ اندازہ کیجیے کہ عظیم چینی عوام نے اپنا سفر کن پستیوں سے شروع کردیا تھا۔

یہ اچھا ہے کہ چینی قوم کسی منظّم مذہب کی پیروکار نہیں وگرنہ وہ بھی لاہوریوں کی طرح ہر جابر شاہجہاں اور شاطر اکبر بادشاہ کے سارے محلات کو ''اسلامی فنِ تعمیر'' قرار دیتے۔ ہمیں رجعتی افغانوں کی پڑوسی گیری مار گئی، ہمیں رجعتی لاہوریوں کی رعایا پن مار گئی۔ اپنی قسمت پہ کوڑے برساتے ہوئے آیئے بادشاہوں کے ''کرتوت'' دیکھتے ہیں:

5۔ بادشاہ آتا تو لوگ سجدے میں گر پڑتے

شہرِ ممنوعہ میں چار داخلہ گاہیں ہیں۔ ان میں سب سے شاندار گیٹ ''اوجِ کمال گیٹ'' ہے۔ اس کی سرخ دیوار تیرہ میٹر بلند ہے۔ اس کے مرکزی حصے میں ایک وسیع پلیٹ فارم ہے جس پر ایک تخت رکھا ہوا ہے۔ تخت کے ساتھ ایک ڈھول مینار بنا ہوا ہے جس پر بڑا ڈھول رکھا ہوا ہے، اور ایک گھنٹہ مینار ہے جس پر بہت بڑا گھنٹہ موجود ہے۔ جب بادشاہ سلامت شہر کے باہر قربان گاہوں پہ قربانی کی رسومات ادا کرنے تشریف لے جاتے تو گھنٹہ بجایا جاتا تھا اور جب وہ شاہی مندر کو پدھارتے تو یہ ڈھول پیٹا جاتا۔ اور جس وقت کوئی اہم شاہی تقریب منعقد ہو رہی ہوتی تو ڈھول اور گھنٹہ دونوں بجائے جاتے۔ کہتے ہیں کہ ان کی

آواز پانچ کلومیٹر تک سنائی دیتی تھی۔

جب کوئی جرنیل جنگ سے فتح یاب لوٹتا تو بادشاہ سلامت اس فتح کا جشن یہیں پر مناتے۔اور یہیں، اسی گیٹ پر ان افسروں کی پشت پہ کوڑے بھی برسائے جاتے جو شہنشاہ کو خفا کرنے کا مرتکب ہوتے۔مِنگ سلطانوں کے دور میں بادشاہ جیا جنگ، دریائے یانگسی کی وادی میں جانا چاہتے تھے تاکہ وہاں سے خوبصورت ترین لڑکیوں کو اپنی داشتائیں بنانے کے لئے منتخب کرلیں۔کچھ افسروں نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی۔بادشاہ سلامت ان پہ خفا ہو گئے اور 134 افسروں کو کوڑے مارنے کا شاہی حکم جاری فرمادیا۔ان کے ہاتھ باندھ کر انہیں بوری پہ لٹایا گیا۔سو، گارڈ لائن میں کھڑے ہوگئے۔ ہر گارڈ پانچ پانچ کوڑے مارتا۔ پھر دوسرے کی باری ہوتی۔ ان 134 افسروں میں سے سترہ تو مار مار کر مار دیئے گئے تھے۔(2)۔بادشاہ دربار میں آجاتا تو وزراء، درباری اور افسر سجدے میں چلے جاتے۔

عمومی رواج یہ تھا کہ لوگ اپنی چھتوں کے کناروں پر تین، پانچ، سات یا نو کی طاق تعداد میں مقدس جانوروں کی علامتیں لگا دیتے مگر بادشاہ کے دربار پر اس فارمولے کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔لفظ ''استثنٰی'' ہی تو بادشاہ ہونے کی علامت ہوتا ہے۔چنانچہ دربار یعنی سپریم ہارمنی محل کی چھت پر طاق کی بجائے جفت جانور لگے ہوتے تھے جن میں لافانی اژدھا، عنقا، شیر، سمندری گھوڑا، آسمانی جنگی گھوڑا، یا ''Suanni'' نامی مچھلی، Xiezhi ، غوطہ خور بیل اور Xingshi شامل تھے۔یہ سب کے سب خیالی جانور ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ ظلِ سبحانی صاحب، زمان و مکان سب پر قادرِ مطلق ہیں۔پھر یہاں پہ ایک کانسی کا کچھوا ہے اور ایک سارس ہے۔یہ دونوں طویل عمری کی علامتیں ہیں۔یعنی شاہی اقتدار کی طویل زندگانی۔(ضیا کا مولوی، بے نظیر کا ڈنڈا پیر، اور نواز شریف کا گولڑہ شریف، شوکت عزیز کا پگاڑہ!!)۔

بادشاہ سائیں کا تخت سات زینوں کے بلند پلیٹ فارم پر ہے۔یہ تخت ایک وسیع کرسی ہے جس سے سونے کا بنا ہوا واسنگ ناگ (اژدھا) لپٹا ہوا ہے۔اس تخت کے دونوں طرف سونے کے Luduan ہیں۔یہ چار پیروں والا خیالی درندہ ہے جس کے سر پہ ایک سینگ ہے۔عقیدہ یہ تھا کہ یہ ایک دن میں نو ہزار کلومیٹر کا فاصلہ طے کرسکتا ہے اور دنیا کی ساری زبانیں جانتا ہے۔واضح رہے کہ یہ سارے انتظامات توہمات بھری ایک ایسی رعایا کو قابو میں رکھنے کے لئے کئے گئے تھے جو ضعیف الاعتقاد کسانوں پر مشتمل تھی۔چنانچہ یہ آبادی روحانی وجسمانی طاقت سے بھرپور ان سارے دیوتاؤں کے مالک بادشاہ کے خلاف اپنے دل میں بھی برے خیالات نہیں لاسکتی تھی۔حکمران، رعیت کو سدھانے اور زندگی بھر تابع دار رکھنے کے کیا کیا انتظامات کرتے رہے ہیں!!۔تخت کے دونوں طرف تین دیوہیکل ستون ہیں جن کے گرد سونے کے اژدھے لپٹے ہیں۔مغربی اژدھے مشرق کی طرف دیکھ رہے ہیں اور مشرقی اژدھے مغرب کی طرف۔یعنی دربار کا کونا کونا چوکیداری کی زد میں ہے۔یہ اژدھے گویا دربار میں موجود لوگوں کی حرکات وسکنات نوٹ کررہے ہوتے۔یہ تو تھے بادشاہ کے کرامت بھرے آسمانی جاسوس!!اس کے جسمانی سی آئی اے یا آئی ایس آئی والے الگ تھے۔بادشاہ اور بادشاہی کی نگہبانی کرنے والے ان اژدھوں کی تعداد صرف اس ہال میں تیرہ ہزار آٹھ سو چوالیس ہے۔اتنے کیمرے تو دنیا کے مالک امریکہ کے پنٹا گان میں بھی نہ لگے ہونگے۔

ان محلات ہی میں ایک جگہ ہمیں خوشنما سنگ مرمر کی ایک دیوہیکل چٹان نظر آئی۔جس پر بادلوں کے بیچ شوخی اور زندگی سے بھرپور اچھلتے تیرتے 9 اژدھے کندہ ہیں۔جو کہ موتیوں کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔اس کا نام ''بادلوں پہ اژدھا'' کی چٹان ہے۔یہ 16.57 میٹر لمبا اور 3.07 میٹر چوڑا پتھر ہے۔اس کا وزن دو سو پچاس ٹن ہے(3)۔یہ بہت دور سے لایا گیا ہے۔تاریخی ریکارڈ کے مطابق یخ بستہ سرما میں ہر پچاس میٹر کے فاصلے پر کنوئیں کھودے گئے تھے اور ٹھٹھرتے ہوئے کسان 50 کلومیٹر

طویل راستے پر ان کنوؤں سے پانی چھینکتے جاتے۔ جب یہ پانی جم کر سخت ہو جاتا تو اس چٹان کو اس پر سے پھسلایا جاتا۔ اسے بیجنگ تک بیس ہزار افراد، ایک ہزار گھوڑے اور خچروں کی مدد سے دھکیلا اور کھینچا اور پھسلایا گیا۔ اسے ''شہرِ ممنوعہ'' تک پہنچنے میں 28 دن لگے تھے (4)۔ سینکڑوں مزدور اس پتھر کو گھسیٹتے ہوئے مرے بھی ہونگے۔ بادشاہ، چین، عظمت، ہونہہ!!۔ اور اس پہ طرہ یہ کہ اگر انہی بے چارے عوام کے بیٹے پوتے اس مقدس پتھر کو چھوتے نظر آ جاتے تو انہیں موت کی سزا دی جاتی تھی۔

6۔ بادشاہ کی رکھیلیں، داشتائیں، خواجہ سرا

رہائشی علاقہ کے مین داخلہ پر واقع ''آسمانی پاکیزگی کا گیٹ'' عام حالات میں بھی حفاظتی اقدامات سے اٹا پڑا تھا۔ مگر جب بادشاہ سلامت دربار منعقد کرتے تو پھر تو یہ پوری چھاؤنی لگتا۔

مگر یہ سماجی قانون ہے کہ عوام بادشاہ کے خلاف بغاوت تو کرتے ہی رہیں گے، خواہ آپ کتنی ہی سختی کیوں نہ کریں۔ کہتے ہیں کہ 1813 میں بیجنگ کے قریب و جوار کے کسانوں نے بغاوت کر دی۔ محل کے کچھ خواجہ سراؤں نے بھی ان کی مدد کی اور انہوں نے شاہی محلات پہ دھاوا بول دیا۔ انھوں نے رات کے اندھیرے میں دو اطراف سے محل میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ اچھے خاصوں پہ قابو پالیا مگر بالآخر ان کی بغاوت کچل دی گئی۔

یہ خواجہ سرا ایک عجیب لفظ ہے۔ آیئے دیکھتے ہیں کہ ان کا وجہ تسمیہ، شان نزول اور وظیفہ وفرائض کیا تھے۔۔۔ جیسا کہ ذکر ہوا، بادشاہ کے پاس بہت ساری بیویاں ہوا کرتی تھیں ۔ بے شمار داشتائیں تھیں۔ حسین نوکرانیاں تھیں۔ وہ اپنے اس پورے زنان خانے کو اپنی ملکیت میں رکھتا تھا۔ اس پورے ریوڑ کو جسے وہ اپنی جنسی بھوک مٹانے کے لئے قیدی رکھتا تھا، حرم کہتے ہیں۔ وہ ان سب کو بہت حفاظت سے رکھتا تھا۔

بادشاہ ان نوجوان حسیناؤں کی اپنی انسانی جنسی خواہشات سے خوفزدہ بھی بہت ہوتا تھا۔ کامن سینس کی بات ہے کہ جب سینکڑوں ہزاروں عورتوں کو ایک ہی شخص یعنی بادشاہ کی جنسی تسکین کیلئے رکھا جاتا تھا تو ہر ایک عورت کی باری کب آتی ہوگی۔ غالباً سال بعد، دو سال بعد۔ تو پھر وہ عورت اپنی جنسی ضرورت کہاں پوری کرتی۔ اسی لئے بادشاہ مرد ذات کو قریب بھی پھٹکنے نہیں دیتا تھا۔ وہ ظالم کرتا یہ تھا کہ چھوٹے چھوٹے نر بچے زور زبردستی، شاہی حکم کے ذریعے گاؤں سے اٹھوا کر محل میں لاتا۔۔ پھر ان کے خصیے کچل کر انہیں خصّی کروا دیتا۔ یہی نامرد کردہ انسان اس کا گھر چلاتے تھے، اس کی بیویوں کی خدمت کرتے تھے، داشتاؤں اور ان کے بچوں کے نخرے اٹھاتے۔ یہ بدقسمت لوگ کوئی جنسی کارروائی نہیں کر سکتے تھے۔ بس ہر کارے ہوتے۔ شہزادوں کی باہمی چپقلشوں میں استعمال ہوتے، سازشوں، قتل اور جاسوسیوں میں ملوث ہوتے، اندرونی راز باہم دشمن شہزادوں، ملکاؤں کو پہنچاتے، ان کا دستِ راست بن جاتے، وزیروں اور اعلیٰ افسروں تک رسائی رکھتے۔ اس طرح دربار اور درباری سازشوں میں حصہ لیتے۔ یہ خصّی کردہ انسان انسانی تولیدی صلاحیت سے محروم ''بادشاہ گر'' کے بطور خوب خوب طاقت حاصل کرتے رہے۔

''آسمانی پاکیزگی محل'' میں نو بیڈ روم تھے۔ سردیوں میں ان سب خوابگاہوں کو فرش کے نیچے ہیٹنگ پائپوں کے ذریعے گرم رکھا جاتا تھا۔ ہر کمرے میں تین بستر ہوتے تھے۔ اس طرح کل 27 بستر بنتے ہیں۔ بادشاہ کے قریب ترین خواجہ سرا کے سوا کسی کو معلوم نہ ہوتا کہ بادشاہ آج کس بستر پر سوئے گا۔ مگر ان تمام احتیاطی تدابیر کے باوجود آسمانی پاکیزگی محل اس کے لئے پرامن جگہ نہ تھی۔ ایک دفعہ یانگ جیانگ کی قیادت میں محل کی سولہ نوکرانیوں نے بادشاہ جیانگ کو قتل کرنے کی کوشش کی۔ یہ واقعہ ''رے نین بغاوت'' کے نام سے مشہور ہے۔

اس کے علاوہ بھی کئی بار بادشاہ کو اس محل میں سوتے وقت مار ڈالنے کی کوششیں ہوتی رہیں۔

1644 میں لی زی چنگ اور اس کے کسان فوجیوں نے بیجنگ پر حملہ کر دیا۔ بادشاہ نے صورتحال پر مشورے کیلئے اپنے وزیر "آسمانی پاکیزگی محل" میں بلوائے۔ اس رات جب کسان افواج کی طرف سے شہر پہ حملے کی آوازیں سنی گئیں تو بادشاہ نے ہیجڑے کا بھیس بدلا اور ایک گھوڑے پر سوار ہو کر شہر ممنوعہ سے دور اپنے ایک بڑے افسر کے بنگلے کی طرف بھاگ گیا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ وزیروں کو ہنگامی میٹنگ کی اطلاع دینے کیلئے محل کے ڈھول نقارے اور گھنٹیاں بجائیں۔ مگر اس نازک گھڑی میں ایک وزیر بھی گھر سے نہ نکلا۔ بادشاہ اپنے پسندیدہ ہیجڑے کے ساتھ "کوئلہ پہاڑ" پہ گیا اور وہاں پھندا ڈال کر خودکشی کر لی۔ اس کے ہیجڑے نے بھی خودکشی کر لی۔ اس طرح منگ عہد سلطانی اختتام پذیر ہوا جس کی جگہ پھر چنگ عہد سلطانی نے لے لی۔

جس رات بادشاہ ملکہ کے ساتھ نہ سوتا تو وہ منتظر داشتاؤں میں سے کسی کا نام لیکر عشرت کدے میں طلب کرتا۔ (5)

7۔ دربار عشق کی زیارت

ان سارے محلات کے پیچھے شاہی باغ بنایا گیا تھا تاکہ بادشاہ، ملکہ، شہزادوں، شاہزادیوں اور شاہی داشتاؤں کی تفریح ہو سکے۔ یہ گویا چینی بادشاہ کی خلوت گاہ تھی۔ مگر کیا کبھی بادشاہ کو بھی خلوت نصیب ہوئی؟۔ اس کے گرد چوبیس گھنٹے باڈی گارڈ منڈلاتے ہیں۔ فکری بھی، طبعی بھی۔ چمچے، چاپلوس۔ غم، تفکر، سازشیں۔۔۔ حیف ہے ان کی زندگی پر۔

یہ شاہی باغ بارہ ہزار مربع میٹر پر پھیلا ہوا ہے۔ باغ کی ڈیزائننگ اس طرح ہوئی ہے کہ سیر کرنے والے کو ہر موڑ پر ایک نئی حیرت اور نئی دلکشی نظر آ جائے۔ یہ باغ قدیم صنوبر اور سرو کے درختوں سے مزین ہے، نوع بہ نوع پھولوں سے رنگین ہے۔ اس میں عجیب ہیئت کی بنائی ہوئی مصنوعی چٹانیں بہت حسین ہیں۔ مثلاً "شاندار پہاڑی" 14 میٹر بلند ایک چٹانی تعمیر ہے۔ اس کے سامنے پتھر سے بنے دو واسنگ ناگ یعنی اژدھے کے سر ہیں جن کے منہ سے پانی، دھار کی صورت نکلتا ہے اور یہ دھار دس گز تک فضا میں جاتی ہے اور سورج کی روشنی میں قطرے بن بن کر قوس قزح کے رنگ بکھیرتی ہے۔ اس چٹان کی چوٹی تک ایک بل کھاتا ہوا راستہ جاتا ہے۔ چین کے مشہور جشن، ڈبل نائن (نویں قمری ماہ کی نویں رات) کے جشن پہ بادشاہ سلامت اپنی ملکہ یا اپنی محبوب ترین داشتہ کے ساتھ اسی راستے سے چٹان پر چڑھتا اور پورے علاقے کا نظارہ کرتا تھا۔

471 سے لیکر 221 قبل مسیح تک کے زمانے میں کانگ نامی ایک بادشاہ کی نیت ہان پنگ کی خوبصورت بیوی پر بد ہو گئی اور وہ اسے حاصل کرنے کی تدابیر کرنے لگا۔ ہائے چین کا یہ چاکر اعظم!!۔ اس نے ہان پنگ کو قلعہ بندی کیلئے دور دراز بھیج دیا تاکہ وہ نازک شخص کہیں مر کھپ جائے۔ اور وہ اس کی بیوہ کو ہتھیا لے۔ مگر وہ شخص کام مکمل کر کے صحیح سلامت لوٹا۔ تب بادشاہ نے اسے کسی اور ذریعے سے قتل کروا دیا اور اسکی بیوی سے شادی کرنے کا کہا۔ وہ خوبصورت عورت اس شرط پہ راضی ہو گئی کہ اس کے مرحوم شوہر کو آن بان کے ساتھ دفنایا جائے۔ بادشاہ اس کی اس معمولی سی خواہش کی تکمیل پہ راضی ہوا۔ مگر تدفین کے روز وفادار محبوبہ بیوی نے اپنے محبوب خاوند کی قبر میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی۔ اس طرح دونوں کو ایک ہی قبر میں دفن کر دیا گیا۔ قدرت خدا کی، اگلے سال اس قبر میں سے دو درخت اگ آئے جن کی بالائی شاخیں آپس میں پیوست ہو گئیں۔ یہ درخت دائمی محبت کی علامتیں گردانے جاتے ہیں۔ صدیوں پرانے یہ دونوں درخت نیچے سے تقریباً ایک گز کے فاصلے پر ہیں مگر اوپر

جا کر یوں ملتے ہیں جیسے محبوب و محبوبہ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے ہوئے ہوں۔ابدی عشق کی یہ علامت آج بھی محبت کرنے والوں میں وفا اور دائمی وابستگی کی دعا گاہ بنی ہوئی ہے۔عقیدہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان دونوں تنوں کے درمیان بیٹھ کر محبوب سے وصل کی خواہش کرے تو وہ پوری ہو جاتی ہے۔یا اگر محبوب محبوبہ دونوں یہاں آ کر بیٹھ جائیں تو ان کی محبت کو دوام اور بقا حاصل رہے گی۔

ہر روز کی طرح اُس دن بھی اس ''درگاہ'' پہ بہت رش تھا۔نوجوان لڑکے لڑکیوں کی جوڑیاں باری باری ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے آ کر یہاں کھڑی ہوتیں اور تصویریں کھچواتیں ۔ہم نے ان نوجوان عشاق کے احترام میں کافی دیر انتظار کیا۔یہ عبادت ہمارے لئے بھی لازمی تھی۔اس دوران میں نے ایک بوڑھا دیکھا جس نے ہنستے ہوئے سب نوجوانوں کو پرے دھکیلا اور آن کر دو لمحے کے لئے درختوں کے بیچ بیٹھ گیا۔سنجیدہ، رنجیدہ۔(ہر کسی ترّیں دلے ناں)۔بہت دیر بعد بالآخر ہمیں بھی نمبر ملا۔ہم اکیلے تھے۔ہماری جڑواں تو پیچھے کوہستان والے دیس میں رہ گئی تھی۔ہم نے اس یادگار کو حسرت سے چھوا اور ٹھنڈی آہ بھر کر دور رہائشی اپنے جڑواں درخت کو یاد کرتے ہوئے اکیلے تصویر کھچوا دی۔ہم درگاہ عشق میں حسن دیوی کے حضور خواہشِ وصال میں غریق تھے کہ محسوس ہوا جیسے ابریشمی مہرباں ہاتھوں سے ہماری پیٹھ تھپکائی جا رہی ہو۔پلٹ کر دیکھا۔ارے! یہ تو میداں گری والے تھے جو مہربان مسکان کے ساتھ ہمیں قبولیت کی بشارت رہے تھے۔ہم ان کی قدم بوسی کو دوزانو ہو گئے تو وہ تو فضا میں تحلیل ہو گئے، مگر ہم اس پورے مجمعے میں تماشا بن گئے۔کسی وفد کی ترجمان لڑکی نے قریب آ کر پوچھا:''Do you miss her so much?''

ہماری زیارت کا انداز تو آپ نے دیکھ لیا۔یہ باغ روزانہ اسی طرح کے سینکڑوں لوگوں کی عبادت گاہ بنتا ہے۔مگر آپ کو پتہ ہے بادشاہ خود کیسے آتا تھا باغ میں؟ اسی کی زبانی سنئے:

''میں جب بھی باغ میں ٹہلنے نکلتا تھا، تو ایک جلوس منظم کیا جاتا تھا۔سب سے آگے انتظامی بیورو کا ایک خواجہ سرا ہوتا جو ایک طرح سے سائرن کا کام کرتا۔وہ بقیہ جلوس سے 20 یا 30 گز آگے ہوتا اور سُر تال کے ساتھ ''چر۔۔۔چر'' کی آوازیں نکالتا جو ایک طرح کی تنبیہہ ہوتی تھی کہ اگر کوئی ارد گرد موجود ہو تو فوراً ہٹ جائے۔اس کے پیچھے دو خواجہ سرا ہوتے جو کیکڑے کے انداز میں روش کے دونوں کناروں پر چلتے رہتے۔جلوس کا مرکز یعنی ''میں'' ان سے دس قدم پیچھے ہوتا۔اگر مجھے کھلی پالکی پر بٹھا کر لے جایا جا رہا ہوتا تو ہر لمحہ میری ضرورتوں کا خیال رکھنے کے لئے دو جونیئر خواجہ سرا پہلوؤں میں ساتھ ساتھ چلتے رہتے۔اگر میں پیدل چل رہا ہوتا تو وہ مجھے سہارا دیتے۔پیچھے پیچھے ایک خواجہ سرا بڑا سا ریشمی چھتر اٹھائے رہتا اور اس کے عقب میں بہت سارے خواجہ سرا خالی ہاتھ یا طرح طرح کا الم غلم اٹھائے ہوئے چلتے۔ مثلاً اگر مجھے آرام کی خواہش ہوتی تو اس مقصد کے لئے نشست یکدم موجود ہوتی، پھر اضافی ملبوسات، چھتریاں اور مستورات والی چھوٹی چھوٹی چھتریاں وغیرہ۔سب کا سب انھوں نے سر پر اٹھا رکھا ہوتا۔رکھا شاہی خدمت گزاری پر ماموران خواجہ سراؤں کے پیچھے شاہی چائے بیورو کے خواجہ سرا ہوتے جو مختلف قسموں کے کیک اور نوع بہ نوع کھانوں کے خوان، گرم پانی کے جگ اور چائے کا ساز و سامان اٹھائے ہوتے۔ان کے بعد شاہی شفا خانے کے خواجہ سرا ہوتے جو ادویہ کے ڈبے اور ابتدائی طبی امداد کا سامان اٹھائے ہوتے۔ان ادویہ میں عرق، گل داؤدی، نرسل کی جڑیں، بانس کے پتے اور بانس کی چھال وغیرہ ہوتے۔

۔۔۔۔سب سے آخر میں کموڈ اور بیت الخلا کا دوسرا سامان اٹھا رکھا ہوتا۔(6)

یہیں کہیں اسی باغ میں گیارہ اپریل 1803 میں بادشاہ جیا فنگ پر قاتلانہ حملہ کیا گیا تھا مگر حسب معمول یہاں بھی بادشاہ بچ گیا اور قاتل پکڑا گیا۔اسے بادشاہ نے قتل کرنے کا حکم دیا ''مگر ایک ہزار زخم لگا کر''۔لہٰذا وہ 999 زخموں تک زندہ رکھا گیا اور ٹھیک ہزارویں زخم پر مر گیا۔(7)

آسمان کے بیٹے کو قتل کرنے کی سزا تو پھر ایسی ہی ہوتی ہے۔ اُس کا ہمسری کرنے والا تو مصدق بن جاتا ہے ایران میں، الیگزنڈر بن جاتا ہے روس میں، آلندے بن جاتا ہے چلی میں، نجیب بن جاتا ہے افغانستان میں، حمید بن جاتا ہے بلوچستان میں، اور.................اور...........

نیم غریبی حال وچالیں
نیم غنی او زر زوالیں

جوآں سال

ذرا دیکھتے ہیں کہ بادشاہ کھاتے کیا تھے؟ چین کے بادشاہ کے کھانے کی ایک روزہ تفصیل ابھی بھی محل میں محفوظ ہے۔ یہ 1799 میں پہلے قمری ماہ کے دوسرے روز کا Menu ہے جو شہرِ ممنوعہ میں لٹکا ہوا ہے۔ اس روز ساڑھے سات بجے اس نے ناشتہ کیا چالیس ڈشوں والا۔ جی ہاں چالیس ڈشیں۔ ان میں پرندے کے گھونسلے کا سوپ تھا۔ ترجمان نے Nest بتایا، میں نے حیرانگی سے پوچھا What؟ تو اس نے سمجھانے کی غرض سے اس کے سپیلنگ بتائے: این ای ایس ٹی۔ ڈکشنری میں مجھے ایک ہی Nest ملا جس کا مطلب ہم سب جانتے ہیں کہ گھونسلا ہے۔ اب دروغ وغیرہ برسرِ ترجمان ہو۔ لیکن ٹھہریئے مجھے اسکی تصدیق اور کتاب سے بھی ملی ہے (8) اور اس میں بالکل بالکل Bird`s Nest لکھا ہے۔ اس عجیب سوپ کے علاوہ ناشتے میں بطخ، مرغ، ہرن کا گوشت اور سور کی ڈشیں شامل تھیں۔ بھاپ سے پکایا خرگوش، لیس دار چاول کے آٹے کا بنا کیک......اڑے گم کروسائیں، کیا آپ خود اندازہ نہیں کر سکتے کہ فیوڈل بادشاہ کیا کیا گند بلا کھاتا ہو گا......بادشاہ سب کے سب خان خانان ہوتے ہیں۔ رعیت کی غلامی انہیں کیا کیا کرنے پر اکساتی رہتی ہے۔

بادشاہ سلامت نے اس روز ناشتہ جن برتنوں میں کیا تھا ان پہ توجہ فرمایئے: میز پہ تھے جناب عالی! مینا کاری کی ہوئی پرچیں، سورج مکھی کی شکل کی نیلم کی بنی پلیٹیں، پیالے سونے کے تھے۔ میز پوش اور کھانے کے دوران استعمال ہونے والے رومال یعنی نیپکن چاندی کے دھاگوں سے سلائی شدہ تھے۔ سارے زرد رنگ کے ہوتے جن پر اژدھے کا ڈیزائن ہوتا اور یہ الفاظ لکھے ہوتے: ''ہزاروں سال کی عمر نصیب ہو۔'' ظاہر ہے چالیس ڈشیں اس کا باپ بھی نہیں کھا سکتا تھا۔ لہذا سارا بچا کچھا قرار پایا اور ہیجڑوں میں تقسیم ہوا۔ مگر ظلِ الٰہی کا جھوٹا خوشونت سنگھ والا ہر بھاگ متی نامی ہیجڑہ نہیں کھا سکتا تھا مخصوص اور من پسند ہیجڑہ ہی اس نعمت کا حقدار بنتا۔ ہر پلیٹ اور پیالے پہ احتیاطی تدبیر کے تحت چاندی کی ایک لکیر موجود ہوتی۔ کہتے ہیں کہ اگر خوراک میں زہر ملا دیا گیا ہو تو چاندی کا رنگ تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بادشاہ سلامت ایک اور احتیاطی تدبیر بھی کرتے تھے۔ وہ یہ کہ وہ خود کھانا تناول فرمانے سے قبل ہر ڈش میں سے ہیجڑے کو ایک دو نوالے کھلاتے۔ پانچ دس منٹ انتظار فرماتے۔ اگر تو کھانے میں زہر ہوتا تو وہ ہیجڑہ مردار ہو جاتا اور اسکی قیمت پر بادشاہ کو حیاتِ نَو مل جاتی۔ اور اگر دس منٹ تک بھی ہیجڑہ صحیح سلامت ہیجڑہ گیری کرتا رہتا تو پھر بادشاہ سلامت کھانا نوش فرماتے۔ خیر یہ تو ہم صدیاں پرانی بات کر رہے ہیں۔ میں نے خود ابھی 1966،67ء میں دیکھا کہ میرے علاقے میں سوشلزم، آزاد بلوچستان اور عوامی حاکمیت کی، بلند بانگ باتیں کرنے والا گوریلا کمانڈر جب بھی کہیں مدعو ہوتا تو وہ سب سے پہلے اپنے باڈی گارڈ کو دو دو نوالے ہر ڈش سے کھلاتا اور دس پندرہ منٹ تک انتظار کی زحمت فرماتا اور پھر کھانے پر ٹوٹ پڑتا۔ حالانکہ اسے معلوم تھا کہ اسے کسی نے مار کے کیا کرنا تھا......وہ تو محض رعب داب اور خوف و دبدبہ بڑھانے کیلئے ایسا کرتا تھا۔ ایسے ہوتے ہیں ڈکٹیٹر لوگ۔

شاہی طعام کے ذکر کے لئے خاص اصطلاحات تھیں اور ان اصطلاحات کے

استعمال میں غلطی پر سزا ملتی تھی۔ کھانے کو ''کھانا'' نہیں بلکہ ''خوانِ نعمت'' کہتے تھے، کھانا کھانے کو ''خوانِ نعمت کا استعمال'' کہا جاتا تھا۔ کھانا لگانے کو ''ترسیلِ خوانِ نعمت'' کا نام دیا جاتا تھا اور باورچی خانے کے لئے ''شاہی خوانِ نعمت کا کمرہ'' کی اصطلاح تھی۔

بادشاہ کا پانی رعایا کے پینے کے پانی سے الگ ہوا کرتا تھا۔ اس نے پورے بیجنگ میں سروے کرا کر سب سے میٹھے اور صاف چشمے کو اپنے لئے مخصوص کر رکھا تھا۔ اس چشمے کے پانی کو بادشاہ سلامت کے علاوہ کوئی استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ اس کا نام ''دنیا کا اولین چشمہ'' رکھا گیا۔

فیوڈل آداب کے تحت بادشاہ کا نام لینا گستاخی تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ہمارے ہاں سردار کا نام لینا توہین کے زمرے میں آتا ہے۔ خود بادشاہ کی زبانی ملاحظہ ہو: ''جی عالم پناہ''۔۔۔ میں اوائل بچپن ہی سے اس کا عادی ہو گیا تھا۔ میں اپنے سامنے رعایا کے گھٹنوں کے بل جھکنے اور سجدہ ریز ہونے کا بچپن سے عادی ہو گیا تھا۔۔۔ مجھ سے دس گنا سے بھی زیادہ عمر کے لوگ میرے روبرو سجدہ ریز ہوا کرتے تھے۔۔۔ میرے اپنے قبیلے، میرے اپنے خاندان کے بزرگ بھی''۔(9)

ہم نے چینی فیوڈل بادشاہوں کے روزمرہ معمولات کی ساری دلچسپ باتیں غور سے سنیں، پڑھیں اور ان باتوں کو اپنے خطے کے تناظر میں دیکھا۔ یہ سب حاکم لوگ ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔ سنٹرل ایشیا سے لیکر جنوبی ایشیاء کے راجے، مہاراجے، ملک، خان سب کے فرعونی طریقے ایک ہی جیسے تھے اور ہیں۔ چینی بادشاہ کے رفع حاجت کے کموڈ کو ''گوآن فانگ'' کہا جاتا تھا۔ یہ صندل کی لکڑی سے بنا ہوا تھا جو اعلیٰ قسم کے نقش ونگار سے مزین تھا۔ یہ پیلے رنگ کے ایک کپڑے میں لپٹا ہوتا تھا جس پر بادل اور اژدھے کا تخیل کڑھا ہوا تھا۔ جب بادشاہ کو حاجت پیش آتی تو ایک مخصوص ہیجڑہ ''گوآن فانگ'' کو سر پہ اٹھائے کمرے کے دروازے تک لے آتا۔ ایک کنواری کنیز اسے کمرے کے اندر لے جاتی۔ وہ فرش پر ایک روغنی کپڑا بچھاتی، اس پہ ''گوآن فانگ'' سجاتی۔ اس میں خوشبودار لکڑی کا برادہ چھڑکتی اور بادشاہ کو دعوت دیتی۔

بادشاہ ٹوائلٹ پیپر کی جگہ پر ٹشو پیپر استعمال کرتا تھا۔ جب ''آسمان کا بیٹا'' حقیر انسانوں والے انسانی کام سے فارغ ہو جاتا تو کنواری کنیز ''گوآن فانگ'' کو دروازے تک لے جاتی جہاں ہیجڑہ اس پہ شاہی علامت والا پیلا کپڑا لپیٹتا اور سر پہ اٹھا کر لے جاتا۔

9۔ ملکہ نہاتی کیسے تھی؟

ملکہ عالیہ نہاتی کیسے تھیں، یہ جاننا بہت ضروری ہے ورنہ چین کی موجودہ ترقی سمجھ ہی نہ آسکے گی۔ اور اگر عوام کی تذلیل کی گہرائی تک نہیں پہنچا جائے گا تو ان کے آج کی معراج کو کیسے ناپا جا سکے گا۔ ملکہ خود اپنے ہاتھوں سے تھوڑا نہاتی تھی!! اسے تو دوشیزہ نوکرانیاں نہلاتی تھیں۔ ملکہ کے غسل کیلئے دو ٹب ہوتے تھے۔ ٹین کے نہیں جی...... چاندی کے۔ ایک ٹب تھا جسم کے بالائی حصے کیلئے اور دوسرا تھا نچلے دھڑ کیلئے۔ وہ جب نہانے کے موڈ میں ہوتی تو ہیجڑے غسل کے ٹب تیار کر لیتے، پانی کا انتظام کرتے اور تولیوں، صابنوں اور عطریات سے بھرے دو ٹرے لے کر آتے۔ اس کے بعد وہ دفع ہو جاتے اور چار خوبصورت دوشیزائیں اسے نہلانے آجاتیں۔

یہ کوئی پانی انڈیل انڈیل ڈالنے والا غسل نہیں ہوتا تھا۔ ملکہ تو ''سپنج باتھ'' کرتی تھی۔ ٹرے پر ایک پہ ایک تہہ کئے ہوئے سو سے زیادہ تولئے ہوتے تھے۔ ہیڈ دوشیزہ تولیوں کو نیم گرم پانی سے بھگو دیتی، انہیں ہلکا سا نچوڑ لیتی اور ہر دوشیزہ کو ایک ایک دیتی جاتی۔ ملکہ ایک

نچلی کرسی پر بیٹھی ہوتی تھی اور دوشیزائیں اس پر تولیہ ملتیں۔ ہر ایک کیلئے جسم کا کوئی ایک حصہ مخصوص تھا۔وہ آہستگی سے اس کی چھاتی ملتیں۔ اس کے کاندھے ،اسکی پشت،اسکی بغلیں۔یہاں وہ چھ یا سات تولئے استعمال کرتیں۔اگلا مرحلہ صابن لگانے کا تھا۔یہ صابن خصوصی طور پر محل میں بنتا تھا۔صابن ملکہ کے جسم پر نہیں لگایا جاتا بلکہ تولیوں پر لگایا جاتا اور پھر یہ صابن لگے تولئے ملکہ کے جسم پر ملے جاتے۔ ہر تولیہ غسل کے دوران صرف ایک مرحلے پر استعمال ہوتا تھا۔جب صابن لگ چکا ہوتا تو پھر دوشیزائیں نئے صاف تولئے نیم گرم پانی میں بھگولیتیں اور ملکہ کے جسم پہ لگے صابن کو صاف کرتیں ۔اب اگلا مرحلہ تھا عطرے لگانے کا ۔کوئٹہ کے جگو نائی کی طرح ہاتھوں سے عطر پاشی نہ ہوتی تھی ، بلکہ خالص سوتی کپڑے کی ٹکڑیوں سے آسمان کی بہو کو عطر لگایا جاتا تھا۔دوشیزہ اس ٹکڑے کو عطر سے شرابور کرتی اور ملکہ کی جلد پر ملتی۔اس کے بعد آخری مرحلہ یہ تھا کہ وہ دوشیزائیں خشک تولئے لیتیں اور ملکہ کا جسم سکھاتیں۔اس غسل میں جسم کے اوپری حصے پہ کل 50،60 تولئے درکار ہوتے اورٹرے کے بقیہ تولئے زیریں حصے پہ استعمال ہوتے۔(10)

10۔بادشاہ حسینائیں جمع کرتا ہے

آپ نے چین کی دوشیزائیں تو دیکھی نہیں۔آپ نے حسن بن صباح کی جنت کے بارے میں سنا ہے، پڑھا ہے؟نہیں بھئی، یہ مہوشان گلرخ تصور سے بھی زیادہ حسین، زیادہ نازک ہوتی ہیں۔ میں نے جو حسن عام سڑک پہ دیکھا ہے وہی کلٹی کر دیتا ہے، بادشاہ کی منتخب کردہ تو کوئی اور چیز ہوتی ہوگی۔آیئے ذرادیکھتے ہیں کہ بادشاہِ چین پورے ’’مملکت خداداد‘‘ چین میں سے چن چن کر حسین ترین لڑکیاں کیسے اکٹھی کرتا تھا۔

یہ 1621 کا سال ہے۔بادشاہ کا نام ہے تیا تقوئی۔فرمان جاری کرتا ہے کہ چین بھر سے خوبصورت ترین حسینائیں جمع کردی جائیں۔عمریں کیا ہوں؟13 سے 16 برس تک کی ۔ دور دراز علاقوں میں سے چن چن کر حسین ترین لڑکیاں بیجنگ بھجوا دی گئیں ۔چاہییں صرف 50 لڑکیاں، اور جمع کردی گئیں پانچ ہزار لڑکیاں......یعنی ان حسین ترین پانچ ہزار لڑکیوں میں سے 50 لڑکیوں کو منتخب کرنا تھا...... توبتاؤ ان کی خوبصورتی کیا ہوگی؟ آپ تو مجھ جیسے شریف آدمی ہیں، بولیں گے، پریاں ہونگی......ارے نہیں بھئی خدا کو مانو۔ پریاں چینی حسن کے سامنے کچھ نہیں۔ چنانچہ سرکاری جاسوسوں، چغلی کھانے والے خوشامدیوں اور شاہی اہلکاروں نے ہر قصبے، ہر گاؤں اور ہر جھونپڑی کا خورد بینی جائزہ لیا اور اس طرح پانچ ہزار منتخب حسینائیں مہیا کردیں ۔۔۔جن میں سے صرف 50 سلیکٹ ہونی ہیں۔پہلی سلیکشن اندرونی محل کے تجربہ کار ہیجڑے نے کرنی تھی ۔اس کے پاس چار پیمانے ہوتے تھے: لڑکی فلاں حد سے زیادہ لمبی نہ ہو، فلاں حد سے زیادہ کوتاہ قد نہ ہو، بہت زیادہ موٹی نہ ہو اور فلاں پیمانے سے زیادہ پتلی نہ ہو۔اس مغرور، متکبر و گنہگار ممتحن نے انتہائی فضول خرچی دکھاتے ہوئے ایک ہزار حسیناؤں کو مسترد کر دیا۔ بد بخت ممتحن! حسن اور رجیکشن !! دھر پھٹے منہ۔اب باقی رہ گئیں چار ہزار دوشیزائیں۔ حسین ترین چار ہزار لڑکیاں۔

اگلے دن انہوں نے ہر لڑکی کے کان، آنکھیں، ناک ،بال، کھال، گردن، کاندھوں اور پشت کا معائنہ کیا۔اوران اعضا میں ذرا سا نقص بھی نظر آیا اسے مسترد کردیا۔اب جو چھنی ہوئی نازک اندام چندے ماہتاب چندے آفتاب حسینائیں بچیں، ان سے کہا گیا کہ وہ اپنا نام، گاؤں کا نام اور عمر کے بارے میں بول کے بتا دیں۔اگر کوئی لڑکی بولتے ہوئے ذرا بھی ہکلائی یا اس کی آواز ذرا سی بھی موٹی نکلی اسے بھی مسترد کر دیا۔ان دو ہی مرحلوں میں مزید دو ہزار لڑکیاں مسترد کردی گئیں ۔۔۔حسن کی بے عزتی کرنے والے درندے۔

سلیکشن کے تیسرے روز خواجہ سراؤں نے امیدواروں کے ہاتھوں اور پیروں کی نمائش کی اور انہیں حکم دیا کہ وہ کچھ دور تک چل کر دکھائیں۔ جو بھی ذرا سی کوتاہ کلائی والی نکلی یا جس بھی کسی کے انگوٹھے موٹے تھے یا جس نے بھی ذرا سی تیز رفتاری دکھائی، اسکی چھٹی۔ یوں ایک ہزار اور گئیں۔ بقیہ بچیں ایک ہزار۔ خوب چھن چھن کر، معائنہ کر کرا کے، بہت وسیع چین کی ہزار حسینائیں۔۔۔۔ ان ہزار لڑکیوں کے مزید معائنہ جات کیلئے انہیں محل کے اندر بھیج دیا گیا۔

سلیکشن کے چوتھے روز محل کی ایک تجربہ کار کنیز، امیدواروں کو باری باری ایک کمرے میں لے گئی۔ اس نے انکے پستان چھوئے، انکی بغلیں سونگھیں اور ان کی جلدوں کا باریکی سے معائنہ کیا۔ اس بار صرف تین سو منتخب کر لی گئیں۔ ان تین سو حسینانِ زمانہ کو ایک ماہ تک محل میں رہنا تھا۔ تاکہ اس ایک ماہ کے دوران ان کی شخصیت کا ہر پہلو کھل کر سامنے آئے۔ بالآخر 50 دوشیزاؤں کو داشتاؤں کی حیثیت سے سلیکٹ کیا گیا (11) سسک سسک کر جینے کو حتمی غلامی میں گھٹ گھٹ کر مرنے کو، زندگی بھر بے خاوند رہنے کو، بڈھے، استعمال شدہ، اور دوائیوں معجونوں کے ذریعے جنسی طور پر زندہ رکھے گئے بادشاہ کے استعمال کو۔

11۔ بادشاہ کے ساتھ سونے والی عورتیں

بادشاہ کے حرم میں صرف یہی 50 دوشیزائیں نہ تھیں۔ کوژو عہد سلطانی میں ایک بادشاہ کی تین ملکائیں تھیں، نو درجہِ اول کی داشتائیں، 27 درجہِ دوئم کی داشتائیں اور 81 نچلے درجے کی داشتائیں تھیں۔ ہان اور تنگ عہد سلطانی میں شاہی ''حرم'' میں 9000 ہزار عورتیں موجود تھیں۔ اور تانگ عہد سلطانی کے بادشاہ سوآن زونگ کے وقت شاہی ''حرم'' 40 ہزار عورتوں پر مشتمل تھا۔ (12)

دوسری صدی قبل مسیح میں ترتیب دی گئی ریکارڈ آف دی انسٹیٹیوشن آف چاؤ ڈائناسٹی کے مطابق نچلے درجے کی داشتائیں جن کی تعداد اکیاسی تھی، نو راتوں تک نو نو کے گروپ میں بادشاہ کے ساتھ سویا کرتیں۔ ستائیس درجہِ دوئم کی داشتاؤں کو نو نو کے گروپ میں بادشاہ کے ساتھ تین تین راتیں عنایت کی جاتیں۔ نو درجہ اول کی داشتاؤں اور تین ملکاؤں کے گروپ کو ایک ایک رات عطا کی جاتی۔ اور ہر ماہ کی پندرہویں کو ملکہ کو بادشاہ کے سات ہم بستری نصیب ہوتی۔ اس کے بعد یہی ترتیب مخالف سمت سے دوہرائی جاتی۔ اس سب کے پیچھے جو مصلحت پوشیدہ تھی وہ یہ تھی کہ بادشاہ آسمان کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے ''یانگ'' طاقت سے بھرپور ہوتا، جو کہ مردانہ وجاہت کا سرچشمہ تصور کی جاتی ہے۔ اس کو توازن فراہم کرنے کے لیے ''ین'' قوت درکار ہوتی ہے جسے نسوانیت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ پورے چاند کی رات جب ''ین'' قوت اپنے عروج پہ ہوتی ہے۔ ملکہ کو بادشاہ کے ساتھ رات گزارنے کا موقع دیا جاتا اور یہی استقرارِ حمل کے لیے بہترین گھڑی ہوتی۔ چاند کی ڈھلتی تاریخوں میں ''ین'' طاقت بھی زوال پذیر ہوتی۔ چنانچہ داشتائیں گروپ کی صورت میں اکٹھے ہو کر اپنی ''ین'' قوت کو جمع کرتیں۔

12۔ داشتاؤں کی بغاوت

جیاجنگ بادشاہ تھا اور اس کا چیف کونسلر یان سانگ تھا۔ منگ عہدِ سلطانی کا یہ جیاجنگ بادشاہ ظلم و جبر میں یکتا تھا۔ بالخصوص وہ محل میں موجود داشتاؤں پہ بہت سختیاں روا

رکھتا تھا۔معمولی سی غلطی پر انہیں پیٹتا اور پٹواتا تھا۔اور اس کے دور میں 200 سے زائد حسین داشتائیں اس کی مار پیٹ کی وجہ سے مر گئیں۔1542ء میں اس کی بادشاہت کے اکیسویں برس سولہ خواتین نے یانگ جن ینگ کی قیادت میں سوتے ہوئے بادشاہ کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔مگر رسی کی گرہ سخت نہ ہوئی اور بادشاہ جاگ گیا۔اس نے شور مچایا۔یانگ جن ینگ نے دیکھا کہ بادشاہ بچ رہا ہے تو اس نے اپنے بالوں سے ایک چاندی کی ہیئر پن نکالی اور بادشاہ کی آنکھ میں گھونپ دی۔محافظ دوڑ آئے اور بے ہوش شدہ بادشاہ کو بچا لیا۔یانگ جن ینگ اپنی پندرہ دیگر مجاہدوں سمیت گرفتار ہوئی اور سب کے سب عضو عضو کاٹ کاٹ کر کے قتل کر دی گئیں۔ان کے سر کاٹ دیئے گئے اور عبرت کیلئے نمائش کیلئے رکھ دیئے گئے۔(خان محمود خان نے ایک شخص کے خصیے کاٹ کر قلات کے جامع مسجد کے مین گیٹ پر لٹکا دیئے تھے)۔آمروں کو عبرت بازی کا بڑا شوق ہوتا ہے!!

بادشاہ سلامت بچ تو گئے۔مگر ایک آنکھ سے اندھے ہو گئے۔اپنی بدصورتی سے شرمندہ یہ بادشاہ زندگی بھر اندرونی محل سے کبھی باہر نہ نکلا، نہ اس نے دربار لگایا۔محل سے باہر کسی نے اس یک چشم بادشاہ کو کبھی نہ دیکھا۔صرف اس کا بڑا معتمد یان سونگ (ہمارا شمس شاہ) ہی اس سے احکامات لیتا، ان احکامات میں اپنی مرضی کی ملاوٹیں کرتا، اور انھیں لاگو کرتا رہا۔اس نے چین کی تاریخ میں ایک ظالم و متشدد اہل کار کی حیثیت سے بدنامی پائی۔مگر اس دور کے چین میں اس کے خلاف ''یان سونگ گردی'' لکھنے والا کوئی یوسف عزیز مگسی نہ تھا۔

13۔چکور باز، بٹیر باز، جھینگر باز بادشاہ

فیوڈل حکمران خواہ لسبیلہ کے ہوں، سندھ کے ٹالپر ہوں، لکھنو کے نواب ہوں یا قندھار کے خان، خلیجی ریاستوں کے شیخ ہوں یا چین کے بادشاہ۔ان سب کی ایک جیسی کارستانیاں، ایک جیسے شوق اور مشغلے ہوتے ہیں۔گھڑ سواری سے لیکر تیتر پالی تک اور بھنگ بازی سے لیکر چکور پالی تک۔چینی بادشاہوں میں سے ایک یعنی ژواندے کو جھینگر بادشاہ (بلوچی میں چرت بادشاہ) کہتے ہیں۔یہ صاحب جھینگروں کے دیوانے تھے۔ویسے بھی چین میں جھینگر لڑانے کی ریت بہت قدیم تاریخ سے موجود ہے۔اس بادشاہ نے 1434 میں ایک علاقے کے مجسٹریٹ کو فرمان لکھ کر بھیجا کہ میں دو نوکر جھینگر جمع کرنے کیلئے بھیج رہا ہوں ان کی ہر طرح سے مدد کی جائے۔وہاں چین میں ایک ضرب المثل ہے''۔سارے ملک میں جھینگر بولتے ہیں اس لئے کہ بادشاہ ژواندے کو ان سے محبت ہے''۔اس کے دور میں جھینگروں کا شوق اس قدر زیادہ تھا کہ ایک جھینگر کی قیمت اصلی نسل کی ایک گھوڑی سے زیادہ ہوا کرتی تھی۔کہتے ہیں کہ ایک افسر نے اعلیٰ نسل کی گھوڑی کے عوض ایک جھینگر خریدا اور اسے بادشاہ کو پیش کرنے کیلئے پالنا شروع کر دیا۔وہ اسے اچھی خوراک دیتا، خوب ورزش کرواتا، ماہرین سے اس کو لڑنے کی ٹریننگ دلواتا رہا۔ایک روز متجسس بیوی نے اس جھینگر کو دیکھنے کے لیے برتن کا ڈھکنا کھول کے اندر جھانکا۔دفعتاً جھینگر چھلانگ کر باہر نکلا۔ساتھ ہی ایک مرغا گزر رہا تھا۔اس نے جھپک کر اسے منہ میں لیا اور نوش جان کر دیا۔عورت اپنے خاوند کے قہر سے اس قدر خوفزدہ ہوئی کہ چھت سے لٹک کر خودکشی کر لی۔جب خاوند باہر سے گھر آیا اور اپنی مری ہوئی بیوی اور خالی برتن دیکھا تو اس نے بھی خود کو لٹکا کر خودکشی کر لی۔(پیرک و گراں نازکی بلوچ کہانی کا چینی چربہ)۔مگر یہ کوئی چربہ کاری نہیں یہ تو عوامی ثقافت کی پاک لین دین ہے۔بلوچستان کی کئی چیزیں دنیا کے کونے کونے تک گئیں اور وہاں کی کئی باتیں بلوچ ثقافت کے حسن کا جزو بن گئیں۔۔۔۔مشترکہ انسانی میراث۔

14۔انتقام غیرت کا نام دھار لیتا ہے

بادشاہ گوانگ ژو کی دو داشتائیں تھیں۔ یہ دونوں داشتائیں آپس میں بہنیں تھیں ۔چھوٹی ژین، جوان تھی، خوبصورت تھی، زندہ دل تھی اور لڑکوں جیسے کپڑے پہننے کی شوقین۔ بادشاہ اس پر مرمٹتا تھا۔ وہ بہت عقلمند تھی اور بادشاہ کو حکومتی امور میں بہت اچھے مشورے بھی دیا کرتی تھی ۔ظاہر ہے ملکہ اس سے سخت حسد کرتی تھی۔اور کسی طرح اسے ٹھکانے لگانے کے مواقع ڈھونڈتی رہتی ۔اگست 1900میں جب آٹھ ملکوں کی اتحادی فوجوں نے بیجنگ پر قبضہ کرلیا تو ملکہ نے بادشاہ گوانگ ژو کواپنے ساتھ بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ مگر جانے سے قبل اس نے چیف ہیجڑے کے ذریعے چھوٹی ژین کو بلا بھیجا اور اس سے کہا''یورپین لوگ شہر میں داخل ہونے کو ہیں۔اور ظاہر ہے وہ قابض ظالم تمھاری عصمت دری کریں گے۔ اس طرح تو ہمارے شاہی خاندان کی ناک کٹ جائے گی اور ہمارے بزرگ مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے''۔ پھر اس نے چیف ہیجڑے کو داشتہ ژین کو قریبی کنوئیں میں پھینکنے کا حکم دیا۔ یوں اندھے انتقام نے ایک فرضی خدشے کا سہارا لے کر ایک لاابالی معصوم کمسن لڑکی کو قتل کرلیا۔ غیرت زبردست ماسک رہی ہے قاتلوں کے لئے !!یہ کنواں شہرِ ممنوعہ کے شمال مشرقی کونے پہ واقع ہے۔ اور اس کا نام''داشتہ ژین کا کنواں''ہے۔

فتح پورو کوہیں قلات
بر باث و بری آ کفاث
سن باث و سنی آ روا
ڈھینگے رڑاثاں بانہڑاں

15۔بادشاہ کا مولوی

ہم نے اس باب کے اوائل میں ذکر کیا تھا کہ شہرِممنوعہ میں کل 9999.5 کمرے ہیں۔سوچنے کی بات یہ ہے کہ کل عمارت دس ہزار کمروں پر مشتمل کیوں نہ تھی۔آدھا کمرہ کیوں کم تھا؟ اس کے لئے چین کے ملاّ نے دلچسپ بات گھڑ لی:''آسمانوں پر Jade بادشاہ(سپریم دیوتا) کے دس ہزار کمرے ہیں۔ چونکہ زمینی بادشاہ آسمانی بادشاہ کے بیٹے ہیں۔اس لئے بیٹے کا باپ سے کمتر ہونا فطری بات ہے۔اسی وجہ سے آسمان کا بیٹا، یعنی زمینی بادشاہ زیادہ سے زیادہ 9999.5 کمرے ہی بنا سکتا تھا۔

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ بادشاہ ہر رات کسی دوسرے کمرے میں سوتا اور اسکے قریب ترین ہیجڑے کے علاوہ کسی کو خبر نہیں ہوتی کہ وہ امشب کہاں سوئے گا۔وہ قتل کیے جانے کے خوف سے ایسا کرتا تھا۔آپ ہی حساب لگائیے کہ اگر وہ ہر رات الگ کمرے میں سوتا تو پورے محل کے ہر کمرے میں وہ ستائیں برس بعد ایک رات سو سکتا تھا۔اور ستائیس برس کی بادشاہت کس بادشاہ کو نصیب ہوتے تھے۔تو اس کا مطلب یہ ہے کہ بادشاہ اپنے محل کے ہر کمرے میں تو ایک رات بھی سونے سے محروم تھا۔خواہ مخواہ کی فضول خرچی۔

16۔زن و مرد کی تقسیم

شہرِممنوعہ کی ایک خاص بات یہ ہے کہ اس میں شیروں کے چھ جوڑے بنائے گئے ۔یہ ایک، ایک پلیٹ فارم پر بیٹھا ہے۔ان کے کھلے ہوئے منہ غراتے ہوئے لگتے ہیں۔ان کے پنجے بہت مضبوط ہیں۔یہ بالکل زندہ لگتے ہیں۔

دانشورانہ بددیانتی یہ کی گئی کہ شیروں کے ہر جوڑے میں مادہ دائیں جانب ہوتی ہے۔اسکا بایاں پنجہ آگے کو بڑھا ہوا ہے۔جہاں وہ اپنے شیر بچے سے کھیل رہی ہے۔یعنی ماں شیرنی کی اپنے بچے کے ساتھ مادرانہ محبت دکھائی گئی ہے۔گویا خاندان کی دیکھ بھال کرنے کا فریضہ مادہ کا ہوا۔اس طرح سوماج میں عورت کی حیثیت شیرنی کے مجسمے کے ذریعے سے متعین کردیا گیا۔جبکہ ہر جوڑے کا مرد شیر بائیں جانب ہے اور دائیں پیر سے ایک گیند یا گلوب سے کھیل رہا ہے،یعنی شاہی اقتدار پوری دنیا پر۔مردانہ بالادستی کو آرٹ اور روایت سے جوڑ کر کس غیر محسوس طرز پر پیش کیا جا تا رہا ہے۔

17۔بت پرست یا بت شکن

اس نوجوان نے بہت احسن طریقے سے گائیڈ کے فرائض سرانجام دئے۔وہ آج کی نوجوان نسل میں سے تھا،ظاہر ہے کہ اس نے فیوڈل ازم کی تباہ کاریاں نہیں جھیلی تھیں۔وہ بادشاہوں کے مظالم سے آشنا نہ تھا اور اس کا سابقہ ابھی تک طبقاتی نظام کی سفاکی سے نہیں پڑا تھا۔چنانچہ جب وہ ہمیں شہر ممنوعہ کے آخری دروازے پر رخصت کر رہا تھا تو وہ خود بھی ظلم و جبر کی اس یادگار کو بہت شاندار سمجھنے لگا تھا۔اس نے جذبات کی رو میں ہم سے الوداعی ہاتھ ملاتے ہوئے یہ فقرہ کہا:'' Well gentlemen! now you are emprors'' تو مجھ سے رہا نہ گیا اور میں نے تلخی سے کہا ''No, we are overthrowers to them''۔نوجوان جھینپ گیا۔رٹا رٹایا جواب نہ پا کر پیشہ ورانہ میں انداز مسکرایا اور ''Yes،Yes'' کہہ کر میرا فقرہ دھرایا:

We are overthrowers of Emprors

حوالہ جات

چنگ،کن ہوا Tales of the for borbidden city فارن لنگویج پریس۔بیجنگ۔صفحہ نمبر 5

2۔ایضاً صفحہ 10

3۔فیضی صفحہ 29

4۔چنگ قن ہوا صفحہ 16

5۔ایضاً صفحہ 27

6۔پھوُ ای۔شہنشاہ سے شہری تک۔جلد اول۔صفحہ نمبر 63

7۔چنگ قن ہوا صفحہ 42

8۔چنگ قن صفحہ 32

9۔پھوُ ای۔شہنشاہ سے شہری تک۔جلد دوئم۔1983ء غیر ملکی زبانوں کا اشاعت گھر بیجنگ۔ صفحہ 61

10۔چنگ،کن ہوا صفحہ 45

11۔ایضا۔ صفحہ 44

12۔ایضا۔ صفحہ 44

راؤنڈ ٹیبل کانفرنس

1۔اصلی گدھا یہی ہے۔

شہر ممنوعہ سے نکلے تو بھاگم بھاگ اپنی کوسٹر بس میں بیٹھے اور ایک کروڑ کی آبادی والے اس شہر کی قدامت و جدیدیت ، فیوڈل ازم و سوشلزم اور سوشلزم و کیپٹل ازم کے امتزاجوں میں امتیازوں کی گتھیاں سلجھانے میں غلطاں ذہن کے ساتھ بالآخر چائینیز رائٹرز ایسو سی ایشن کے دفتر پہنچے جہاں مین گیٹ پر عوامی جمہوریہ چین کے ادیبوں نے ہمارا استقبال کیا۔

یہاں ''چنگ یو' تھے جو شاعر ہیں' دانشور ہیں،ادیب ہیں ۔ جانگ لی تھے جو معروف تنقید نگار ہیں۔ نیز وہ ایسوسی ایشن کے لٹریچر اینڈ آرٹ جرنل کے ایڈیٹر بھی ہیں۔یہیں پہ پروفیسر تانگ موجود تھے جو بیجنگ یونیورسٹی میں اردو ڈیپارٹمنٹ کے سربراہ ہیں۔

جنکشی یوتو پہلے سے ہی چلم وحقہ باز منکشف ہوئے تھے۔مگر ہمارے یہاں کے چیف میزبان بھی بلا کے سگریٹ نوش نکلے۔۔۔۔دے کش پہ کش، لگا سوٹے پہ سوٹا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ہمارے پاکستانی وفد میں ایک بھی ''سموکر'' نہ تھا۔ہم سب تو بہ کردہ گناہگار تھے۔ایک دفعہ میرے ایک بہت ہی قریبی عزیز، طالب علمی کے زمانے میں تمبا کو نوشی کرنے لگے۔مگر غریب اتنے کہ ڈبیہ تو درکنار سگریٹ کا ایک دانہ بھی خرید نہیں سکتے تھے۔ ایک دن ہانپتے ہوئے آئے اور غصہ اور پریشانی میں کہنے لگے: "ایک سائیکل سوار سگریٹ پیتا ہوا جا رہا تھا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا کہ جب وہ آخری ''ٹوٹا'' پھینک دے گا تو میں پی کر اپنا نشہ پورا کرلوں گا۔ بہت دوڑایا اس کم بخت نے۔مگر جب ٹوٹا پھینکنے کا وقت آیا تو اس نے اسے گندے نالے میں پھینک دیا"۔

ڈاکٹر سلیم اختر نے سگریٹ کی بات چھیڑ دی تو میزبان صاحب فخریہ انداز میں بولے: ''چین میں 40فی صد آبادی سگریٹ پیتی ہے''۔

آپ نے غور فرمایا پچاس کروڑ ''سموکر'' ہیں چین میں ۔زیادہ تر سموکر دیہات سے شہروں کو آئے ہوئے نوجوان ہوتے ہیں۔ ویسے بھی دنیا میں چین ہی تمبا کو کی پیداوار کے لحاظ سے سب سے بڑا ملک ہے۔مقبولِ عام چینی سگریٹ کا نام ''ڈبل ہیپی نس'' ہے۔حالانکہ یہ مسرت خواہ مخواہ کی ہے۔اور یہاں سرور آنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔کیونکہ سگریٹ میں تمبا کو ہی ہوتا ہے، اور کچھ بھی بھرا نہیں ہوتا۔ان کے سگریٹوں کے پیکٹ عجیب خوبصورت سے ہوتے ہیں۔سینکڑوں برانڈ کے سگریٹ ہیں یہاں ۔اور ان پیکٹوں پہ روایتی چینی ڈرائنگز و کارٹون بنے ہوتے ہیں۔اور بہت سوں پر تو اقوال زریں بھی چھپے ہوتے ہیں۔البتہ صحت والی وارننگ پیکٹ کے سائیڈ پہ چُھپے ہوتے ہیں۔سگریٹ فروش یہاں بھی کھوکھے بناتے ہیں۔ان کھوکھوں میں فون کارڈ بھی بکتے ہیں، ٹکی ٹافیاں بھی اور موسم کے اعتبار سے کولڈ ڈرنک وغیرہ بھی۔ یہ کھوکھے چوکوں پہ بنائے جاتے ہیں۔سامنے والا حصہ خوبصورت دلہن کی طرح سجایا ہوتا ہے،

اس میں وہ ایک کھڑکی بہت مزین بناتے ہیں۔ پچھلے حصے میں دکاندار کا بستر لگا ہوتا ہے۔ وہ سوتا بھی وہیں ہے۔

چین نے نومبر 2003 میں ورلڈ ہیلتھ آرگنائزیشن کے ''تمباکو کنٹرول کنونشن'' پر دستخط کیے تھے مگر اس معاہدے کو نافذ 2005 میں کر دیا گیا ہے۔ اس معاہدے میں یہ بات بھی شامل ہے کہ چھوٹی عمر والوں کو سگریٹ بیچنے پر پابندی ہوگی اور سگریٹ پر زیادہ ٹیکس لگے گا۔۔۔۔اس ایشائی ملک کے ٹیکس کا بہت بڑا حصہ اسی سگریٹ فروشی سے آتا ہے۔ چھ ملین یورو کا سالانہ ٹیکس آتا ہے تمباکو کے دھوئیں سے۔ یہ الگ بات ہے کہ WHO کے مطابق اسی سے پیدا شدہ بیماریوں پہ سال میں 5 بلین یورو خرچ ہوتے ہیں۔

گو کہ سرکاری طور پر سگریٹ کی اشتہار بازی، پروموشن اور سپانسر شپ پر پابندی ہے۔ مگر چمکتے کاغذ والے، رسالے ماڈلوں اور فلمی ستاروں کے دھوئیں پھینکتے لب چھاپ کر یہ قانونی کاروائی پوری کرتے ہیں۔ بین الاقوامی سرمایہ دار بہت بدمعاش ہوتا ہے۔ اُدھر مغرب میں چونکہ تمباکو نوشی روز بروز سماجی طور پر مسترد ہوتی جا رہی ہے لہذا سگریٹ ساز ملٹی نیشنلز چین کا رخ کر چکے ہیں۔ یہاں ''مالبرو'' اور ''کیمل'' نامی برانڈ سب سے زیادہ بکنے والے مغربی برانڈ ہیں۔

لیکن ہمیں بتایا گیا کہ چین کی اپنی سگریٹ سازی پہ سرکار کی مکمل اجارہ داری ہے۔ سگریٹ کے بے شمار برانڈ ہیں۔ مگر سب سے مشہور ''چائنا برانڈ'' ہے جو 40 برس سے کام کر رہا ہے۔۔۔''

ہمیں ڈاکٹر خدائیداد کا سنایا ہوا وہ لطیفہ نما واقعہ یاد آیا جو انہوں نے سکھر میں بیڑی کے برانڈز کے بارے میں بتایا:

''گدھا مارکہ'' بیڑی بہت مشہور و معروف برانڈ کی بیڑی ہوا کرتی تھی۔ لوگ نسلوں سے اس بیڑی کی کوالٹی پہ اعتماد رکھتے تھے۔ ایک روز اس کے مالک کے ایک بدخواہ دوست نے اسے مشورہ دیا کہ ''گدھا'' مارکہ کوئی اچھا نام نہیں ہے، اس کا نام گدھے سے ہٹا کر کچھ اور رکھ لیجئے۔ اس نے دوست کی بات مان لی اور گدھا مارکہ کی بجائے اپنی بیڑی کا نام ''گلاب مارکہ'' رکھ لیا۔ مگر مشورہ دینے والے بدنیت نے فوراً ''گدھا مارکہ'' بیڑی کے نام سے اپنی بیڑی رجسٹر کرا دی۔ چنانچہ اس کا مال دھڑا دھڑ بکنے لگا۔ پہلے والا چونکہ گدھا مارکہ سے گلاب مارکہ بن چکا تھا لہذا اس کی بیڑی بالکل نہ بک پا رہی تھی۔ بہت مجبور ہو کر اس نے اپنی بیڑی کا نام ''اصلی'' گدھا مارکہ رکھ دیا اور خوب بکری کرنے لگا۔ پیسہ انسان کو گدھا مارکہ، بلکہ اصلی گدھا مارکہ بنا ڈالتا ہے۔

خوشگوار بات یہ ہے کہ چینی لوگ پان نہیں کھاتے۔ اس لئے جگہ جگہ تھوکتے نہیں۔ ویسے بھی ان میں اتنی سیوک سنس آ چکی ہے کہ وہ سڑکوں پر ''تھوک بازی'' نہیں کرتے۔ سوٹڈ بوٹڈ رہتے ہیں۔ ان کے دانشور، سیاست دان اور مڈل کلاسیے ڈی کلاس بننے کے بہانے نسوار خوری، تسبیح خوانی اور دس گز کی چادر پوشی نہیں کرتے۔ انہیں اس طرح کی کوئی نفسیاتی بیماری لاحق نہیں ہے۔ یہ شریف لوگ نالیوں کے پاس بیٹھ کر پیشاب بھی نہیں کرتے اور پھر نالی پہ پیشاب فرمانے کے بعد طہارت کو ڈھیلے سے پکا کرنے کی نمائش تو بالکل نہیں لگاتے۔

2۔ ایک بچے والا دیس

چینی ادیبوں کے ساتھ ہماری اس میٹنگ کو ''راؤنڈ ٹیبل کانفرنس'' کا نام دیا گیا تھا حالانکہ یہاں کوئی گول میز تھی ہی نہیں کہ جسکے گرد ہم کانفرنس کرتے۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ یہاں میز ہی نہیں تھی۔ محض تپائیاں تھیں جو عام طور پر بیٹھکوں میں صوفوں کے سامنے رکھی جاتی ہیں۔ کوئی آفشل معاملہ لگتا ہی نہ تھا۔ گپ شپ، ہنسی ٹھٹھہ اور چھیڑ چھاڑ۔

ہمارے سامنے مگ جیسے کپ رکھے گئے جن کے اوپر باقاعدہ چینکوں کی طرح کے

ڈھکنے تھے۔اس کپ میں چند پتے پڑے ہوئے تھے۔ ہمارے بیٹھتے ہی ملازم نے ان میں تھرماس میں سے گرم کھولتا پانی ڈال دیا۔ نہ کوئی چمچہ موجود تھا اور نہ ہلانے کی ضرورت پیش آئی۔اس لئے کہ چینی تھی نہیں آس پاس۔اب ماحول ہی ایسا بنا دیا کہ آپ کو یہی پینی پڑ رہی تھی سب کے ساتھ۔ چائے جیسا گھونٹ لینا پڑ رہا تھا چسکی لے لے کر۔ دل میں سوچا چلو چینیوں کا تو رواج ہے۔ یہ ہم پاکستانی کیوں منافقت کر رہے ہیں؟۔کوئی بھی شخص شکر طلب نہیں کر رہا! دل چاہا کہ میں ہی اجتہاد کر لوں مگر ہمت نہ پڑی کہ جب اتنے بڑے سینئیر جید علماء، ریش والے بھی اور بے ریش بھی، خاموشی سے بغیر دودھ اور بغیر چینی والی "چائے" مزے لے لے کر پی رہے ہیں تو تم بھی چپ رہو۔ چنانچہ چپ تو رہا لیکن قسم کھائی کہ بیرا کو اپنا کپ دوبارہ بھرنے کی سعادت نہ لینے دونگا۔اور وہ بیچارہ پورے سیشن کے دوران ہمارے بھرے کپ کے خالی ہونے کی حسرت میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر تکتا رہا مگر ہم طے کر بیٹھے تھے کہ ایسا تب ہی ہو سکے گا جب سورج مغرب کی طرف سے نکلے گا، ماہی گیر مچھلیاں پکڑنے کی بجائے ان کے ساتھ تیراکی کے مقابلے منعقد کریں، ہندو گائے کا گوشت کھانے لگے اور بلوچ عقل وعلم کی راہ اپنا لے۔ مجھے یقین ہے کہ اس رات کم از کم ایک چینی، اپنی بیوی کو بلوچ کی ضد اور ہٹ دھرمی کو مثالی بنا کر پیش کر رہا ہوگا۔

چینی ساتھی جام پہ جام لنڈھا رہے تھے اور ان کا ساتھ ہمارے نقل خور پاکستانی بھی خوب خوب دے رہے تھے، "مقابلہ ءِ گرم آب خوری!!" چینی لوگ تو عاشق ہیں اس جوشاندہ پر۔صدیوں سے وہ یہ بے ذائقہ مشروب پیتے چلے آئے ہیں۔ انقلاب کے بعد تو بالخصوص اسے پانی کا نعم البدل بنا دیا گیا ہے۔ میں نے سوچا کہ پوچھ لوں کہ وہ لوگ پانی سے متعلق سارے لٹریچر کی نایابی کو کیسے لے رہے ہیں۔شیریں آب، سریاب، آب گم، تانہہ آبی، کا ناب، سارتیں آب۔۔۔جیسے ضرب الامثال سے محرومی کا کیا مداوا رکھتے ہیں۔ پھر سوچا جانے دوس!

ایک لام م۔م بی۔۔۔۔تقریر چینی چیف نے کی اور ایک چو وو ڑی۔۔۔۔تقریر ہمارے سربراہ نے فرمائی۔ یہ دونوں ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ان دونوں کے عین پیچھے درمیان میں ترجمان بیٹھے تھے اور ایک کے چینی فقرے کو انگریزی میں اور دوسرے کے انگریزی فقرے کو چینی میں جگالی کر رہے تھے۔ کہتے ہیں کہ جنگل کا بادشاہ خالص گوشت کی ضیافت کھائے بغیر وہاں سے اُس وقت سرپٹ بھاگ کھڑا ہوا جب اسے کان میں بتایا گیا کہ کھانے کے بعد تقریر کرنی پڑے گی۔ اب اکیسویں صدی میں یہ کام سامعین کو کرنا چاہیئے۔۔۔۔

"ہماری دوستی ہمالیہ جتنی اونچی ہے، سمندر جتنی گہری ہے" سن سن کر کان پک گئے مگر یہ دوستی نہ ہمیں عقل دے سکی، نہ روشن فکری عطا کر سکی، نہ ہم دو ٹکڑے ہونے سے بچے، نہ یہ دوستی ضیاء الحق کی رجعت کیخلاف ہماری چھتری بنی۔ پتہ نہیں ہم سخت جان ہیں کہ اثر نہیں لیتے یا پھر یہ دوستی اس قدر نیم جان ہے کہ ہمارا کچھ بھی بگاڑ نہ سکی۔

سوال ٹکا کے کیا اظہار الحق نے: " آپ کے ہاں خاندانی منصوبہ بندی جاری ہے اور ایک بچہ فی خاندان کا حکم ہے۔تو اس طرح تو جو واحد بچہ یا بچی ہوگی وہ (اور چینی زبان بھی) بھائی،، بہن، بھابی دیور، بھانجا، بھتیجا، بہنوئی، سالے جیسے الفاظ سے تو محروم اور نا آشنا ہونگے۔کیسا لگتا ہے یہ سب کچھ؟"۔

جواب ملا کہ خاندانی منصوبہ بندی ریاست کی بنیادی پالیسی ہے یہ محض مصلحت نہیں۔ یہ محض سرکار کی سختی نہیں ہے جسکی وجہ سے یہ قائم ہے۔آج نوجوان لڑکے لڑکیوں کو سیکس ایجوکیشن کے وسیع مواقع حاصل ہیں۔اُن تمام روایت زدہ ممنوعات سے پردہ اٹھتا جا رہا ہے جو جنس اور جنسی عمل سے متعلق تھیں۔جنس اور جنسی عمل اب پراسراریت کے بادلوں سے باہر آ رہے ہیں۔ اس شعبے میں معلومات کو شرم، جھجک اور خفیہ رکھنے کی بجائے اب اداراتی حیثیت حاصل ہو رہی ہے۔اس کے نتیجے میں بے علمی، یا جہالت پہ مبنی معلومات اور مفروضے ختم ہوتے جا رہے ہیں۔اور نوجوان لڑکے لڑکیاں بچے کی پیدائش سے متعلق تمام فیصلے تعلیم یافتہ انداز میں کرنے لگے ہیں۔

یہ قانون شہروں میں نافذ ہے۔ کچھ نسلی اقلیتوں اور دیہاتوں میں دو یا زیادہ بچے پیدا کرنے کی اجازت ہے۔ اس پالیسی کو جاری رکھنے کے لئے بہت سی ترغیبات دی گئی ہیں۔ اور جو شہری، ایک سے زیادہ بچے پیدا کرنے کی خواہش کو بالکل بھی دبا نہ سکے تو اسے ان سہولیات سے دستبردار ہونا ہوگا۔

چین کی پوری آبادی کا 60فی صد دیہی علاقے میں رہتی ہے۔ اور 40فی صد شہری علاقہ میں۔ چینی حکومت سال 2020 تک اس آبادی کو بڑھا کر 50فی صد تک پہنچانے کا منصوبہ بنا چکی ہے تا کہ لوگوں کا معیارِ زندگی بہتر ہو۔ یہ آبادی کسی نقل مکانی یا شرح پیدائش میں اضافہ سے تبدیل نہ ہوگی۔ بلکہ چینی حکومت دیہاتوں میں ساری سہولیات منتقل کرتے رہنے سے ایسا کر رہی ہے۔ ان کی یہ ''اربنائزیشن پراسیس'' جن اصولوں پہ چل رہی ہے اس میں تدریج، توانائی کی بچت، ماحولیاتی بحالی، معاشی فعالیت اور سماجی توازن شامل ہیں۔ ان کے نظریہ کے مطابق اربنائزیشن معاشی اور سماجی ترقی کا حتمی رجحان ہوتا ہے۔ نیز یہ صنعت کاری اور ماڈرنائزیشن کی اہم نشانی ہے۔ میں بالکل حیران ہوگیا کہ یہ لوگ دیہاتوں کو شہر بنا رہے ہیں اور ہم جو ان کے سب سے بڑے قصیدہ خواں اور دوست ہیں، بالکل الٹ کر رہے ہیں۔ ہم نے شہروں کو دیہات بلکہ قبیلہ بنانا شروع کر دیا ہے۔ ٹرائبلائزیشن آف خضدار، ٹرائبلائزیشن آف کوئٹہ حتیٰ کہ ٹرائبلائزیشن آف کراچی!!۔ ہم اچھے لوگ ہیں۔

خاندانی منصوبہ بندی کی اس پالیسی کو ربع صدی ہو چکے ہیں۔ بہت سارے لوگوں کا خیال ہے کہ یہ محض شرح پیدائش میں کمی کا پروگرام ہے۔ حالانکہ یہ پوری آبادی کی صحت کی بہتری، روزگار میں اضافہ، معیارِ زندگی میں بڑھوتری، لیگل نظام اور انسانی ترقی پہ مبنی منصوبہ بندی کی ہمہ گیر پالیسی ہے۔ آج چین میں اوسط عمر 72 سال ہے۔ چینی آبادی کی کوالٹی بہت بہتر ہو رہی ہے، اس کا اندازہ کالج سٹوڈنٹس، ہنرمند مزدوروں اور پروفیشنلز کی بڑھتی ہوئی تعداد سے ہوتا ہے۔

اس پالیسی سے شادی، فیملی، سوسائٹی سب کچھ تبدیل ہو رہا ہے۔ فیملی کی ورک فورس کم ہو رہی ہے۔ پھر سماجی مسائل بھی پیدا ہو رہے ہیں۔ بچوں میں بالخصوص اس کے منفی اثرات پڑ رہے ہیں۔ دادا، دادی، نانا نانی اور ماں باپ، خالہ پھوپھی، چاچا وغیرہ پر مشتمل پورے خاندان کا یہ واحد بچہ بے تحاشہ پیار کی وجہ سے بگڑ کر ہٹ دھرم بن جاتا ہے۔ محلّہ بھر میں ایک آدھ بچہ تو واقعی سب کی آنکھوں کا تارا بن جاتا ہے۔ کوئی اسے ٹافی کھلا رہا ہے تو کوئی چاکلیٹ۔ کوئی آئس کریم ٹھونس رہا ہے تو کوئی گود میں اٹھائے پھر رہا ہے۔ بچہ موٹا، خود غرض اور ضدی بن جاتا ہے۔ مگر اس قدر بڑھتی ہوئی آبادی کو روکنے کے لئے ایسا کرنا لازمی ہو جاتا ہے۔ اور یہ پالیسی بہت دیر تک جاری رکھنی پڑے گی۔ اس پالیسی کے تحت دیہی علاقوں میں ایک بچہ یا دو بیٹیوں والے جوڑے کو، جب وہ ساٹھ سال کے ہو جاتے ہیں 72 امریکی ڈالر سالانہ انعام ملتا ہے۔ یہ ادائیگی باقی پوری عمر جاری رہتی ہے۔

دیکھا گیا ہے کہ دیہی آبادی بالخصوص اور عام چینی آبادی بالعموم بیٹا پیدا کرنے کی روایت رکھتی ہے۔ تاریخی طور پر بیٹا اپنے والدین کے بڑھاپے کے وقت بہت مددگار ثابت ہوتا رہا ہے۔ گو کہ آج ترقی یافتہ چین میں یہ تصور تک ممکن نہیں مگر پھر بھی، جب سے ستر کی دہائی میں چین نے یک اولادی پالیسی اپنائی تو اس ترجیح نے کئی والدین کو اس عادت کی طرف دھکیل دیا کہ وہ مادہ بچوں کا حمل ضائع کر دیتے ہیں۔ اب ایسے ڈاکٹروں کو کڑی سزائیں دینے کے لئے قانون سازی ہو رہی ہے جو اس کام میں معاون بنتے ہیں۔

اس لئے کہ اس عمل سے سماج میں پھر ایک عدم توازن پیدا ہونے کا خطرہ پیدا ہوگیا ہے۔ جس میں بچیوں کی پیدائش کے موقع پر حمل ضائع کر کے اور بچے کے وقت پیدائش ہونے دینے سے مرد عورت کا تناسب بگڑ کر رہ جائیگا۔ اعداد و شمار بتانے لگے ہیں کہ اگر اس ملک میں 100 لڑکیاں پیدا ہو رہی ہیں تو لڑکے 119 پیدا ہو رہے ہیں۔ حکومت نے فیصلہ کیا ہے کہ 2010 تک اس عدم توازن کو الٹ دیا جائیگا۔ الٹراساؤنڈ کی سہولت نے چینی

معاشرے کواس عدم توازن کا شکار کر دیا ہے۔

خاندانی منصوبہ بندی کی اس پالیسی کے نتیجے میں ایک چینی خاندان میں بچوں کی اوسط تعداد 1970 میں 5.8 سے گھٹ کر آج 1.8 ہوگئی ہے۔ یہ پالیسی گزشتہ تین دھائیوں سے جاری ہے۔ چینی ادب میں اس سے متعلقہ موضوعات جگہ پا رہے ہیں۔ مرد اور عورت لکھاری اس بارے میں الگ الگ موقف رکھتے ہیں۔ عورت لکھاری Feminism کی طرف دار ہوتی جارہی ہے۔ مرد البتہ اسے برقرار رکھنے کی طرف مائل ہیں۔

یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ چین میں تو یک اولادی کی پالیسی حکومت کی طرف سے لاگو ہے جبکہ صنعتی ممالک میں سماجی و معاشی ارتقاء بتدریج کم اولادی کی طرف لے جارہی ہے۔ اس سے بھی دلچسپ بات یہ ہے کہ چین نے جو ٹارگٹ 25 برس میں پورا کر دیا، مغرب میں اسے حاصل کرنے کے لئے ڈیڑھ سو برس لگے۔

داور صاحب اپنے سوال کی گولی اپنے درہ آدم خیل والی ''بوڑی'' نامی بندوق میں ڈالنے ہی لگے کہ سلیم اختر سے نہ رہا گیا۔ انہوں نے چینی ادب کے موجودہ ٹرینڈز کے بارے میں پوچھا۔ جس کے جواب میں چینی دوست بولے، بولے اور بولتے ہی چلے گئے۔ میں ایک فقرے میں ان کے جواب کا لب لباب آپ کو بتا دیتا ہوں: ''چین کا موجودہ ادب، ریفارم لٹریچر کہلاتا ہے۔''

3۔ ترقی آئے، ترقی نہ آئے

آج کا چینی سماج بحیثیت مجموعی کرپشن کو سب سے بڑا خطرہ سمجھتا ہے۔ سوشلسٹ مارکیٹ اور معیشت کرپشن کو کسی صورت برداشت نہیں کر سکتی۔ کرپشن کے خلاف کاروائی ایسے بڑے افسروں پر جاری ہے جنہوں نے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے غیر قانونی ذاتی مفاد حاصل کیے۔ اس کے لئے ''ڈسپلن انسپکشن محکمہ'' قائم ہے۔

دوستوں نے بتایا کہ چین میں ادب کے اہم ترین موضوعات میں سے ایک ''کرپشن'' ہے۔ کرپشن کے خلاف لڑائی خود کمیونسٹ پارٹی کی حکمرانی کے منصب کی برقراری کے لئے بھی ضروری ہے، اس کی گورننس کی اہلیت کے لئے ضروری ہے۔ چونکہ پارٹی کی سیاسی بنیاد اور اقتدار کا سرچشمہ عوام کی حمایت ہے۔ اس لیے وہ ہر وہ اقدام کرتی رہے گی جو اس کے لئے عوام کی حمایت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کرپشن، پارٹی کی کلاس بنیاد کی دشمن ہوتی ہے۔ اس کی حکمرانی کی اہلیت کو کھوکھلا کرتی ہے۔ پارٹی ایک ایسے نظام پر چل رہی ہے جہاں تعلیم کے فروغ، قوانین کی تعمیل اور نگرانی کے نظام، تینوں کو ملا کر چلایا جائے۔ چینی کمیونسٹ پارٹی سنٹرل کمیشن فار ڈسپلن انسپکشن پارٹی کا چوکیدار ادارہ ہے جس نے 2004 میں 15 وزارتی سطح کے ہائی رینکنگ پارٹی اہلکاروں کو کرپشن کے الزام میں سزا دی۔ 2004 میں پانچ ہزار پارٹی عہدیداروں کو جوا کھیلنے پر سزا دی گئی۔ واضح رہے کہ چین میں جوا کھیلنے پر پابندی عائد ہے۔ کرپشن اور جوا کو چین میں کمیونسٹ دشمن سرگرمیاں گردانا جاتا ہے۔

ہم مہر کے گڑھ سے آئے تھے۔ معاشی، سماجی لحاظ سے پسماندہ ترین خطہ سے۔۔۔ اور چین کی ترقی، دنیا بھر میں تیز رفتار ترین اور مشہور ترین ترقی ہے۔ اسی چین کی مالی تکنیکی امداد سے بلوچستان میں میگا پروجیکٹ شروع کر دیے گئے ہیں۔ اور ان پر کام تیزی سے جاری ہے۔ بلوچستان میں بہت بڑی تعداد میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ان میگا پروجیکٹس کی مخالفت کرتے ہیں، حتیٰ کہ چین کو سامراجی ملک بھی کہنے لگے ہیں۔ میں نے سوچا کہ چونکہ چین خود بھی زبردست معاشی سرگرمیوں سے گزر رہا ہے۔ تو یہاں بھی اس کے حق اور مخالف میں بحثیں جاری ہونگی۔ ہمارا سوال یہ ہے کہ بورژوا معاشی ترقی اور نظریہ سوشلزم کا آپسی رشتہ کیا ہے؟ آپ کے ملک میں معاشی ترقی پہ عوامی ردعمل کیسا ہے اور چینی ادیبوں کی

اکثریت اس زبردست ترقی کے ساتھ کیا رویہ اختیار کئے ہوئے ہے؟

چینی رائٹرز ایسوسی ایشن کے سربراہ کا مدلل اور طویل جواب یوں ہے:

اول: ایک ترقی پذیر معاشرے کے لئے غربت کے خاتمے سے بڑا فریضہ اور کوئی نہیں ہوسکتا۔ ترقی کو فروغ دینا اور اپنی آبادی کے معیار زندگی کو بڑھانا اہم ترین فریضہ ہے۔ چین میں دو تین طریقوں سے اس ترقی کی مخالفت ہوتی ہے: ایک تو تیز رفتار ترقی کے اپنے مسائل ہوتے ہیں، اس میں سماج اتھل پتھل کا شکار ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں ایک کنفیوژن ،ایک ہنگامی سی صورتحال اور افراتفری سی پیدا ہو جاتی ہے۔ جس کی طرف دوستانہ رویے پیدا ہونا دشوار ہوتا ہے۔

دوئم: تیز رفتار ترقی مغربی طرزِ زندگی در آنے کے احتمال سے جڑی ہوتی ہے۔ اس لئے مغرب اور مغربیت کا خوف چھا جاتا ہے۔

سوئم: مندرجہ بالا دو نسبتاً حقیقی مسائل کو وہ لوگ بڑھا چڑھا کر پیش کرتے ہیں جنہیں موجودہ حالت میں فائدہ رہتا ہے۔ ان حالات میں کسی قسم کی تبدیلی ان کے مفاد کو برباد کر کے رکھ دیتی ہے۔ اس لئے ''سٹیٹس کو'' رکھنے والی قوتیں ترقی کی مخالفت کرتی رہتی ہیں۔

انہی تین موضوعات سے ادیب نمٹتا ہے۔ چینی لکھاری بالعموم ترقی کے حق میں ہے ۔ انسان کو بھوکا نہیں رہنا چاہیے، اسے پسماندہ نہیں رہنا چاہیے، اس کی سہولتیں بڑھتی رہنی چاہئیں، اسے آسودہ ہونا چاہیے، بہت آسودہ، بہت آسودہ۔ اور اس آسودگی سے پیدا ہونے والے مسائل سے نمٹتے ہی رہنا چاہیے۔ یہی موضوعات چین کے موجودہ ادب کے ہیں۔

ہم نے اپنی اپنی قومی زبانوں اور ادب کے بارے میں بتایا۔ عام چینی دوستوں کا خیال ہے کہ پاکستان میں فقط ایک اردو ہی بولی جاتی ہے۔ مگر وہ ہماری قومی زبانوں کی قدامت، ان کے دامن کی وسعت اور امیری دیکھ کر حیران رہ گئے۔ سچی بات یہ ہے کہ مہر گڑھ کی قدامت بلوچ قوم کی وحدت، بھائی چارے، وجہ تفاخر اور اس کی ثقافت و تہذیب و زبان کی بے نظیر وسعت کی ضمانت ہے۔ دنیا بہت دلچسپی سے اس قدیم عجوبے کے بارے میں سنتی ہے۔

تحفوں کے تبادلے ہوئے۔ ہم ہی نے دیئے۔ پورا زمبیل جو بھر کے لائے تھے۔ پھر دوستوں نے اپنی اپنی کتابیں انہیں تھمادیں، تصویر بازی ہوئی اور اس کے بعد ایسوسی ایشن کی طرف سے عشائیہ دیا گیا۔ عشائیہ کیا یہ تو مغربیہ تھا۔ ہمارا جلد باز ملّا روزہ اسی وقت کھولتا ہے۔ چھ بجے شام تو ہماری بھیڑیں اپنے جُب (باڑھ) میں بھی نہیں گھستیں کہ چینی، انسانوں کو کھانے پر بٹھا دیتے ہیں۔ یہاں انتیس ڈشیں آئیں۔ زبردست قسم کی مچھلی آئی۔ باقی سبزیاں تھیں یا پھر سبزیوں کی خالہ زاد پھوپھی زاد ڈشیں۔ ہم نے بھی بے حساب کھایا کہ محبوب سے کیا حساب کیا کتاب۔ ان کے ہاں انگور کالا ہوتا ہے اور سائز میں ہمارے ہاں کے درمیانے سائز والے لیموں کے برابر کا۔ اور یہ انگور اچھے خاصے میٹھے ہوتے ہیں۔ پر اصل مٹھاس تو چین کے تربوز میں ہوتی ہے۔ لب دوز مٹھاس ہوتی ہے یہ۔

4۔ وہاؤءَ نیلی مناں

رات کو واپس اپنے ہوٹل ہانکے گئے۔ لفٹ پر تھے ورنہ انیس منزلیں کون پیدل چڑھ سکتا ہے۔ یہاں کے ہوٹلوں میں کمروں کی چابیاں نہ تھیں۔ بلکہ کالنگ کارڈ جیسے کارڈ تھے جن پر خفیہ کوڈ نمبر موجود تھا۔ آپ یہ کارڈ دروازے پر بنی ایک درز میں ڈال دیں۔ اگر کوڈ نمبر صحیح ہوگا تو دروازہ کھل جائے گا، ورنہ لگے رہیں کچھ نہ ہوگا۔ دوستوں نے ایک دوسرے کو اس چابی کا استعمال سکھایا۔ اندر گئے تو باتھ روم دیکھ کر سب نے بے بسی سے کہا یہ نلکے نہیں کھلتے۔

یہ نکلے واقعی بہت مہنگے ہوٹلوں والے تھے۔۔۔ پیچیدہ اور گرم وسرد، شاور وغیرہ کے لئے مخصوص ۔اپنی ساری مبلغ معلومات ایک دوسرے کو بتائیں، ہر ایک نے اپنی مستری گیری آزمالی اور بالآخر کامیاب ہوگئے۔

ایک سینئر ساتھی نے ایک دوست کو بالخصوص الماری میں رکھی بوتلوں کی قطار کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ ضرور بتایا کہ دیکھیے اسے منی بار کہتے ہیں۔اس میں جو یہ بڑی چھوٹی اور درمیانہ قد کی جاذبِ نظر، ڈیزائن شدہ خوبصورت بوتلیں رکھی ہوئی ہیں، یہ شراب کی ہیں۔اور انہیں پینے سے نشہ بھی ہوجاتا ہے۔اور ان کی قیمت بھی خود دینی پڑتی ہے۔اور یہ قیمت عام بازار سے دس گنا زیادہ ہوتی ہے۔اس نے تو شکریہ ادا کیا اور نصیحت پر مکمل عمل کیا ۔مگر وفد میں جو شخص برخوردار ترین تھا اس نے اسی رات چینی بیئر کے دو ٹن اپنے کمرے کے منی بار سے نوشِ جان کر لئے۔

ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ چینی لوگ پانی نہیں پیتے۔اس لئے انہوں نے کمرے میں چائے، کافی اور گرم پانی بنانے کے لئے سامان رکھ چھوڑا ہوتا ہے۔ہم بہت مزے میں تھے۔ جب بھی نیند نہ آتی ہم جا کر ایک کپ کافی بنا لیتے اور لطف لیتے۔البتہ یہاں منرل واٹر کی بوتلیں بھی رکھی ہوئی تھیں۔اور منرل واٹر کی بوتل کے پیسے دینے ہوتے۔ہمارے ایک آدھ ساتھی ہر شہر میں ایک ایسی بوتل بازار کی عام دکانوں سے خریدتے تھے اور پانی پی کر ختم کرنے کے بعد بہت بڑے بڑے ہوٹلوں میں حاجت دفعان کرنے کے بعد اس سے طہارت کا کام لیتے تھے۔اور جب ہم نے بیجنگ سے اگلی منزل پہ جانے کے لئے ہوٹل کا کمرہ خالی کیا تو ان دوستوں کے کمرے میں پڑے اس منرل واٹر کی خالی بوتل کے پیسے بھی بل میں ڈال دیئے گئے، ہم نے ہزار حجتیں کیں کہ یہ بوتل تم لوگوں کے ہوٹل کی نہیں ہے۔مگر اب ہم انہیں کیا بتاتے کہ کس مقصد سے یہ بوتل ساتھ رکھی جاتی ہے۔سو اپنی ہی خالی بوتل کے لئے دس گنا بھاری قیمت ہمارے دوستوں کو ادا کرنی پڑی۔تہذیبوں کا یہی فرق تو زندگانی ہے۔

ہر باتھ روم میں ڈسپوزیبل دو ٹوتھ برش رکھے تھے۔باڈی لوشن، ریزر، شیمپو، بیشمار عطر کی چھوٹی بوتلیں رکھی ہوئی تھیں۔بیشمار ٹاولز بھی تھے۔دو چھوٹے سائز کی سفید کنگھیاں بھی تھیں۔معلوم نہیں کنگھی کی ایجاد سے قبل حضرت انسان اپنی داڑھی کو کس طرح خوبصورت رکھتا ہوگا!!۔

عوامی جمہوریہ چین میں یہ ہماری پہلی رات تھی اور دس بجے ہی یاروں نے ہمیں بستر پر دھکیلنے کی کوشش کی تھی۔ پتہ چلا کہ چین میں دس بجے تک جاگنا گویا شب بیداری تصور ہوتی ہے۔ہم بہت مشکل میں پڑ گئے۔دماغ میں نیند کا اپنا ایک مرکز ہوتا ہے جو کہ روزمرہ کی عادتوں پہ ایک خاص ٹائم پہ فکس ہو چکا ہوتا ہے اور جب تک چھ سات دن اس فیڈ کئے گئے ٹائم کو نہ چھیڑا جائے۔یہ ٹائم اسی طرح کام کرتا رہتا ہے۔اب آج پاکستان میں ہمارے **11** بجے والے سلیپ سینٹر کو دس بجے سونے کا کہا جا رہا تھا۔(لیکن ہمارے دماغ کے لحاظ سے یہ تو رات کے دس بھی نہیں تھے۔بلکہ شام کے سات بجے تھے اس لئے کہ سلیپ سنٹر میں چین کی بجائے پاکستانی وقت فیڈ تھا)اور سات بجے تو سر شام ہوتی ہے۔چھ ماہ کے بچے بھی مغرب کو نہیں سوتے اور ہم تو مستند قسم کے دانشور اور ادیب تھے۔لہٰذا چین اپنی سابقہ وقتوں کی گراں خوابی ہم پہ مسلط نہیں کر سکتا تھا۔اور ہم پاکستانی وقت کے مطابق گیارہ بجے اور چینی وقت کے مطابق دو بجے رات تک تو نہ سو سکتے تھے۔اوپر سے سفر کی تھکن، نیا ماحول، سرگرم اور تیز رفتار مشاہدات اور دیگر ہیجان انگریز ذہنی خلفشاری حالت کے ہاتھوں سو نہ پا رہے تھے۔نیز دن بھر کی مصروفیات کے، لیے گئے نوٹس پر مشتمل سفرنامے کا مضمون بھی لکھنا تھا۔۔۔اس لئے ہم تقریباً ساڑھے تین بجے جا کے سو سکے۔

دیوارِ چین

1۔ ڈاکٹر نہیں، پٹواری بن جاؤ

صبح وقتِ مقررہ پہ جاگے۔ دوستوں کے کمروں کے ٹیلیفون نمبر ہمارے میزبانوں نے کمپیوٹر پرنٹ کر کے دے رکھے تھے۔ سارے دوستوں کو رنگ کیا۔ جو جاگ رہا تھا اس نے سینہ ٹھونک کر اپنی سحر خیزی جتائی اور جو سو رہے تھے انہوں نے شکریہ کہا۔

چائے کا پیالہ پیا، اور پھر تیاری میں لگ گئے۔ تیزی تیزی سے گرم زیر جامے پہنے ،کوٹ پتلون ٹائی اڑسائی ۔اس کے بعد جوس اور مکھن انڈوں سے ناشتہ کیا ۔ہم نے باقی چیزوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا کہ ہر چیز مینڈک نظر آتی تھی، ہر ڈش چھپکلی کی لگ رہی تھی۔ ناشتے کے بعد دوڑتے بھاگتے کوسٹر میں آن ٹھُس گئے۔۔۔کہاں؟۔۔۔ایک دیوار دیکھنے۔ اب بھلا دیوار بھی کوئی دیکھنے کی چیز ہوئی۔ میرے بوڑھے ماموں مرحوم حاجی ملا محمد نے تو برسوں قبل میرا مذاق اڑاتے ہوئے کہا تھا: ''ڈاکٹری پھر کیا بکواس ہوئی، اتنا پڑھ لکھ گئے مگر پٹواری نہیں بن پائے''۔

آج بھی ہزاروں میل سفر کر کے ''دلیل شادیھان'' کی اولاد ایک دیوار دیکھنے جا رہی تھی۔ بودلا، سادہ، گنوخ۔

مگر دیوارِ عظیم تو چین کا ایک مقدس قومی نشان بن چکی ہے۔ چینی عوام کے دلوں میں اس کے لئے ایک خاص مقام موجود ہے۔ یہ چین کے قومی افتخار اور قوت کا ایک سرچشمہ ہے۔ اسے عالمی ورثہ قرار دیا جا چکا ہے۔ اس لئے ماما ملاّ! یہ محض ڈاکٹری تو نہیں، یہ محض دیدارِ دیوار تو نہیں!!۔

2۔ مولوی آن لائن

راستے میں ہمیں چینی بڑی تعداد میں اخبار پڑھتے ہوئے ملے۔ ان کے اخبار ہمارے ہاں کے اخباروں کی طرح وسیع و عریض نہیں ہوتے بلکہ وہ ''سنگت'' رسالے کی سائز کے ہوتے ہیں۔ ان کا اخبار پڑھنے کا طریقہ بھی بہت دلچسپ ہے۔ یہاں راستے میں سڑک کے ساتھ ساتھ فٹ پاتھ پر شیشے کے پیچھے بڑے بڑے بورڈوں میں بند اخبار اور دیگر پڑھنے والا مواد چسپاں کیا جاتا ہے۔ اور لوگ آتے جاتے یا بس کے انتظار میں اپنی پسند کی چیزیں چھوئے بغیر پڑھتے ہیں۔ جیسے کالج یونیورسٹی کے نوٹس بورڈ ہوں۔ یہ بورڈ اس قدر زیادہ ہیں کہ دھکم پیل کی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔ اور پڑھنے والے اتنے کہ دن کے کسی بھی پہر وہاں کوئی نہ کوئی قاری ضرور ملے گا جو اخبار بینی کر رہا ہوگا۔

چین میں دو ہزار رجسٹرڈ روزنامے چھپتے ہیں اور تیس ہزار رسائل۔ ''ژن ہوا'' عوامی جمہوریہ چین کی قومی نیوز ایجنسی ہے۔اس ماڈرن سوشلسٹ نیوز ایجنسی میں سات ہزار انسان کام کرتے ہیں۔اگلے فقرے کے لئے میں آپ کی توجہ چاہتا ہوں:۔۔۔۔۔چین میں تین سو قومی ٹی وی چینلز ہیں۔آپ جب بھی ٹی وی لگانے بیٹھ جائیں تو CC TV نمبر ایک، نمبر دو۔۔۔بس چینل بدلتے جائیں یہ سلسلہ چلتا ہی رہیگا۔کہیں خبریں ہیں، کہیں گانے ہیں ، کہیں جوڈو کراٹے والا مارشل آرٹ ہے۔کہیں فلمیں، ڈرامے ہیں۔کہیں معاشی سماجی موضوعات زیرِ بحث ہیں۔کہیں مخاطب اندرونِ چین کے ناظرین ہیں تو کہیں یہ صرف خارجی ناظرین کے لئے ہیں۔CCTV-9 دنیا بھر میں انگلش بولنے اور سمجھنے والے ناظرین کے لئے مخصوص ہے۔ایک چیز خصوصاً قابل ذکر ہے کہ ان کی نشریات میں عریانیت اور ہلکے پن کا، کہیں کوئی شائبہ تک نہ تھا۔حالانکہ چینی چینلز پہ ملٹی نیشنلز کے کمرشلز (اشتہارات) کی بھرمار ہے۔

چائنا ریڈیو انٹرنیشنل (CRI) چالیس بیرونی زبانوں میں پروگرام نشر کرتا ہے۔یہ 35 برس سے اردو پروگرام بھی جاری رکھے ہوئے ہے۔مگر چونکہ یہ بلوچی پروگرام نشر نہیں کرتا اس لئے ہم سب پاکستانی اسے نہیں سنتے۔

چینی زبان میں پیپلز ڈیلی وہ روزنامہ ہے جو ''پندرہ'' لاکھ کی تعداد میں چھپتا ہے۔ جی ہاں پندرہ لاکھ۔۔یہ چینی کمیونسٹ پارٹی کا ترجمان ہے۔یہ اخبار انگریزی میں انٹرنیٹ پہ بھی موجود ہے۔

انگریزی کا واحد اخبار ''چائنا ڈیلی'' ہے جو تین لاکھ کی تعداد میں چھپتا ہے۔8 سے 10 صفحات پر مشتمل اس اخبار کو چین میں موجود سفارتی لوگوں کے علاوہ سیاح، بزنس مین اور بڑی تعداد میں چینی لوگ بھی پڑھتے ہیں۔

اخبارات حکومت ہی کی طرف سے چھپتے ہیں۔یہاں کوئی ''عالم آن لائن''، ''الف''، ''قیامت قریب ہے''، ''دینی مسائل''۔جیسی جیو، اے آر وائی اور نوائے وقت والی جہالت پھیلانے والے پرائیویٹ ''آزادیِ تحریر'' کے نادر نمونے نہیں پائے جاتے۔

3۔ملکِ ختا کی ترقی

ہم عرصے سے قراۃ العین طاہرہ کا ایک شعر گنگناتے رہتے تھے:

نہ چو زلفِ غالیہ بار او، نہ چو چشم فتنہ شعارِ او
شدہ نافعہ بہمہ ختن، شدہ کافری بہمہ ختا
(نہ اس کی معطر زلف کا سا کوئی نافہ سارے ختن میں ہوا ہے
نہ ہی اس کی فتنہ شعار آنکھوں کا سا کوئی ملکِ ختا میں ہو گزرا ہے)

مگر ہمیں کبھی معلوم نہ تھا کہ چین کا قدیم نام CATHY تھا جو بدلتے بدلتے ''ختا'' بن گیا۔ملکِ ختا کی کافر آنکھیں اور معطر زلفیں تو قراۃ العین نے نہیں دیکھیں، ہم نے بھگتی ہیں۔۔۔۔۔مگر۔۔۔مگر۔۔۔۔ہم حدِ ادب کے سبب شہید قراۃ العین سے کوئی بحث نہیں کرینگے۔

ہم آج اس ملکِ ختا کی عجوبہِ عالم دیوار دیکھنے جا رہے تھے۔بیجنگ شہر سے گریٹ وال (دیوارِ عظیم) 75 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے اور یہ ڈیڑھ گھنٹے کا سفر ہے۔ہمیں پورا ایک گھنٹہ تو شہر سے نکلتے نکلتے لگ گیا۔اور بقیہ آدھا گھنٹہ مضافات اور دیہی علاقہ دیکھنے کو ملا۔ قارئین!، میں چین کی تعریف میں بہت قناعت سے کام لے رہا ہوں۔اس قدر منظم ترقی ،اس قدر متوازن ترقی، اس قدر ہارمنی میں ترقی، اس قدر ماحول دوست ترقی بعد از قیاس

ہے!!۔۔۔۔ بہت خوبصورتی ہے، بہت صفائی ہے، بڑی شجر کاری ہے اور بے نظیر ڈسپلن ہے۔ ٹریفک میں کوئی مسئلہ نہیں، کوئی ٹوُ ٹوُ نہیں بجتا، کوئی ہارن نہیں پٹتے، کوئی شرابی ڈرائیور نہیں، کوئی خرمستی دکھانے والی فیوڈل خلاف ورزی نہیں ۔۔۔۔ کشادہ دورویہ سڑکیں ہیں، بورڈوں اشاروں سگنلوں سے مزین سڑکیں۔ انہوں نے کوئی حالی روڈ، کوئی حفیظ جلندھری روڈ اور لیاقت روڈ نہیں پال رکھے۔ نہ ہی ضیاء الحق کی طرح ایمان کے جوش میں آکر سڑکوں شہروں کے نام بدل دیے ہیں۔ ان لوگوں نے وہی پرانے نام ہی بحال رکھے ہیں۔ فطرت کی مہربانی سے سبزہ اس قدر ہے کہ جہاں دیکھو لگتا ہے کہ خوبصورت جنگل میں سے گزر رہے ہوں۔ یہ مستقبل قریب میں شہر میں ڈھل جانے والا دیہی علاقہ تھا۔ ہم چلتے رہتے ہیں۔ فطرت کی استادی سے قائم مناظر کی مکمل گرفت میں۔ سلیم اختر یا اظہار الحق صاحب کے کسی سوال کے جواب میں جنکشی یو کے طویل جوابات اور ترجمان ہانس کے انگریزی ترجمے کی رننگ کمنٹری سنی ان سنی کرتے ہوئے ''دیمار واں منزل جناں'' تھے کہ دفعتاً مجھے پہاڑ نظر آئے اور ان پہ سفید لکیر بھی۔ جیسے پہاڑوں پہ بل کھاتا ہوا سفید اژدھا ہو۔ ''ارے وہ دیکھو! دیوارِ چین، وہ دیکھو''۔ میں بچوں کی طرح چیخا۔ یقیناً جنکشی یو نے مجھے ادیبوں کی صف سے تو کیا، بالغوں کی صفوں سے بھی خارج کر دیا ہوگا۔

سچی بات یہ ہے کہ ہم ان دونوں چیزوں کا دعویٰ بھی نہیں کرتے۔ بس ہم پھنس گئے تھے۔ گو کہ طبعی طور پر ہمارے ذہن و دماغ پر سے وقت کی پانچ دہائیاں گزر چکی ہیں مگر جب شیخ سعدی جیسا جید صوفی و ولی اللہ چالیس برس کی عمر میں بھی طفلی حالت سے نہ نکل سکا تھا تو مجھ عام آدمی کی کیا بلوغت، کیا بزرگی!!۔ اور ہم تو ادیب بھی حادثاتی ٹھہرے کہ گل خان و آزاد و عطا شاد و خدائیداد گو ہر ملک و مراد ساحر مر گئے، ان کے پسماندگان کے دالان میں ہم ہی رہ گئے۔ آپ کو تو بچپن والا لطیفہ یاد ہے نا کہ بچے نے کلاس میں تیسری پوزیشن حاصل کی تو والدین نے خوب مٹھائی بانٹی۔ پتہ چلا کہ اس کی کلاس میں کل بچے ہی تین تھے۔

اور پھر ساٹھ کتابوں کے نیچے ہانپتے کانپتے کراہتے سلیم اختر کے سامنے کوئی کیا ادیب بنے گا، کیا دانشور کہلائے گا۔ لہٰذا ہم نہ تو ادیبوں کی طرح کا بناؤ سنگھار کر سکے اور نہ ہی بالغوں جیسے رکھ رکھاؤ پیدا کر سکے۔

ہمارے جنکشی یو آج خاص یونیفارم میں تھے۔ چونکہ وہ ایک بار پاکستان آ چکے تھے اس لئے یہاں سے قرہ قلی ٹوپی جسے عرفِ عام میں جناح کیپ کہتے ہیں خرید چکے تھے۔ آج اس کی نمائش کا وقت تھا۔ کہ ہم پاکستانی لوگ ان کے مہمان تھے۔ ہم سب نے ان کی پاکستان دوستی کی تعریف میں تالیاں بجا دیں اور با جماعت سکھوں کے ''واہے گرو'' کہنے کے انداز میں ''واہ واہ'' کہا۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ ہم میں سے کوئی بھی مسلم لیگ کا نہ تھا۔ نہ ق کا، نہ ن کا، نہ کونشن والا، نہ فنکشنل والا۔ اور پھر یہ جناح کیپ ہم میں سے کوئی قوم بلوچ، پنجابی، پشتون اور سندھی نہیں پہنتی۔ لیکن ہم اسے یہ سب کچھ کیوں بتاتے؟؟۔

4۔اوھیل

کہتے ہیں کہ دیوارِ چین انسانی ہاتھوں کا بنایا ہوا وہ واحد شہکار ہے جو چاند سے بھی دکھائی دیتا ہے۔ یہ مقولہ شاید اتنی کثرت سے ہماری بصیرت و سماعت سے گزر چکا ہے کہ ہمارے ذہن اسکی نفی قبول کرنے پہ آمادہ نہیں ہوتے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ دیوارِ چین چاند سے نظر نہیں آتا ہے ۔ دیوارِ اعظم کے خلائی دیدار کے دشوار ہونے کی وجہ یہ ہے کہ 3946 میل طویل ہونے کے باوجود یہ محض چند میٹر ہی چوڑی ہے اور اپنے اردگرد کی چٹانوں کے رنگ سے ہم آہنگ ہے۔ لہذا چاند جسکا زمین سے فاصلہ تقریباً 237,000 میل ہے سے دیوارِ چین کا دکھائی دینا قطعاً بعید از امکان ہے۔ بہرحال اس بات میں کوئی

شک نہیں کہ دیوارِ چین انسانی محنت کی ایک معجزاتی تعمیر ہے۔

آیئے دیکھتے ہیں کہ اس کی تعمیر ہوئی کیوں؟ ہمارے بلوچ قبائل میں خوشی، غم اور جنگ وغیرہ جیسی ہنگامی خبروں کی فوری ترسیل کا ایک قدیم طریقہ موجود ہے۔ وہ یہ کہ رات کو اونچے پہاڑوں پر مخصوص علامتوں والے بڑے بڑے الاؤ روشن کیئے جاتے ہیں۔ جنہیں اوھیل کہا جاتا ہے۔ انہی الاؤوں سے پورا علاقہ خبر اور خبر کی نوعیت کے حوالے سے منٹوں میں خبردار ہو جاتا ہے۔ یہی طریقہ کم وبیش تمام قدیم اقوام میں مروج رہا ہے۔ یہی کچھ چین میں بھی ہوا۔ پہلے پہل یہ دیوار تیسری سے پانچویں صدی ق م میں ریاستوں کی باہمی جنگوں کے دوران تعمیر ہونا شروع ہوئی تھی۔ چین میں نویں صدی قبل مسیح میں لوگوں نے سرحدوں کے ساتھ ساتھ الاؤ روشن کیئے جانے والے برج تعمیر کرنے شروع کر دیئے۔ اور جب دشمن کے حملے کی خبر ملتی وہ ان میناروں پر الاؤ جلاتے اور اس طرح آس پاس کے سارے علاقے میں خطرے کا فوری اعلان کر دیتے۔ ساتویں صدی ق م میں ''قِن'' کی ریاست کی سرحد کے ساتھ قائم الاؤ والے برجوں کو باہم ملانے کی خاطر ''چُو'' ریاست نے پہلی بار دیوار بنائی۔ یہی چین کی دیوارِ عظیم کا اولین حصہ تھا۔ بعد میں مختلف ریاستیں یکے بعد دیگرے ''ہر کہ آمد عمارتِ نو ساخت'' کے مصداق ایسی ہی دیواریں تعمیر کرتی رہیں۔ پھر جب بادشاہ ''قِن شی ہوآنگ'' نے چین کو متحد کیا تو اس نے ریاستوں کے درمیان قائم دیواروں کو گرا دیا، صرف وہ دیواریں چھوڑ دیں اور انہیں باہم ملا دیا جو شمالی خانہ بدوش لوگوں کے حملوں کی مزاحمت کے لئے تھیں۔ پھر 200 قبل مسیح سے لیکر 220 عیسوی تک یہ دیوار مزید علاقوں تک پھیلائی گئی اور بڑھتے بڑھتے منگ دور سلطنت یعنی سن 1368 سے 1644 تک اس دیوار کی لمبائی 6350 کلومیٹر تک پہنچ گئی۔ ایرانی بلوچستان کے دارالحکومت زاہدان سے پاکستانی بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ تک کا فاصلہ 550 کلومیٹر ہے۔ پھر کوئٹہ سے سبی 160 کلومیٹر، سبی سے ماوند 80 کلومیٹر، ماوند سے ڈیرہ غازی خان 205 کلومیٹر، ڈیرہ غازی خان سے لاہور 450 کلومیٹر، لاہور سے دہلی 650 کلومیٹر۔ کل 2105 کلومیٹر۔ مگر چین کی عظیم دیوار اس پوری طوالت سے بھی تین گنی طویل ہے۔ شیطان کے دادا کے پاس بھی اتنی بڑی آنت نہ ہوگی۔

اس زمانے میں شمالی خانہ بدوش لوگ میدانی علاقوں پہ حملے کیا کرتے تھے۔ ان حملوں والے مقامات کو بند کر کے تاریخی طور پر اس دیوارِ عظیم نے مرکزی میدانی علاقے کے امن کو برقرار رکھنے میں بہت مدد کی۔ اسی کے سبب شاہراہ ریشم پہ ٹریفک بلا رکاوٹ چلتی رہی جس سے چین اور مغربی ممالک کے بیچ معاشی ثقافتی لین دین جاری رہا۔ نیز سرحدی علاقوں پر موجود مختلف قومیتوں کے درمیان امن، تجارت اور تبادلے کو تقویت نصیب ہوئی۔

خوبصورتی میں یہ دیوار دیوانہ بنا دینے والے مناظر پیش کرتی ہے اس لئے کہ یہ عظیم دروں، چکر کھاتی شہری فصیلوں، مضبوط برجوں، دشمن کے قلعوں اور نمایاں وممتاز روشنی کے میناروں پہ مشتمل حسن کی موج سی بن جاتی ہے۔

ہم نے اپنے میزبانوں سے اس کے متعلق الٹے پلٹے سوال کر کے انہیں بیزار کر دیا۔ کچھ اور لوگوں سے پوچھا، کچھ دیوار کے آس پاس کی معلومات اکٹھی کیں، اور کچھ ٹریول گائیڈ خرید کر پڑھے تو بات یہ نکلی کہ تقریباً دس لاکھ افراد (اس زمانے میں چین کی آبادی کا 1/5 واں حصہ) اس کی تعمیر میں لگائے گئے تھے۔ اس ''بے ٹیکنالوجی'' والے زمانے میں، مشکل موسموں میں، عمودی ڈھلوانوں کے ساتھ ساتھ اس دیوہیکل دیوار کی تعمیر کس قدر مشکل تھی، آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں۔

دیوار کے ساتھ باقاعدہ وقفوں میں اینٹوں سے مورچے، مینار یں منارچے اور چوکیوں والے برج بنائے گئے۔ چٹانوں کی کچھ سلیں تو دو دو میٹر لمبی ہیں اور وزن میں ایک ایک ٹن کے برابر۔ ان ساری چٹانوں کو، اینٹوں کو، اور چونے کو پہاڑ پر چڑھانے کیلئے کتنی کمریں ٹوٹی ہونگی!

کہتے ہیں کہ اگر اس دیوار میں استعمال ہونے والی اینٹوں کو پانچ میٹر بلند اور ایک میٹر موٹی دیوار بنانے کیلئے استعمال کیا جائے تو یہ اینٹیں کرہِ ارض کے گرد ایک بار چکر لگانے سے بھی زیادہ ہونگی۔ تاریخ پڑھیے تو معلوم ہوگا کہ دیوار اپنے مقصد کی برآوری میں کامیاب نہ ہوئی۔ یعنی غیر ملکیوں کو حملے سے دور رکھنے کا مقصد۔ حملہ آوروں نے متبادل ڈھونڈ لیا۔ انہوں نے رشوتیں دے دے کر وہ دیوار پار کر لی جسے فوجی زور سے پار نہ کر سکے۔ پیسہ ہرکولیس کی سی طاقت رکھتا ہے۔

5۔ قومی ثقافت کا محافظ نظام

نیا سوشلسٹ چین اُفق پر سرخ سورج کی مانند طلوع ہوا ہے۔ خانہ جنگی اب ماضی کا حصہ بن چکی ہے اور دیوارِ چین تمام چینیوں کی عظمت کی مشترکہ علامت ہے۔ تین سو برس قبل ''منگ'' سلطنت کے زوال کے ساتھ ہی اس دیوار کی تعمیر و توسیع کا عمل بھی اختتام پذیر ہو گیا تھا۔ گزشتہ تین صدیوں کے دوران یہ دیوار بتدریج زبوں حالی کا شکار ہوتی گئی، ایک طرف تو موسمی عوامل اس پہ نشتر زنی کرتے رہے تو دوسری جانب خود چینی ہی اس سے پتھر اکھاڑ کر گھروں سڑکوں کی تعمیر میں استعمال کرتے رہے۔

آزادی کے فوراً بعد چینی حکومت نے اس قدیم قومی ورثے کی مرمت کے لئے فنڈ مختص کئے۔ 1961 میں سٹیٹ کونسل نے تاریخی اہمیت کے حامل چند درّوں کو ریاستی نگرانی میں لے لیا اور اسکی حفاظت و مرمت کے لئے باقاعدہ ایک خاص محکمہ قائم کیا۔ چین کے دروازے بیرونی دنیا کے لئے کھولنے کی پالیسی کے تحت بیجنگ ایوننگ نیوز، بیجنگ ڈیلی اور اکنامک ڈیلی نے جولائی 1984 میں دیوار کی مرمت کے لئے فنڈ اکھٹے کرنے کی صلاح دی، جسے چینی عوام، پارٹی کی قیادت، حکومت اور غیر ملکی ماہرین اور دانشوروں نے خوب سراہا۔ اس ضمن میں جب ''Love china, repair her great wall'' کا نعرہ بلند کیا گیا تو نہ صرف چینیوں نے اس پہ لبیک کہا بلکہ امریکہ، جاپان، برطانیہ، فرانس اور اٹلی سمیت بیس سے زائد ممالک نے دل کھول کے اس فنڈ میں عطیات جمع کرائے، کیونکہ دیوارِ چین ایک قوم کی ملکیت نہیں بلکہ پوری انسانیت کا عظیم ثقافتی ورثہ تصور کی جاتی ہے۔ 1984 میں چین کے قومی دن کے موقع پر بڈالنگ کے مقام پر مرمت و تعمیر کا پہلا مرحلہ مکمل ہوا۔ اس تحریک کے تحت اب بھی دیوار کی دیکھ بھال بھرپور انداز میں جاری ہے، تاکہ چین کی تاریخ کے اس نئے باب میں دیوارِ اعظم اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ چمک سکے۔ یہ دیوار 1987 میں یونیسکو کی جانب سے عالمی میراث قرار دی گئی۔ یعنی میں بھی اس کا مالک، آپ بھی اس کے وارث اور چینی بھی اس کے رکھوالے۔

6۔ تھوڑی دیر ساتھ چلو

ہم بیس کیمپ پہنچے۔ میزبان جنکشی یو وہیں کوسٹر میں بیٹھے رہے۔ ان کی نئی کتاب چھپ کر آ گئی تھی اور وہ شوق سے اسے پڑھ رہے تھے۔ ویسے بھی اتنی سگریٹیں پھونکنے والے کو، اور پتہ نہیں کتنی بار دیوارِ عظیم پہ چڑھنے والے کو بھلا ایک اور مرتبہ دیوار پہ چڑھنے سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔

ہم نے اصرار کیا کہ تھوڑی دیر ساتھ چلو، تھوڑی دیر ساتھ چلو۔ مگر وہ راضی نہ ہوئے۔ سلیم اختر نے ایک بار پھر چلنے کی درخواست کی تو وہ ایک زبردست سلیوٹ مار کر معذرت کر گئے۔ پاکستانی سیاست دان تو یہ بھی نہیں کرتا۔ مگر چینی سفارت کاری تو

دیکھو!! ہم سب نے اصرار کرنا چھوڑ دیا۔ جنکشی یو نے اپنی گھڑی دیکھی اور ''ایک گھنٹہ بعد یہیں ملاقات ہوگی''، کہہ کر ہاتھ ہلا کر ہمیں دیوار پہ لپک کر چڑھنے کو کہا۔ چڑھ بیٹا، رام بھلی کرے گا۔

چونکہ سردی کی بابت یہ لوگ ہمیں پچھلی شام ہی خبردار کر چکے تھے لہٰذا ہم اپنے پشمینہ زیر جامے اور گرم کوٹ پتلون پہن کر روانہ ہوئے تھے۔ یہاں آ کر واقعی خنکی کا احساس ہوا اور دیوار پر تو پہاڑ کی بلندی پہ اچھی خاصی یخ بستہ ہوا چل رہی تھی۔

ہم نے ہوٹل سے روانگی کے وقت چھوٹا تالا سنبھال کر پتلون کی جیب میں ڈال دیا تھا اور راستہ بھر ہاتھ سے ٹٹول کر اس کی موجودگی یقینی بناتے رہے۔ حسن کا فرمان جو تھا، جنون کا ڈسپلن جو تھا، اپنے کوہستان والے سمو بیلی کی پیروی جو تھی۔ ورنہ ہمیں کیا معلوم تھا کہ اس چھوٹے سے تالے کا مصرف کیا تھا اور وطن کی لیلیٰ نے اسے کوئٹہ سے اٹھا کر بیجنگ کے اس پار دشوار پہاڑوں پہ قائم محبتستان تک اٹھائے پھرنے کی فرمائش کیوں کی تھی۔

یہاں بیس کیمپ میں سٹال نما دکانوں کی ایک لائن تھی۔ جہاں دیوارِ عظیم کے آہنی، پلاسٹکی، اور شیشے سے بنے ہوئے ماڈل بک رہے تھے۔ ہوا کے ہاتھوں زلفوں کو پریشان نہ ہونے دینے کے لئے ماؤزے تنگ کیپ بمع سرخ سٹار مل رہی تھیں۔ میں کنجوس نہ تھا مگر عقل میں بات نہ آئی، سو کیپ نہ خریدی۔ یہاں دیوار پر چڑھنے کے لئے ٹیک لگانے کے عصا تھے، کیمرے کی ریلیں بک رہی تھیں۔۔۔۔ ہم ان پر سرسری نظر دوڑاتے ہوئے اوپر چڑھنے لگے۔

سیڑھی کے زینے شروع ہونے سے پہلے ایک بہت بڑا اصل نما پتھر کھڑا دیکھا۔ اس پہ بادشاہ کا قولِ زریں درج تھا۔ بادشاہ اور اقوال زریں!!، واہ سرکارتئ کمال۔۔۔ چین کے لوگ چینی تاریخ و تہذیب کی رٹ لگاتے لگاتے کبھی کبھی تو شاہ پرستی کی حدیں بھی پھلانگ جاتے ہیں۔

قول زریں یہ تھا:

Be in Harmony With Green Nature

اور قارئین! اس میں کوئی شک نہیں کہ پورا پہاڑی سلسلہ سرسبز درختوں سے اٹا ہوا تھا۔ روح تسکین پاتی تھی۔ صاف شفاف اور آکسیجن بھری فضا۔ جیسے مست کا تدڑی ہو، بیہو۔۔۔۔ جیسے جام کا قلات ہو منگو چر ہو۔۔۔۔۔ شہہ مرید کا ڈھاڈر ہو، سبی ہو۔ شیریں آب ہو۔

ہم پانچوں مہمان اور ترجمان ''ہووائی'' دیوار پر چڑھنے لگے۔ سیڑھیاں چڑھنا واقعی دل، گردے، کلیجی، پھیپھڑوں، ٹخنوں، ٹانگوں، گھٹنوں اور کمر کا کام ہے۔ کچھ ہی سیڑھیاں چڑھنے پر ایک پلیٹ فارم پہ ماؤزے تنگ کا قول ایک بڑے پتھر نما بورڈ پر لگا ہوا تھا:

''آپ دیوارِ عظیم پہ آئے بغیر، عظیم بن ہی نہیں سکتے''۔

ہم اب تک اپنے پورے سفر میں ماؤ کا صرف یہی ایک قول دیکھ پائے۔ لہٰذا بہت خوش ہوئے۔ نئی چینی قیادت ماؤزے تنگ سے کچھ بہت زیادہ متاثر نہیں ہے۔ اس لئے آج کے چین میں آپ کو اس بڑے لیڈر کی علامتیں، نشانیاں، مجسمے، اقوال وغیرہ کم کم ہی نظر آتے ہیں۔

تھوڑی دور اوپر جا کر ایک پلیٹ فارم بنا ہوا ہے جہاں پہ کچھ سٹال ہیں جن پر دیوار سے متعلق چیزیں بک رہی ہیں۔ یہاں زبردست فوٹوگرافی کے بعد باقی دوست ہتھیار ڈال چکے۔ ہتھیار نہ ڈالتے تو بے گور وکفن فوت ہو جاتے کیا؟ بے گور وکفن ہی نہیں بے عزیز و رشتہ دار بھی۔ اب بیاسی سالہ یوسفی صاحب، 72 سالہ سلیم اختر 64 سالہ داور صاحب کوہ پیمائی تو کرنے سے رہے۔ چنانچہ بقیہ ہم تین یعنی 56 سالہ اظہار الحق، 23 سالہ مسٹر ہانس (ہووائی) اور میں آگے بڑھے۔ اگلے سٹاپ پر اظہار نے بھی دھونکنی کی طرح چلتی سانس میں اکھڑے اکھڑے الفاظ میں ہتھیار ڈالنے کا اعلان کیا جیسے وقتِ آخر کلمہ پڑھا جاتا ہے۔ اور

اس طرح میں اور چین کا فرزند ''ہووائی'' آگے بڑھے۔ ساتھیوں کا ایک ایک کر کے بچھڑنا ہمیں عجب فلسفیانہ سوچوں کی طرف لے جاتا ہے مگر چھوڑیے، سفر کی بات کیجئے، کارواں کی بات کیجئے۔ مجمعے کی بات کیجئے، انسان کی بات کیجئے۔ ہم کوئی فلسفی تھوڑے ہیں!

دو آدمی خاموشی سے چائے کی چسکیاں لے رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ایک بولا:

''زندگی نیم گرم شوربے کے پیالے جیسی ہے''

''نیم گرم شوربے کے پیالے جیسے؟'' دوسرے نے پوچھا ''کیوں؟''

''مجھے کیا پتہ؟ تمہارا کیا خیال ہے میں کوئی فلاسفر ہوں؟''

7۔ بلوچ کی افلاطونی دانائی

میرا ہم سفر یہ چینی نوجوان ایک اولاد والی فیملی پلاننگ کی سرکاری پالیسی کے تحت پیدا ہونے والے بچوں کی نسل میں سے تھا۔ لہٰذا اس کا کوئی بھائی نہ تھا، بھابی بھتیجے نہ تھے، اس کی کوئی بہن نہ تھی بھانجے بھانجیاں بہنوئی نہ تھے۔ نہ ہی اسے بھائی بہن کے رشتے اور پیار کا اندازہ تھا۔ ہم بلوچ تو ہوتے ہی ماما لوگ ہیں۔ میں نے اس کی زبانی یہ سب کچھ سن کر بے ساختہ بڑی ہی ہمدردی سے اس کی طرف ہاتھ بڑھا دیا اور پنجابی فلموں والی بے بنیاد بڑ لگائی ۔''آج سے میں تمہارا بھائی ہوں!''۔ اس بے چارے کو جب پتہ نہیں کہ بھائی کیا ہوتا ہے تو وہ گرمجوشی دکھاتا بھی کیوں؟ اچھا ہوا کسی اپنے نے نہیں دیکھا ورنہ ہماری شرمندگی قابلِ دید ہوتی۔ اور ویسے بھی تو ہم آٹھ دس دن میں کیا بھائی پن کر سکتے تھے اس کے ساتھ۔ جی ہاں، اس نے بالکل کوئی گرمجوشی نہ دکھائی۔ لگتا تھا کہ دل میں ہنس رہا ہوگا کہ چاکر و گہرام سے لے کر آج تک دنیا میں طویل ترین برادر کشی کی تاریخ رکھنے والا بلوچ، اب سمندر پار کسی دوسری نسل سے بھائی بننے کا عہد و پیمان کر رہا ہے۔ لیکن شکر ہے اسے ہماری خون آلود برادر کُش تاریخ کا پتہ نہ تھا۔

اب چڑھنا بہت دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ ہم بہ مشکل آٹھ دس سیڑھیاں ہی چڑھ پاتے کہ بالکل بے حال ہو کر ستانے کے لئے رک جاتے۔ فوٹو گرافی کرتے یا کسی اور بہانے بیٹھ جاتے۔ ہماری ٹانگیں جواب دے چکی تھیں، گھٹنے آگ کی طرح جل رہے تھے۔ سانس اتنا چڑھ چکا تھا کہ تھوک نگلنے کا موقع نہ ملتا۔ اگر آج ہمیں بچپن کی طرح ایک ہی سانس میں سات مرتبہ:

''آتر بنداں ماتر بنداں۔۔مچیں پوراں تیر بنداں''

کہنے کو کہا جاتا تو سات بار تو کیا ہم آدھ بار بھی نہ بول پاتے۔ اور سانس اکھڑ جاتی۔

ستانے کے ان وقفوں میں ہم نے دیکھا کہ درمیان درمیان میں اس دیوار پر تقریباً 9 انچ کے چوکور سوراخ تھے۔ یہ سوراخ دشمن پہ تیر کمان سے تیر برسانے کے مقصد سے بنائے گئے تھے۔

8۔ مردِ کہستانی

میرا اپنا وطن ہوتا تو ایسے پہاڑ پہ چڑھتے ہوئے بلا شبہ دل جوان ہو جاتا۔ یہاں بھی اگر سانس اجازت دیتی تو ہم چرواہے بن جاتے۔ آوازیں، چوھکار۔۔۔ ڈررر، اووک، چش ۔۔۔۔ مگر عجیب بات یہ دیکھی کہ اس پورے کوہستانی سلسلے میں ایک بھی ریوڑ نظر نہ آیا۔ ہم بھیڑ پالوں کی اولاد کو بھیڑیں نظر نہ آئیں تو چین بمع دیوار ہمارے کس کام کا؟۔

چینی سینکڑوں کی تعداد میں دیوار چڑھ رہے تھے۔ بالخصوص نوجوان لوگ۔ کالج کے لڑکے لڑکیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، ایک دوسرے کو سہارا دیتے، باتیں کرتے، تصویریں کھینچتے، پوز بناتے!۔۔۔۔ روشن حال، و روشن مستقبل والی نئی نسل۔ یہاں بیرونی سیاح بھی

تھے۔ آسٹریلیائی، برطانوی، ایک گروپ انڈونیشیا والوں کا بھی تھا۔ ایک خاتون انڈیا کی بھی تھی۔ ہر ایک تھکاوٹ کے ہاتھوں خود سے بیزار تھا۔ اب تو ہم سب پیرو جوان و بچے و مرد و خواتین دیوار کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے لوہے کی پائپ سے با قاعدہ لٹکنے کی حد تک سہارا لے کر آگے بڑھ رہے تھے۔

عام پہاڑ پر چڑھنا ہوتا تو میں سب پر بھاری نکلتا کہ بلوچستان میں ہم یہی تو کرتے ہیں۔ مگر پہاڑ پہ تو آپ اپنی مرضی سے خم دار موڑ کاٹتے ہوئے بلند ترین چوٹی پر جا سکتے ہیں مگر یہاں تو سیدھے زینے چڑھنے تھے۔ اور زینے بھی آدھ آدھ گز بڑے بڑے۔ رحلتہ الشتاء نہ ہوتے تو کیا ہوتے۔ دل کرتا تھا کہ سید مطلبی فرید آبادی کا مزدوروں کا حوصلہ بڑھانے والا ترانہ گاؤں:

حیّاحیّا
شیر بہادر حیاحیا
زور لگالو
حیّاحیّا
اونچا کرلو
محل سرا کو
پیٹ پلے گا
مہارا تہارا

باغ بنے گا
راجا جی کا
جشن اڑیں گے
حیاحیا
چار مہینے
مہارا تہارا
پیٹ پلے گا

آٹھ مہینے بھوک لگے گی
شیر بہادر بھوک لگے گی
بن کپڑے کے بن لتے کے
آٹھ مہینے بن روٹی کے
شیر بہادر حیاحیا

دام ملیں گے حیاحیا
سود بڑھیں گے حیاحیا
قرض ملے گا حیاحیا
زور لگادو
حیاحیا
شہر بہادر
حیاحیا

مگر یہاں اردو کون جانتا تھا۔ پھر دل میں آیا بلوچی میں نعرہ لگاؤں ''یاراں گیر آریں''۔۔۔۔ اپنی محبوباؤں کو یاد کرو۔ مگر وہ نعرہ ہی کیا جسے دوسرے نہ سمجھ پائیں۔ نعرہ تو ہمیشہ گروپ انکرجمنٹ کے لئے لگایا جاتا ہے۔ انسان اکیلا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک ہمت

کرے تو دوسرا حوصلہ پاتا ہے اور پھر تیسرا اور پھر۔۔۔۔

روشےمس سمبراں
روشےتہ سمبرئے
کل جہاں سمبری
(ایک دن میں اٹھ کھڑا ہونگا
پھر تم اٹھ کھڑے ہو گے
اور، ساری دنیا اٹھ کھڑی ہو گی)
مگر یہاں تو:
گاراثاں ابوبچ مری آنی۔
(میرے قبیلے کے بھائی بند موجود نہ تھے)

اور ایک اکیلا گھڑسوار کیا گرد پیدا کر سکتا ہے۔ چنانچہ اپنے جذبات کو کسی کے ساتھ شیئر کئے بغیر ہی چلتے جانا، چلتے ہی جانا، سلو اینڈ سٹیڈی، بڑھتے رہنا۔۔۔۔حتیٰ النصر۔ اور ہم گرتے پڑتے آخری چوٹی تک پہنچ ہی گئے۔ ہم نے تصویریں کھینچیں، بیٹھے رہے، کسی سے بات کی، کسی سے ہاتھ کا اشارہ کیا مگر آنکھ کا اشارہ نہیں کر سکتا تھا کہ پتہ نہیں اسے یہاں تہذیب کے کس زینے پہ رکھا جاتا۔ بلوچستان میں تو شہادت یقینی ہو جاتی ہے۔ وہاں ہم اسے سیاہ کاری کہتے ہیں۔

9۔ڈیرہ غازیخان کی عورت

پھر ایک خوبصورت ''چین اَن'' ہمارے قریب آ کر ہم سے فر فر انگریزی میں باتیں کرنے لگ گئی۔ یہ کسی ڈلیگیشن کے ساتھ ترجمان تھی جسے وہ تھکا کر پچھاڑ کر نیچے دھڑام کرا کے اب ستا رہی تھی اور ہم سے انٹر پرٹری کرنے لگ گئی۔ اور بقول جام درک: روح کی مانند لطیف، حور کی مانند شہ جمال تھی۔۔۔۔ پتلی، چھوٹی، کیوٹ۔۔۔۔ سکرٹ، پسینہ، چھاتی کے بٹن آکسیجن کی تلاش میں وا۔ صرف اس بات کی دیر تھی کہ کوئی ملاّ میرے لئے دو چار بار ''بسم اللہِ اللہ اکبر'' کا ورد کرے اور میں ذبیحہ دنبے کی طرح پھڑ پھڑاتا پہاڑ کی اس چوٹی پر آسمان سے نزدیک ترین مقام پہ خالق حقیقی سے جا ملوں۔ مگر کم بخت ملاّ گناہوں کا مارا اس قدر ''بلندی'' تک کہاں آ سکتا تھا۔ کہ حرام تو ند مقدسات کی منکرات میں شامل ہے۔ ویسے بھی اس نے وہیں ہمارے وطن میں ''ضرباً ضرباً'' کروانا ہوتا ہے' یہاں کے نقار خانے میں اُس زاغ کی آواز کون سنتا ہے۔ اس چینی ماہ پری نے ہم سے پاکستان کے بارے میں باتیں کیں۔ محبوب بلوچستان کی میٹھی بولی بلوچی کی باتیں کیں۔۔۔۔ اور۔۔۔ اور بلوچی ضرب الامثال، حکایات، مصرعوں اور تاریخی فقروں نے دس منٹ کے اندر دیوارِ عظیم کی برف پگھلا کر رکھ دی۔

مگر ہم تنہا کب تھے۔ ہماری تو ہر حرکت کی نگرانی ہوتی ہے۔ اسی نگراں نے اپنی مقدس مترنم آواز میں اپنا ہی شعر گایا:

پہ دیر و ءِ گندہ عادتیں رناں
سمل ءِ عہداواں نہ بھورنیاں
(ڈیرہ غازیخان کی اِن عورتوں کی خاطر
سمو سے کئے گئے عہد نہ توڑونگا)

اور میں نے بہت ادب بہت عجز سے انہی کا ایک اور شعر دہرایا:

یار ہوانہاں کہ دائما یاراں
سومری چیار روشی نہ پاداراں
(محبوبہ وہ جس کی دوستی دائم رہے
یہ حسینائیں چار روز بھی ساتھ نہیں نبھاتیں)

ہم نے افتخار صاحب کے اولمپس کیمرے سے اس کی تصویر کھینچی، اس کے طفیل مناظر کی تصویر کھینچی، اسی کے طفیل وہاں پہ موجود دوسرے لوگوں کی تصویریں کھینچیں۔ اس نے پوچھا یہ تصویریں اس تک کیسے پہنچیں گی۔ ہم نے اسے بتایا کہ میں اس کی تصویریں "" "ہانس" کے ای میل پر بھیج دونگا۔ اس سے لے لینا"۔ اس نے جیسے کہا ہو"ہانس کی ایسی کی تیسی"۔ جھٹ سے میرے نوٹس والا کاغذ مجھ سے جھپٹ لیا، اور اپنے بال پین سے اپنا ای میل ایڈریس لکھ دیا اور ریکٹر سکیل پہ آٹھ درجے والا یہ فقرہ کہا:

Remember, a girl met you on Great Wall

میں نے تصحیح کی:

A pretty girl met me on the great wall

اس لڑکی کا اصل چینی نام تو میں نہیں جانتا۔ البتہ اس نے اپنا انگریزی نام **Sherry** لکھ دیا۔ یہاں اس ملک میں لڑکے لڑکیاں دو دو، اور، بسا اوقات تین تین نام رکھتی ہیں۔ ہمارے "ہوائی" کا انگریزی نام تھا، **Hans**۔ آگے بھی جو نوجوان یا نوجوانن ہمیں ملتے گئے، اپنا انگریزی نام ضرور بتاتے رہے۔

یہاں چین میں ہمارے وطن پاکستان کے بارے میں ہر کوئی جانتا ہے، اس کی عزت کرتا ہے، اسے دوست سمجھتا ہے۔ لڑکی نے بات اور ساتھ ختم کرنے نہ دیا۔ میرے بارے میں بہت سے باتیں پوچھیں اور پھر کہنے لگی "دیوار چڑھتے ہوئے تم نے دیوار کے ساتھ لگی بڑی آہنی زنجیر دیکھی؟"۔ میں نے نفی میں جواب دیا تو اس نے کہا واپسی پہ میں وہاں تک تمہارے ساتھ جاؤنگی۔ ہم واپس اترنے لگے تو اس نے کچھ کہے بغیر ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے چلنے کی فرمائش کی۔ ہمیں یہیں اسی جہاں دوزخ کی آگ یاد آئی اور اپنا ہاتھ اس میں پکوڑے بنتا نظر آیا۔ ہم نے مومنانہ کمال سے ایسا نہ ہونے دیا اور اسے ادھر ادھر کی باتوں میں لگا کے چل پڑے۔ اور جب ہم کئی زینے نیچے اترے تو واقعی دیوار کے ساتھ ساتھ ایک زنجیر فرش پر پڑی تھی اور اس کے ہر کڑے پر چھوٹے چھوٹے تالے لگے ہوئے تھے۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑا اور بتانے لگی کہ یہاں محبت کرنے والے جوڑے آتے ہیں اور زنجیر پہ اپنے نام کا تالا لگا لیتے ہیں، اس عقیدے کے ساتھ کہ اس عظیم دیوار پہ آسمان کی بلندیوں میں تالا لگا دینے سے ان کی محبت بہت مضبوط ہو جائیگی اور ان دونوں کے دل بھی ایک دوسرے کے لئے محبت سے باہم مقفل ہو جائیں گے۔ میں نے بہت احترام کے ساتھ اس حسینہ سے ہاتھ چھڑوایا، پتلون کی جیب میں ڈالا اور اس پری زاد کی حیرانگی کی انتہا نہ رہی جب میرا ہاتھ ایک چھوٹا سا تالا لئے جیب سے باہر آیا۔ چاہت کی ایک گہری آہ کھینچتے ہوئے میں نے بھی کسی کے نام کا تالا زنجیر کی کڑی میں اٹکا کر بند کر دیا اور چرواہے کے پتھر پھینکنے والی قوت سے چابی دور پہاڑی اترائی میں ہزاروں درختوں میں پھینک دی کہ نفاق ڈالنے والا شیطان اپنی پوری ابلیسی قوتوں کے استعمال پہ بھی اسے تلاش کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ معصوم لڑکی حیرت میں صرف اتنا ہی بول سکی:

"Oh, a Chinese pretty girl met a Great Baloch Lover on the Great Wall"

میں کیا جواب دیتا کہ میں تو آپے میں نہ تھا، میں زور زور سے کسی کی آیتیں پڑھ رہا تھا۔

مں وتی قولاں عومری سچیار بیثغاں
بیثغاں سچیار چو جہانی ءَ دیثغاں

(میں اپنے قول پر عومر کی طرح سچا نکلا
میں سچا نکلا کہ پوری دنیا نے دیکھ لیا)

اور جوابی لفافے کا دیر تک انتظار کرنا ہی نہ پڑا۔ میرے کان بجے:

من نہ بھلاں کہ عاشقاں رہ پیش داشتغاں

(میں غلطی نہیں کرونگا اسلئے کہ عشاق نے میری راہنمائی کی)

دیوارِ چین پر میراجِ اکبر ہو چکا تھا۔

میں نے دو تین جوڑے دیکھے جو بانہوں میں بانہیں ڈالے زنجیر پر قفل گیری والی میری پیروی کر رہے تھے۔ فرق اتنا کہ میں یک وتنہا، فراق کے بحرالکاہل میں ڈوبے عشق کی مذہبی رسم پورا کر رہا تھا اور وہ جوڑا جوڑا ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے قہقہے لگاتے ایک دوسرے کو چومتے ایسا کر رہے تھے۔ میں کیا کہتا، میں نے تقدیر کو نہیں کوسا، میں نے حسد بھی نہیں کی، میں سراپا دعا بن گیا:

مہرہ ژہ دیذ وخاں مہ رؔواثاں

(شالا محبت آنکھوں سے کبھی ختم نہ ہو)

مگر سارے تعصّبات ہٹا کر ایک منصف ممتحن کی طرح ان جوڑوں کو دیکھا تو پھر ''اُسی'' کی فرمودات میں پہنچا:

پول گندیکے رنگ ءِ چو سمو دروشاں

پولغ ءَ سمو ءِ بذل پیداش ءَ نواں

(مگر تم بے شک ڈھونڈ و سمو کی کوئی ہم شکل

سمو کا نعم البدل ڈھونڈے سے بھی نہیں ملے گا)

یہاں عشاق مرد وخواتین میں کوئی ہلکا پن نہیں، کوئی نیچ حرکت نہیں۔ کہ سیکس کی تفصیلات لوگوں کے لئے اس قدر عام، آسان اور سہل الحصول کر دی گئیں کہ پراسراریت رومانس سے تقریباً خارج ہوگئی ہے۔(1)۔ کوئی جنسی معاملہ نہ تھا، کوئی جنسی بھوک نہ تھی۔ محبت کی آزادی آزادی کی ماں ہے۔ ہر راہ گیر اپنے دھن میں مگن، ان جوڑوں کے قریب سے یوں گزر جاتا جیسے پرواہ ہی نہ ہو۔

10۔اونٹ نے کہا: تینوں پہ لعنت ہو

ہم نیچے اترنے لگے۔ دیوارِ چین کی اترائی بھی عذاب ہے کہ ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ کا زینہ اترنا کوئی اترنا تو نہیں ہے بلکہ یہ تو مینڈک کی طرح پھدکنا ہے اور ہم اشرف المخلوقات پھدکتے نہیں، چلتے ہیں۔ اور چلتے بھی زبردست وقار سے ہیں جسے اردو میں ''چال'' اور بلوچی میں ''ملغ'' کہتے ہیں۔ اور یہ ملغ اتنی اہمیت رکھتا ہے کہ بلوچوں کا ''ملغانی'' نامی ایک پورا قبیلہ ڈیرہ غازی خان میں موجود ہے۔ اور ایک شعر تو یہ کہتا ہے:

مدھر چال چلوائے میری میٹھی چال والی

کہ تیرے ایک قدم کے ہزار کلدار (چاندی کے روپے) ہیں۔

مگر یہاں چال نہیں تھی چھلانگ تھی۔۔اور چھلانگ سے مجھے نفرت ہے، اُس دن سے اُس سے نفرت ہے جب ماسکو میں ایک لڑکی مجھے زبردستی کھینچ کر رقص میں مصروف لڑکوں لڑکیوں میں لے گئی تھی کہ میرے ساتھ ڈانس کرو۔ میں فیوڈل سوشلزم والی اخلاقیات میں پلا بڑھا شرمیلا تھرڈ کلاس نوجوان تھا۔ میں نے اس کے الہامی ہاتھ سے اپنا فضول ہاتھ چھڑا کر کہا تھا ''میں رقص کرنا نہیں جانتا''۔

اس نے کہا تھا:

Dance is nothing but jumping

اور میں نے گناہ کبیرہ کہا تھا:

I dont even know the jumping

اس کا عبادت گاہ جیسا دل توڑا تھا۔

ڈاکو نے کہا ''تمہارا پیسہ یا تمہاری زندگی!!''

راہ گیر نے کہا ''میری زندگی لے لو۔ پیسہ میں اپنے بڑھاپے کیلئے جمع کر رہا ہوں''

11۔سوشلزم جاگتا ہے

آج تو اسی جمپنگ ڈانس کا دن تھا۔ اور میں جمپنگ نہیں جانتا تھا۔ پھر یہ ایک آدھ قدم کی جمپنگ نہ تھی بلکہ پورا پہاڑ اترنا تھا، بریک ڈانس۔ کہ اترائی میں بریکیں بہت استعمال کرنی ہوتی ہیں۔ بریکیں جو گھٹنوں پر لگی ہوتی ہیں۔ ہمارے گھٹنے فوت ہو چکے تھے۔

مگر ہم اِس عذاب گھڑی میں بھی سوشلزم کو نہ بھولے اور اس ساری دم کش Excitement کے عین جوبن میں کہہ بیٹھے: ''ان مزدوروں کے عذاب کا اندازہ کرو جنہوں نے اس دیوار کو تعمیر کیا تھا۔ پھر ان سپاہیوں کی مصیبتوں کا تصور کرو جو شدید سردی میں گھر سے بہت دور اس دوزخی اترائی چڑھائی کے شیطانی چکر میں کم خوراکی اور کم لباسی میں برسوں غلطاں رہے تھے!''

ایک آسٹریلوی بڈھا جو بحالیِ سانس کی جتن میں ایک سیڑھی پہ کئی صدیوں سے چاروں شانے چت پڑا تھا، نے مجھے جواب دیا کہ چین میں جاگیرداری نظام اپنی انتہائی شدید صورت میں موجود تھا۔ کسانوں کی زندگی اور ان کی ہر شئے جاگیردار بادشاہ کے اشارے پر ختم ہو جایا کرتی تھی۔ یہ اتنے بڑے بڑے پتھر سوائے ظلم کی طاقت کے، ہلائے بھی نہیں جا سکتے۔ صدیاں بیت جانے کے بعد بھی یہ دیوار جتنی پختہ ہے اتنا ہی پختہ چین کا جاگیرداری نظام بھی تھا۔ دنیا کی ساری قدیم تعمیرات بیگار کے ساتھ جڑی ہوئی ہیں۔ ان مزدوروں اور سپاہیوں کی مصیبتوں کی داستانیں باقاعدہ لوگوں کو شاعری میں یاد ہیں۔ ضرور حاصل کرو''۔۔۔

اور ہم نے یہ شاعری حاصل کر لی:

لڑکی سن جیانگ کی

لو نیا سال آیا بہاریں لئے
آج آلوچے پھولوں سے بھرپور ہیں
آج ہر گھر کے در پر ہیں روشن دیے
لوگ خوش بخت ہیں لوگ مسرور ہیں
ہر طرف، ہر جگہ تازگی چھا گئی
جنوری آ گئی

آج پورا ہے بستی کا ہر خاندان
ایک میرا ہی دل زار و مہجور ہے
''وان'' کو لے گئے ہیں وہ بےگار میں
اب وہ دیوارِ عظیم کا مزدور ہے
میرے دل کو یہاں بےکلی کھا گئی
جنوری آ گئی

فروری آئی ہے
اور دامن میں لائی ہے خوبانیاں
چڑیاں آنے لگیں
اور دکھن کی جانب کی دیوار پر
ایک اک کر کے ڈیرے جمانے لگیں

گھونسلوں کو سجا کر دلہن کی طرح
ان کے جوڑے تو گلگشت کرنے لگے
بڑھ گئیں میرے دل ہی کی ویرانیاں
فروری آئی ہے

ماہ اگست گل بدست آ گیا
تیج پات آ کے گلشن کو مہکا گیا
ہنس آنے لگے
چٹھیاں خوش نصیبوں کے لانے لگے
اور بے فکرے گاؤں کے چوپال میں
سارا ن دن بیٹھ کر گپ اڑانے لگے
یہ مہینہ بھی یونہی گزر جائیگا
اُس کی پوشاک کوئی نہ پہنچائے گا

برف کے گالے پھر چار سو چھا گئے
یعنی پھر سے نومبر کے دن آ گئے
آپ ہی جاؤنگی
وان کو اس کی پوشاک پہناؤنگی
جنگلوں اور پہاڑوں کے کوے مجھے
راہ بتلائیں گے
اور میں روتی ہوئی
زیر دیوار چین پہنچ جاؤنگی
میرے پیتم، میرے وان کو چھوڑ دو
ظالمو چھوڑ دو
اب چھوڑ دو‘‘(2)

اسی طرح چینی لوک داستانوں اور گیتوں میں ایک اور عورت مینگ جیانگنو (Meng Jiangnu) کا ذکر ملتا ہے جسکی اپنے شوہر کی دیوار کی تعمیر کے دوران ہلاکت پر آہ وفغاں اس قدر دلخراش تھی کہ کہتے ہیں کہ اس کی فریادوں نے پتھروں کا کلیجہ بھی پگھلا دیا اور یوں دیوار کا ایک حصہ زمیں بوس ہو گیا تھا۔

اس بیگار میں شامل لاکھوں افراد کی بیویوں، محبوباؤں، بچوں، اور بوڑھے ماں باپ نے اور کیا کیا شاعری کی ہوگی، کیا کیا ضرب الامثال وضع کئے ہونگے۔ انسانی تاریخ اسے یاد نہیں کرے گی تو بی بی سی کے جرم میں شریک رہے گی۔ پتہ نہیں یونیسکو بے چاری اب تک اس دیوار کی طرح کی اور کتنی جگہوں کو عالمی عجوبے قرار دے چکی ہے مگر یہ سب عجوبے دولت وقوت کے سہارے پہ کسی نہ کسی شہنشاہ نے خرمستی میں بنوائے۔ ان کی بنیادوں میں اولادِ آدم کی ہڈیاں دفن ہیں جنہیں کوڑے مار مار کر بھوک پیاس، اور تھکاوٹ سے مار دیا گیا۔ اسی حوالے سے دیوارِ چین کو دنیا کا ’’طویل ترین قبرستان‘‘ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ سب قربان گاہیں ہیں، مقتل ہیں، بلیدان سرائے ہیں اشرف المخلوقات کی۔ اس لئے چینی احباب اپنے گائیڈوں کو سکھائیں یا نہ سکھائیں، لٹریچر مہیا کریں یا نہ کریں، یادگاریں تعمیر کریں یا نہ کریں۔۔۔۔ آپ تو جب بھی جہاں بھی کسی عالمی عجوبے کی سیر کو جائیں تو اپنے بدن کے گلستان میں سے ایک لمبی ٹہنی والا شوخ سرخ پھول توڑنے کا درد محسوس کرتے ہوئے ان روحوں، کھوپڑیوں، ہڈیوں، آہوں کراہوں پہ تعظیماً نچھاور کریں۔ آپ کے اندر کا انسان

شانت ہو جائیگا، آپ کی روح خلشِ گناہ سے پاک ہو جائیگی۔

12۔جعلی ڈگریاں بکتی ہیں

بیس کیمپ میں پہنچے تو ہم ایک بار پھر خواتین کے نرغے میں تھے۔ راجہ اِندر والی خواتین نہیں، یہ تو سیلز گرلز تھیں۔ اور ہمیں دیوارِ عظیم کو سر کرنے کا سرٹیفکیٹ وصول کرنے کا کہہ رہی تھیں۔ یہ سرٹیفکیٹ پیسوں پر بک رہا تھا۔ جیسے ہمارے پاکستان میں کیریکٹر سرٹیفکیٹ بکتا ہے، فٹنیس سرٹیفکیٹ بکتا ہے، میٹرک، بی اے اور ایم اے کا سرٹیفکیٹ بکتا ہے، جیسے الیکشنوں کی خاطر مولوی لوگ مدرسے کی سندیں بیچ دیتے ہیں۔ یہاں بھی آپ خواہ دیوار سر کریں یا نہ کریں کسی کو اس سے غرض نہیں، بس پیسہ دیں سرٹیفکیٹ حاضر۔ اس سند کے اوپر ایک طرف The Great Wall of China لکھا ہے تو دوسرے سرے پر The World Cultural Heritage چھپا ہوا ہے۔ درمیان میں عظیم ماؤ کا قول:

He who does not reach the Great Wall is not a true man.

پھر ہمارا نام ہم سے ہی لکھوایا گیا کہ انگریزی میں لکھنا تھا۔ ''سند دیا جاتا ہے کہ شاہ محمد مری 23-11-04 کو دیوارِ چین پر چڑھا''۔

نیچے چینی زبان میں دو تین مہریں لگی ہوئی تھیں۔ ہم نے تیس یوآن دیے اور سند حاصل کی۔ جو دوست نہ بھی چڑھے وہ بھی سند کے مالک ہو گئے۔ جیے بھٹو!!

13۔دوست ملک کے لئے نیک تمنا

ہم جو کوہِ سلیمان کی بلند چوٹی ''ہندر'' کے مالک تھے۔ آج یہاں دیوارِ چین کے مالک اپنے دوست ملک چین کی عوام کے لئے دعائے خیر کہے بغیر وہاں سے نہ ہٹے:

اوِ ہندرءِ شاغیں پواد
مئے گوُستغیں وخت ءِ گواہ
مئے چیذ غانی گل زمیں
مر شیغیں مونجھانی شریخ
بچی مواتئی بڑز غاں
(اے ہندر کی عظیم کوہ!
ہمارے گزرے وقت کی گواہ!
ہمارے کارناموں کی نشانیوں سے بھری سرزمین!
ہمارے آج کے غموں کی شریک!
تمہاری سربلندیاں سلامت رہیں)

14۔چائنیز ہوٹل اور بلوچی سجی

دوپہر کا کھانا اسی ہوٹل میں کھایا جو ایغوروں کا تھا اور جس میں بلوچی سجی ملتی تھی اور جسے وہ چینی زبان میں ''پورا پکا ہوا ران'' کہتے ہیں۔ پھر وہی ڈشیں قطار اندر قطار، اور ہر ڈش کا ذائقہ ممتاز، نمایاں۔ ہر ایک کا ذائقہ، ہر ایک کا رنگ اور ہر ایک کا سٹائل کسی دوسری ڈش

سے نہیں ملتا۔ یہ لوگ 5000 سے زائد ڈشیں پکاتے ہیں (3) اور کھانے میں رنگ ،خوشبو، ذائقہ،صورت اور نیوٹریشن پر زور دیتے ہیں ۔ خوراک بہت تازہ ہوتی ہے ۔اس کے اندر جمالیاتی ذوق کا زبردست خیال رکھا جاتا ہے ۔ یہاں ہم نے دلچسپ بات دیکھی کہ چینی لوگ جوس اور چائے سب سے پہلے پیتے ہیں اور سوپ ان کے کھانے کا سب سے آخری آئٹم ہوتا ہے ۔ ہمارے ہاں کے چینی ہوٹلوں کے بالکل الٹ ۔ جہاں ہم 35,35 گریڈ کے ،عوامی تقدیروں کے مالک بیوروکریٹوں اور جہاں گشت پی ایچ ڈی والوں کو کھانے سے پہلے سوپ سے بردباری کرتے ہوئے دیکھتے ہیں ۔ چائنیز ہوٹلوں میں سوپ سب سے آخری آئٹم ہونا چاہیے۔ارے گم کرو ۔ ہمارے عوام کی اکثریت کو تو دو وقت کی جوار کی روٹی میسر نہیں ۔ ہم انہیں سوپ پینے کے آداب سکھا رہے ہیں ۔لیکن کیوں نہ سکھائیں ۔معلومات رکھنا ان کا حق ہے ۔ اس لئے میں تو قاری کو یہ بھی بتادونگا کہ چینی ہوٹل فنگ سلطانوں کے دور (1644......1911) میں برطانیہ اور دیگر ممالک میں کھلے ۔ان ہوٹلوں نے چین کے کھانوں کو دنیا بھر میں مقبول کر دیا۔کھانا یا خوراک انسانی نسل کی تہذیب ہے اور پکانا ایک اعلیٰ آرٹ ۔ کہ کوئی اور جاندار پکوان نہیں کرتا ۔سماجی پیداواری قوتوں کی بڑھوتری نے چینی کھانوں کے پکوان کے آرٹ کو خوب خوب ترقی دی ۔

ہمارے میزبان جنکشی یو نے ہمیں چینی کہاوت سنائی :'' خوب کھاؤ، خوب سوؤ اور خوب انجوائے کرو''۔اب اس پر ہم بے چارے لوگ کیا عمل کرتے ،اصل عمل تو ہمارا ترجمان '' ہُو وائی'' (ہانس) کر رہا تھا۔ کیا کھاتا ہے!! اور کیا سٹائل سے کھاتا ہے!! ۔ ایسے جھپٹتا ہے کھانے پر کہ لگتا ہے بتیس برس سے صومالیہ میں رہ کر آ رہا ہو۔

ہوٹل سے نکلے تو چیزیں بیچنے والوں نے باقاعدہ ہاتھا پائی کر کے ہم پہ اپنی اشیاء بیچنا چاہیں۔نقلی رولیکس گھڑیاں، دو نمبر والے ریڈیو، تیار کیمرے لئے ہوئے فوٹو کھینچنے والے ۔ گھن آنے کی حد تک پیچھا کرتے ہیں یہ۔ ہمارے چینی میزبان کو ٹھٹ کے الفاظ میں '' کو چرا'' ہو رہے تھے انہیں دیکھ کر ۔۔۔میزبان بے چارے ابھی تک سنبھل ہی نہیں پائے تھے، سمجھ ہی نہیں پائے تھے کیونکہ کمیونزم میں ایسا تو نہیں ہوتا تھا۔مگر اب انہیں منع نہیں کر سکتے تھے کہ کیپٹل ازم میں انہیں روکنا معیوب ہے۔ہم سے آنکھیں نہ ملا سکتے تھے، کہ ہم انہیں بہت اونچا دیکھنے کے عادی تھے۔بس دبے الفاظ میں ہم سے کہتے رہتے:'' ان سے نہ خریدیے' مہنگا بیچتے ہیں۔ اور ''چیٹر'' بھی ہیں''۔ ہمارا موقف تھا کہ کیپٹل ازم چیٹرز ہی کا تو نظام ہے ۔جنکشی یو کو کیا اختلاف ہو سکتا ہے۔ ہمارا وہ یار بے بسی میں سر ہی جھکا سکتا تھا۔

حوالہ جات

1۔امجد،اسلام امجد۔۔ریشم ریشم۔۔ صفحہ 145

2۔عارف،سید ارشاد احمد۔دیوار چین کے اس پار۔۔ صفحہ 82

3۔ژوقفسن ۔دی سائیٹس آف چائنا۔۔صفحہ 12

نیشنل میوزیم آف ماڈرن چائنیز لٹریچر

کھانے سے فارغ ہوکر ہم جدید دور کے ادیبوں، شاعروں اور آرٹسٹوں کا میوزیم دیکھنے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ ہمیں چین کے جدید ادب کے ارتقا سے آگاہ کیا جائے۔ یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ ہمارا وفد ادیبوں پہ مشتمل تھا، اور ماسوائے میرے، باقی سارے دوست بہت جید ادیب تھے۔ مگر اس کے باوجود ہمیں چینی ادب کے بارے میں بالکل معلوم نہ تھا۔ ہو سکتا ہے کہ زبان کا مسئلہ ہو اور ان کے فن پارے زیادہ ترجمہ نہ ہونے کی وجہ سے ایسا ہو۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ ہمیں ان کے ادب کے بارے میں ایک لفظ تک معلوم نہ تھا اور ہم چلے تھے ان کا ادبی میوزیم گھومنے۔ لہذا بوریت تو مقدر تھی۔ میری بات البتہ دوسری تھی۔ ایک تو میں ان کے شاعر اور لیڈر ماؤزے تنگ کے بارے میں خوب خوب جانتا تھا اور حتی کہ موجودہ نسل کے چینیوں سے بھی زیادہ۔۔۔۔ اس لئے کہ وہ میرے نظریاتی استادوں اور انقلابی ھیروؤں میں سے ایک تھے۔ پھر ان کے جدید ادب کے باوا، لوھسون سے بھی میری شناسائی تھی کہ عبداللہ جان کے ہاں ان کی سوانح پر ایک کتاب دیکھ رکھی تھی۔ لوھسون کے افسانوں کے کچھ تراجم اردو اور بلوچی کے رسائل میں پڑھ رکھے تھے۔ کچھ ''عوامی جمہوریت'' میں ان کے بارے میں چھپتا تھا اور کچھ ''چین با تصویر'' میں، جو ایک زمانے میں ہمارے کمیونسٹ نصاب میں تقریباً تقریباً شامل ہوا کرتا تھا۔ میں ان معلومات کو بچشم خود دیکھ کر تازہ کرنا چاہتا تھا۔ میری دلچسپی کی دوسری وجہ یہ تھی کہ اچھا، اگر میں پہلے کم جانتا تھا تو اب مجھے بہت زیادہ جاننا چاہیے۔ آخر، یہ کالی آندھی سے زندہ بچ جانے والے ایک کمیونسٹ ملک کا ادب ہے اور میں اس نظریے سے سختی کے ساتھ وابستہ گنے چنے افراد میں سے ایک آثارِ قدیمہ ہوں۔ پھر میرا ارادہ سفرنامہ لکھنے کا بھی تھا اس لیے بھی چیزیں نوٹ کرتا رہتا تھا۔

یہ میوزیم ایک کشادہ سڑک پہ قائم تھا جس کا نام آنی یو آن روڈ ہوا کرتا تھا مگر اتنے بڑے میوزیم کی مالکن اس سڑک نے اپنا نام بدل کر ''ون شوگوآن'' یعنی ''لٹریچر میوزیم'' روڈ رکھ لیا۔ یہ میوزیم ادب کی ابدیت کی علامت ہے اور یہ دنیا کی بہترین ادبی میوزیموں میں سے ایک ہے۔ چینی عوام اپنی جن عظیم چیزوں پہ فخر کرتے ہیں ان میں سے ایک یہ میوزیم بھی ہے۔ اس کے قیام کا تصور چین کے بہت ہی معزز ادیب باجین نے دیا تھا اور 1993 میں اس کی تعمیر کی منظوری دی گئی۔

یہ میوزیم، چائنیز ماڈرن لٹریچر پہ مواد کا بنیادی سرچشمہ ہے۔ یہ دنیا کی سب سے بڑی عمارت ہے جو صرف اور صرف ادب اور ادب سے متعلق Collections کے لئے وقف ہے۔

یہ ایک بہت بڑی اور باوقار عمارت میں موجود ہے۔ جو کہ قدرتی روشنی سے منور آرکیٹکچر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ یہاں ایک معمر خاتون نے خوبصورت انداز میں ہمیں اس

کے بارے میں بتایا۔اس میوزیم کے داخلے کے علاقے میں شیشے کے میورلز اور خوبصورت پینٹنگز میں انقلاب سے قبل والے چین میں موجود فیوڈل ازم کے مظالم اور اس کے خلاف عوام کی جدوجہد کی بہت خوبصورت عکاسی کی گئی ہے ۔ پھر دو بہت بڑے گلدان (Celdon Vase) رکھے ہوئے ہیں جن پہ پانچ ہزار چینی رائٹرز کے دستخط ہیں۔

نیشنل میوزیم آف ماڈرن چائینیز لٹریچر، بیجنگ میں ایک مشہور و معروف سیاحتی ثقافتی مقام ہے۔چینی رائٹرز ایسوسی ایشن کے تحت چلنے والے اس میوزیم کے اندر ایک لٹریچر میوزیم بھی ہے، لٹریچر کی لائبریری ہے، لٹریچر مواد کے ریسرچ کا ایک مرکز ہے، لٹریچر آرکائیوز کا شعبہ ہے اور ان سب کے علاوہ یہاں ادبی سرگرمیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔

اس میوزیم کا فریضہ ماڈرن چینی رائٹرز سے متعلق ہر قسم کا مواد اکٹھا کرنے، تلاش کرنے اور محفوظ رکھنے کا ہے ۔جس میں ان کی تصانیف، مسودات، تراجم، خط و کتابت، ڈائریاں تصاویر، ٹیپ، وڈیو، نوادرات اور کئی میگزین اور اخبارات شامل ہیں ۔اس میوزیم میں نمائش کے لئے موجود مواد میں مشہور رائٹرز کی تخلیقات کے کئی مسودے ہیں۔اس کے علاوہ ان رائیٹرز کے پاس ان کی زندگی میں موجود جو لاکھوں کتابیں اور مضامین تھے وہ بھی یہاں رکھے گئے ہیں۔ان میں سے کچھ تو اس قدر قیمتی ہیں کہ انہیں فرسٹ کلاس قومی ثقافتی تبرکات اور یادگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔اس میوزیم کے مواد کی حفاظت اور اس سے استفادہ کرنے کے لئے کمپیوٹر کا نظام، نقل بنانے، اور پڑھنے کا جدید نظام موجود ہے ۔2002 میں اس میوزیم کو دارالحکومت کا ''گلستان'' قرار دیا گیا۔(ادب ہی تو کسی دارالحکومت کا گلستان ہوتا ہے)۔

میوزیم میں تین نمائشی ہال ہیں۔پہلی منزل نمائش کی ہے۔یہاں 20ویں صدی کے عظیم چینی ادیبوں کے مجسمے موجود ہیں۔اس منزل کو سات ماڈرن عظیم چینی ادیبوں کے لئے وقف کر دیا گیا: لوہسون، گواؤ موراؤ، ماؤ ڈن، باجین، لاؤ شے، کاؤ یو اور بنگ ژِن۔ان میں سے ہر ایک کو ایک الگ سیکشن کا اعزاز دیا گیا۔جہاں ان کی رہائش اور تحریر کے شعبے دکھائے گئے ہیں۔

دوسری منزل چینی ہم عصر اور ماڈرن لٹریچر کی نمائش ہے جو پچھلے ایک سو سالوں کے چینی لٹریچر کی مختصر تاریخ بتاتی ہے۔نمائش میں جو آئٹم رکھے گئے ہیں ان میں 420 رائٹرز کے فوٹو گراف، مختصر سوانح عمریاں، مسودے یا شاہکاروں کے نمونے ہیں ۔ تیسری منزل پر 19 رائیٹرز کے Simulated سٹڈیز، اور ان 55 رائیٹرز کے نام سے منسوب لائبریریاں ہیں۔جنہوں نے اپنے پاس موجود کتابیں یا لٹریچر سے متعلق مواد میوزیم کو عطیہ کیا ۔ان لائبریریوں میں اس وقت ایک لاکھ کتابیں موجود ہیں۔ان تین نمائشی ہالوں کے ساتھ ساتھ میوزیم میں ایک کثیر المقاصد ہال ہے جس میں بہ یک وقت پانچ زبانوں کے ترجمے کی سہولت موجود ہے۔

چین کا جدید ادب انقلاب کی تیاری، انقلاب برپا کرنے اور انقلاب برقرار رکھنے کا ادب ہے۔اس میں انقلاب سے قبل فیوڈلزم کی سفاکی کے رونگھٹے کھڑے کر دینے والے تذکرے موجود ہیں۔ پھر ان عہد آفریں احساسات کا ذکر ہے کہ کیسے انسانی رشتوں کی کایا پلٹ جاتی ہے۔انسان کا حیات و کائنات سے کیونکر انقلابی رشتہ قائم ہوتا ہے۔جدید چینی ادب کے رخِ یار کے حسن اور محبوب کے مہربان ہونے سے بھی تعلق ہے اور اس میں جسمانی مشقت کر کے دھرتی کو سندر بنانے کی مسرت بھی شامل ہے۔ یہاں ادیب اپنے وطن سے بے پناہ سرگرم محبت کرتا ہے، اسے حسین بنانے کے خواب دیکھتا ہے اور پھر کروڑوں ہم وطنوں کے ساتھ اس کی تقدیر بدلنے کو میدان میں کود پڑتا ہے ۔۔۔۔۔۔اور پھر مشینوں سے، ٹکنالوجی سے اس کی کایا پلٹنے کو سراہتا ہے۔

یہاں ایک بہت بڑا پتھر (Megalith) رکھا ہوا ہے۔جس میں انگریزی کا ''کاما''(،) بنا ہوا ہے۔یہ دراصل میوزیم کا نشان ہے۔جدید چینی تاریخ میں جدید چینی ادب

کی آمد کی پیش گوئی کرنے کے لئے چین کے لکھاریوں نے کاما کواپنانا شروع کردیا۔یعنی جدید چینی ادب کا کوئی انت نہ ہوگا اور یہ 21ویں صدی میں زیادہ ترقی یافتہ ہوگا اور ایک روشن مستقبل کی طرف بڑھتا رہیگا۔

چین ایک وسیع ملک ہے جوشاعری اور مضمون نویسی کی ایک طویل تاریخ رکھتا ہے۔ البتہ اپنی تاریخ میں اس نے ناول اور ڈرامہ نویسی میں مغربی ادبی نظریات مستعار لئے۔اور جدید چینی ادب میںPunctuation marks (عبارت میں وقفہ لکھنے کے نشانات) کواستعمال کیا۔یہ کام لوہسون، گومورو،اور، ہوشی نے کیا جو کہ باہر سے تعلیم پا کر وطن آئے۔

بیجنگ میں نیشنل میوزیم آف ماڈرن چائنیز لٹریچر کے گیٹ کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا پتھر رکھا ہے جس پر یہ قول درج ہے۔''ہم کتنے زبردست ادبی سرمائے کے مالک ہیں۔یہ بے شمار ادیبوں کے شاہکار ہیں۔ یہ ہماری مدد کرتے ہیں۔ہمیں علم بخشتے ہیں، ہمارا حوصلہ بڑھاتے ہیں،ہمیں مزید نرم دل، پاکیزہ تر اور دوسروں کے لئے زیادہ مددگار بناتے ہیں ۔۔۔۔''(اورمیں نے سوچا، یہ نرم دل بنانا بھلا کیا ہوا، ہم بلوچوں میں نرم دلی تو بزدلی ہے ۔اور بزدل کو مارنا، ذلیل کرنا، کچل ڈالنا عین بلوچیت ہے، فیوڈل بلوچیت۔قافیہ ردیف دیکھیے:شریف دل، نرم دل، بزدل۔۔۔۔)مگر ہمیں چھوڑیے، دنیا کی بات کیجئے۔جہاں نرم دلی ہی انسانیت ہے۔سنگ دلی درندگی ہے۔پتھر پہ یہ قول دنیا کے بہت بڑے ادیب باجین کا ہے۔

اس میوزیم کی خوبصورت ترین بات مجھے یہ لگی کہ اس کے مین گیٹ پر ایک انسانی ہاتھ کندہ ہے۔آپ اس ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھیں گے تو میوزیم کا گیٹ کھل جائے گا۔اس طرح میوزیم میں آنے والے ہزاروں لوگ روزانہ اس ہاتھ سے ہاتھ ملاتے ہیں۔یہ ہاتھ'ایک سو ایک سالہ چینی ادیب اور چینی رائٹرز ایسوسی ایشن کے سربراہ ''باجین'' کا ہے جو مفلوج ہونے کی وجہ سے شنگھائی کے ایک ہسپتال میں داخل ہیں۔چینی لوگ عقیدے کی حد تک اپنے اس ادیب سے محبت کرتے ہیں۔اور میں نے دیکھا کہ ہر جگہ ان کا نام بہت احترام اور اپنائیت سے لیا جاتا ہے۔چونکہ بیماری کی وجہ سے وہ اپنے عقیدت مند قارئین (اور پورا چین ان کا قاری ہے) سے ہاتھ نہیں ملا سکتے، اس لئے ان کے ہاتھ کے اس ماڈل پر روزانہ ہزاروں لوگ ہاتھ رکھ کر گویا باجین ہی سے ہاتھ ملا رہے ہوتے ہیں۔۔۔۔یہ ہوتی ہے علم سے محبت اور اپنے اہلِ قلم کی عزت!!(مجھے بیجنگ شہر کے اس میوزیم میں بلوچ قوم یاد آئی، ان کے ادیب عبداللہ جان جمالدینی یاد آئے، ان کا فالج زدہ ہاتھ یاد آیا۔اور اپنی قوم کی ثقافتی پسماندگی یاد آئی۔)

گومورو، ماؤڈُن، لوہسون اور باجین بیسویں صدی کے چین کے معزز ترین ادیب ہیں اور لوہسون ان سب کے سرکردہ۔

لوہسون

لوہسون جدید چین کے مفکر اور انقلابی تھے۔ جدید کہنا اس لئے ضروری ہے کہ چین کی تحریری تاریخ پانچ ہزار برس کی ہے۔ اور چین غلام داری، فیوڈل ازم، نیم فیوڈل و نیم نو آبادیاتی سماج اور پھر حال کے سوشلسٹ سماج کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ یہاں اولین شاعری (جو کہ کسی بھی زبان کے ادب کی اولین صنف ہوتی ہے) گیارھویں صدی قبل مسیح میں "دلکھی" گئی ہے۔ مگر لوہسون اس لئے جدید ادب کے معمار ٹھہرے کہ انہوں نے ساری روایتی جہتوں کو مسترد کیا اور خیالات سے لے کر فارم تک سب کچھ بدل ڈالا۔ ان کے تذکرے کے بغیر بیسویں صدی کے چینی ادب کی کوئی تصویر مکمل نہیں ہوگی۔ وہ کہانی کار، مضمون نگار، تنقید نگار اور ادبی نظریہ دان تھے۔ لوہسون چین میں بیسویں صدی کے ادب کی عظیم ترین شخصیات میں سے ہیں۔

لُو ہسون 1881ء میں صوبہ چکیانگ کے گاؤں شاؤشنگ میں ایک تعلیم یافتہ اشرافیہ کے خاندان میں پیدا ہوئے۔ ماں باپ نے نام چُوشُوجین رکھا۔ لوہسون ان کا قلمی نام تھا۔ ان کے والد کو افیون کے نشے کی لت پڑ گئی اور وہ سخت بیمار ہو گئے۔ کمسن بیٹے ہی کو حکیموں، جڑی بوٹیوں، پھکیوں، اور جوشاندوں کے چکروں میں پڑنا تھا۔ باپ تو مر گیا مگر بیٹے کو چینی روایتی معجونوں سے نفرت ہوگئی۔ اور وہ چینی روایتی طبیبوں حکیموں، دم کرنے والوں، عاملوں سے متنفر ہو گئے۔ وہ تیرہ برس کے تھے جب چین جاپان کی (1894) کی جنگ میں چین کی شکست کی خبر انہیں پہنچی۔ انہیں بڑی بے عزتی محسوس ہوئی (1)۔ ان جیسے حساس نوجوانوں کو قنگ بادشاہ کی کرپشن روز بروز واضح نظر آنے لگی۔ بادشاہ غیر ملکیوں کے سامنے بہت تابعدار تھا مگر داخلی طور پر عوام پہ ظلم و جبر، اور جاگیرداری کی فرسودگی مسلط کئے ہوئے تھا۔ یہ سب کچھ لوہسون کو بری طرح محسوس ہو رہا تھا۔ تعلیم سے بادشاہ کو چڑ تھی، خصوصاً جو شخص غیر ملکی سکول میں غیر ملکی مضامین پڑھتا اسے "غیر ملکی شیطانوں کے سامنے اپنی روح بیچنے والا" تصور کیا جاتا تھا۔(2)

لوہسون 1898ء میں سترہ برس کی عمر میں حصولِ علم کی خاطر نانکنگ چلے گئے۔ اور وہاں پر سرگرم عمل چینی انقلابیوں کیساتھ مل کر کام کرنے لگے۔ جن کا مقصد قنگ بادشاہ کا تختہ اُلٹنا تھا۔ لوہسون نے پہلے تو روایتی تعلیم حاصل کی۔ پھر وہ جیانگ نان نیول اکیڈمی چلے گئے (1898......99)۔ پھر سکول آف مائننگ اینڈ ریلوے (1899......1902) میں پڑھا۔ بعد ازاں وہ 1902 میں سینڈائے میڈیکل کالج جاپان میں پڑھنے لگے۔۔ ان کا خیال تھا کہ طبی تعلیم کے فروغ سے ہی چین کا مستقبل سنوارا جا سکتا ہے لیکن ایک روز کلاس میں کچھ تصویریں پروجیکٹر سے دکھائی جا رہی تھیں۔ یہ تصویریں روس جاپان جنگ (1904......1905) کے دوران کی تھیں۔ جن میں ایک ایسی تصویر بھی دکھائی گئی جس میں

جاپانی سپاہی ایک چینی جنگی قیدی کا سر قلم کر رہے تھے۔ اور ارد گرد ہٹے کٹے چینی کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ اس پر لوہسون کو احساس ہوا کہ عوام کی جسمانی صحت نہیں بلکہ ان کا سیاسی شعور ہی چین کے روشن مستقبل کی ضمانت دے سکتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے 1906 میں طبی تعلیم کو خیر باد کہا اور ادب کے ذریعے انقلاب کے طریقِ کار کو اپنا لیا۔ انہوں نے پرائیویٹ طور پر پڑھا بالخصوص ڈارون کو، جسکے نظریہ ارتقاء کو وہ بیالوجیکل سائنسز میں میٹریلزم کا مرکز گردانتا تھا ۔اس طرح وہ 1909 میں وہ واپس چین آ گیا۔

چین کی پوری تاریخ بدترین فیوڈل ازم کی گرفت میں رہی۔ ایسا فیوڈل ازم جس کی جڑیں بہت گہری تھیں۔ ریاست کے اندر ریاستیں تھیں اور ہر ریاست پہ فیوڈل بادشاہ حکمران تھے۔ اور ان فیوڈل شاہوں کی فرعونیت، الحفیظ الامان۔ کہتے ہیں کہ ایک بار ایک ریاست کے فیوڈل شاہ نے پڑوسی ریاست کے فیوڈل دربار میں اپنا ایلچی بھیجا۔ جو کہ لنگڑا تھا۔ اُس دربار میں اس کا مذاق اڑایا گیا۔ محض اس بات پہ جنگ چھڑ گئی اور مذاق اڑانے والی ریاست کو شکست ہوگئی۔ لنگڑے ایلچی نے جو کہ اب فوج کا کمانڈر ان چیف تھا، صلح کے شرط کے بطور شکست خوردہ شہزادے کی ماں کو حوالے کرنے کا کہا۔

ایک شکست خوردہ ریاست کے دارالحکومت میں صلح طے پانے کو غیر معمولی توہین سمجھا جاتا تھا۔ شکست خوردہ شہزادہ فاتح کو ایک دنبہ پیش کرتا تھا، اس حالت میں کہ وہ نیم برہنہ ہوتا۔

چین کا فیوڈل ازم دنیا کا سب سے قابلِ نفرت فیوڈل ازم تھا۔ دیہات میں مقامی چھوٹے فیوڈل سے لے کر ملک کے سب سے بڑے فیوڈل یعنی بادشاہ تک ظلم واستبداد کا ایک منظم جال موجود تھا۔ اس فیوڈل ازم کو مذہبی اور نظریاتی پشت پناہی حاصل تھی۔ بادشاہ فراعینِ مصر کی طرح ملک کا سب سے بڑا مذہبی پیشوا بھی تھا (3)۔ بادشاہ سلامت کو آسمانی حقوق حاصل تھے۔ وہ زمین پر آسمان کا نمائندہ تھا اور اپنے آپ کو "تسی ان تسی (فرزندِ آسمان) کہلواتا تھا۔ رعایا اس کے سامنے سربسجود ہونا مذہبی فرض سمجھتی تھی۔ اس سجدے کو "کوٹو" کہتے ہیں۔

بادشاہ کی اطاعت اور فرمانبرداری جانچنے کا عمل باقاعدہ ادارے کی شکل میں موجود تھا۔ ہر جگہ بادشاہی جاسوس پھرا کرتے تھے۔ اور آنکھوں، کانوں اور زبان کی مدد سے شہنشاہی تسلط کے دوام کو یقینی بناتے تھے۔ پورے چین میں لازم تھا کہ لوگ اپنے سروں پر ہندو ملّاؤں کی طرح ایک چوٹی رکھیں۔ چوٹی کا نہ ہونا بغاوت تصور ہوتا تھا۔ جسے مغرب زدگی، کفر، اور خدا سے بغاوت سمجھا جاتا تھا۔ اور لہٰذا وہ سر ہی کیوں رہے جس پہ چوٹی نہ ہو۔ دانشوروں نے ضرب المثل بنا رکھی تھی: "آسمان میں دو سورج نہیں ہو سکتے اور زمین پر دو بادشاہ نہیں ہو سکتے"۔

عورتوں کی غلامی کے لئے بھی باقاعدہ نظریہ تشکیل دیا گیا تھا۔ چین میں یاروں نے تخلیقِ دنیا کے دن ہی سے اسے حقارت و تاریکی سے تعبیر کیا اور ایک ذلیل مخلوق قرار دیا ۔ ملاحظہ ہو:

"تکوین وتخلیق کی چینی کہانی یہ تھی کہ ابتداء میں ہر کہیں انتشار اور فساد تھا جس سے دو قوتیں نمودار ہوئیں: یانگ اور ین۔ جو مل کر محیطِ کل بناتی ہیں۔ یانگ آسمان، روشنی، گرمی، حرکت اور تذکیر کا اصول ہے جبکہ ین ارض، تاریکی، سکون، خنکی اور تانیث کا اصول ہے۔ ان کے باہمی ربط کو ایک دائرے کی صورت میں دکھاتے تھے جس میں سفیدی اور سیاہی باہم پیوستہ ہیں۔ تذکیر (یعنی مرد) روشنی ہے، آسمان ہے، حرکت ہے اور گرمائش ہے۔ جبکہ ین (یعنی عورت) زمین ہے، تاریکی ہے، خنکی ہے۔ اس علامتی دائرے کو قدیم چین میں وہی مقام حاصل تھا جو بودھوں کے چکر، آریاؤں کے سواستیکا اور مسیحیوں کی صلیب کو میسر ہے۔ بعد میں یہ علامت فنی تزئین و آرائش کا نشان بن گئی۔ بہر حال عرصہ دراز کے بعد یانگ اور ین سے ایک انسان نے جنم لیا جس کا نام پان کو تھا۔ وہ کرہ ارض بنا۔ اس نے سورج چاند اور ستاروں کو

بنایا۔ وہ بڑھتا گیا اور بدلتا گیا حتیٰ کہ اس کا سر پہاڑوں کی صورت اختیار کر گیا۔ اس کی سانس بادل بنی اس کی آواز رعد بنی، اس کی نسیں دریا بن گئیں، اس کی جلد اور بال جنگل بنے، اس کے دانت اور ہڈیاں وہ معدنیات بنیں جو زیر زمین دفن ہیں۔ اس کا سینہ بارش بنا اور جو کیڑے اس کے جسم پر رینگتے تھے وہ انسان بن گئے۔ تخلیق کے اس کام میں ایک اژدھے، ایک کچھوے اور ایک عنقا نے اس کی مدد کی (4)۔

عورتوں کے بارے میں چین سے زیادہ وحشتناک فیوڈل ازم دنیا میں آپ کو کہیں اور نہیں ملے گا۔ انسان نے عورتوں کے زیر ناف لگائے جانے والا عصمت کا تالا تو انسانیت کی تذلیل میں سب سے بدنام تالے کی حیثیت سے سن رکھا ہے۔ لیکن چین والے بزعمِ خود حسنِ نسوان کے بڑے مبصر تھے۔ انہوں نے ہوا و ہوس کی دنیا میں بڑی مردار لطافتیں پیدا کیں۔ اس مردانہ بالا دستی والے نظام میں عورتوں کے پیروں کو چھوٹا رکھنا گویا حسن کی علامت قرار دیا گیا۔ یہ بد بخت لوگ پیدائش کے وقت سے ہی لڑکی کو لوہے کے جوتے پہنا دیتے تھے۔ اس طرح پاؤں کی فطری نشو ونما روک دی جاتی تھی۔ عورتیں عمر بھر پاؤں چھوٹے رکھنے کی اذیت جھیلتیں۔ جب وہ جوان ہو جاتیں تو وہ ان کے ننھے منے پاؤں کو ''سنہری کنول'' اور ''معطر سوسن'' کہا کرتے تھے۔ اس طرح بڑی عمر کی عورتوں کے پاؤں بھی شیر خوار بچے جیسے چند انچ کے چھوٹے پاؤں ہوتے تھے۔ بڑے پاؤں والی عورت ''پچھل پا'' گردانی جاتی تھی۔ اور اس سے بیاہ نہیں ہو سکتا تھا۔ چینی عورت اپنے شوہر کے سوا کسی کو اپنے پاؤں نہیں دکھاتی تھی اور انہیں چھپائے رکھنے میں وہی اہتمام کرتی جو دوسری اقوام کی عورتیں اپنی چھاتیاں چھپانے میں کرتی ہیں۔ بد بخت فیوڈل معاشرے میں عورتوں کے ننھے منے پاؤں بے پناہ جنسی کشش کا سامان رکھتے تھے کیونکہ ان سے چلتے وقت بوجھل کولہوں میں نفس پرور تموج پیدا ہوتا تھا اور سُرین کا ابھار نمایاں ہو جاتا تھا۔

چین میں عورتوں کے پیر زبردستی چھوٹا کرنے کے اس عمل کی معلوم تاریخ سال 907 عیسویں تک جاتی ہے۔ عورتوں کے پاؤں غیر فطری طور پر چھوٹا رکھنے کا عمل فیوڈل ازم کی ایک ضرورت تھی۔ فیوڈل ازم جبر کے بغیر نہیں چلتا۔ عوام الناس پہ بندشیں لگانا، انسان پہ جبر کرنا، پابندیاں مسلط کرنا اور چھوٹی سی اقلیت کی طرف سے بہت بڑی اکثریت کو غلام بنانا۔ یہ ہے فیوڈل ازم کی نفسیات۔ فیوڈل ازم تہہ در تہہ آمریت کا نام ہے۔ جس میں سب سے زیادہ استبداد عورتوں پر ہوتا ہے۔

چین میں فیوڈل ازم نے عورتوں پہ مردوں کی آمریت کو اس شکل میں ابدیت دے دی۔ اس آمریت میں ایک بیمار جنسی نفسیات شامل تھی۔ اور تاریخ بتاتی ہے کہ جوں جوں فیوڈل ازم فروغ پاتا گیا، عورتوں کے پیر باندھنے کا عمل بھی وسعت پاتا گیا۔ کہتے ہیں کہ سن **1368** تک عورتوں کے پاؤں چھوٹے رکھنے کی جنسی بھوک چین میں مقبول ترین بھوک بن چکی تھی۔ ذرا فکر کیجئے کہ جس معاشرے میں فیوڈل طرزِ فکر اس قدر گہرا اور پختہ ہو وہاں اس نظام کی جڑیں اکھاڑ پھینکنے والوں کو کس قدر اذیتیں اٹھانی پڑی ہونگی۔ اس بات پہ بھی فکر کیجئے کہ جن لوگوں نے اربوں کی تعداد میں بی بی حوا کی بیٹیوں کو اس توہین آمیز غلامی سے نجات دلا دی وہ انسانیت کے کتنے بڑے محسن ہیں۔

غریب خاندانوں میں پیدائش کے وقت بیٹیوں کو قتل کرنے کا عمل عام تھا۔ تین چار برس کی عمر میں غریب ماں باپ بیٹیوں کو غلامی میں فروخت کیا کرتے تھے یا اسے 12 سے 14 برس کی عمر میں طوائف یا داشتہ کے طور پر فروخت کرتے تھے۔ حتیٰ کہ شادی بھی عورت کی زندگی میں کوئی فرق نہیں لاتی تھی۔ اگر بیوی اپنے خاوند یا ساس کو ناخوش کرتی تو اسے واپس والدین کے پاس بھیج دیا جاتا اور کبھی کبھی تو معاشی دباؤ کی بنیاد پر سیدھا سیدھا اسے کسی مالدار شخص کے ہاتھ کرایہ پر دے دیا جاتا، **Lease** کیا جاتا یا بیچ دیا جاتا۔ اس کی پوزیشن مزید کمزور تب ہو جاتی جب وہ بچہ پیدا نہ کرتی۔ عورت کا فرض تھا کہ وہ نرینہ وارث در وارث جنے، اگر وہ ساری کی ساری لڑکیاں جنتی تو پھر ایک داشتہ لائی جاتی تھی جو یہ فریضہ انجام دیتی۔ عورت کی حالت

اس وقت قدرے بہتر ہوجاتی جب وہ بیٹا پیدا کرتی اور جب اس کے ہاں بہو آجاتی تو پھر تو گویا یہ مالکن بن جاتی (5)۔

ساری شادیاں باپ منظّم کرتا تھا۔ حتیٰ کہ دولہا دلہن نے شادی کے وقت تک ایک دوسرے کو دیکھا تک نہ ہوتا تھا۔ شادی کے ذریعے خاندانوں کے بیچ پرانے اتحاد تازہ کئے جاتے اور نئے اتحاد تشکیل پاتے۔ فیوڈل لوگ دو یا زیادہ بیویاں رکھتے تھے۔ ایک چینی فلاسفر ’’کوہنگ منگ‘‘ نے اس کثرتِ ازدواج کو یوں نظریاتی پاجامہ پہنایا تھا: تم نے چائے دانی تو دیکھی ہوگی۔ جس کے پاس چار پیالیاں رکھی ہوں۔ کیا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ ایک پیالی کے پاس چار چائے دانیاں رکھی گئی ہوں؟۔(6)

بچوں کے لئے کہاوت مشہور تھی: ایسا سامان جس پر تم نے پیسہ برباد کرلیا۔ بیویوں کیلئے مشہور کہاوت تھی: اگر تم ایک کتے سے شادی کروتو کتے کی پیروی کرو، اگر تم ایک مرغے سے شادی کروتو مرغے کی پیروی کرو۔(7)

ان سب بکواسیات کو نظریاتی تحفظ کنفیوشس دیتا تھا۔ اس سے بڑا منحوس دانشور دنیا میں نہ ہوگا۔ اس کا ایک ہی فرمان ہمارے رونگھٹے کھڑے کرنے کے لئے کافی ہے: ’’عورتیں تین فرماں برداریاں کریں: اگر وہ غیر شادی شدہ ہے تو باپ کی فرمانبرداری کرے، شادی شدہ ہے تو خاوند کی، اور بیوہ ہے تو بڑے بیٹے کی‘‘۔(8)

مزید ایک جگہ ارشاد ہوا: ’’عورتیں بلاشبہ انسان ہیں مگر وہ مردوں کی نسبت بہت کم درجے کی ہیں۔ اور وہ کبھی بھی ان کے مکمل برابر نہ ہونگی‘‘۔ کنفیوشس چاچا نے اپنی بیوی کو اچھا کھانا نہ پکانے کے قصور پہ طلاق دے دی تھی۔(9)

اس بدترین فیوڈل ازم کے پس منظر میں جدید چینی ادب کی نمو ہوئی۔ اور اسی درندگی کے پس منظر میں اس نظام کے بدترین دشمن لوہسون کی ذہنی بالیدگی ہوئی۔

وہ 1908 میں بادشاہ دشمن انقلابی پارٹی میں شامل ہوئے اور 1911 کے انقلاب تک اس گروپ میں سیاست کرتے رہے۔

1910-11 میں وہ شاؤشنگ مڈل سکول کے ٹیچر بنے۔ 1911ء کے انقلاب میں انہوں نے بھی انقلابی طاقتوں کا ساتھ دیا اور اس جمہوری انقلاب میں حصہ لیا جس نے قنگ سلطنت کو گرادیا۔ اس جمہوری جدوجہد میں مرد، عورتیں، جوان، بوڑھے سب شامل تھے۔ سن یات سن کی قیادت میں جمہوری انقلاب کی جدوجہد میں شامل عورتوں میں سے ایک اس کی بیوی سونگ قن لنگ تھی، ہی ژیانگ نِنگ تھی، صوفیہ چانگ تھی، ساؤمے چنگ تھی اور جِن جِن تھی۔

جِن جِن (1875 تا 1907) جمہوری انقلاب کی جدوجہد میں ایک زبردست متحرک ہستی رہیں۔ وہ عورتوں کی سماجی برابری کی بڑی وکیل تھیں۔ ان کی شاعری کا یہ ٹکڑا ملاحظہ ہو:

ماوتی آجوئیءَ لوٹوں
پہ وتی آزادیءَ ما یک کدّ ہے تنگوں
مردوزوال برابریءَ پیدا ایشغنت
گڑہ پچے بلّوں مرداں
بادشاہ
ما پادکاؤں وثار بھچینوں
قومءَ ژہ بے لجیءَ آزادکنوں
جون آف آرکءِ سنّتءَ
وتی جندءَ دستاں وتی ڈیھءَ گڑدوں گروں (10)

سن یات سن کا گروہ عورتوں کے حقوق کا ساتھ دیتا رہا۔ وہ عورتوں کے کاز کی پشت پناہی کرتا تھا، چینی عورتوں کی طرف سے اور ان کے بارے میں لکھے جانے والے ڈراموں کو

سپانسر کرتا تھا۔

بیجنگ میں ایسی تنظیمیں بننے لگیں جو پاؤں باندھنے، داشتہ گیری، کم سنی کی شادیوں اور رنڈی بازی کی مخالفت کرتی تھیں۔ اور عورتوں کے لئے سیاسی حقوق اور تعلیم کی جدوجہد کرتی تھیں ان کا اہم مقصد ووٹ کے حق کا حصول تھا۔

یہ ایک بھرپور جدوجہد تھی جس میں مزدور، کسان، طالب علم اور دانشور کلیدی کردار ادا کر رہے تھے۔ آیئے ذرا اس انقلاب کو اس میں شریک بڑے شاعر تونگ پی وو کے الفاظ میں دیکھتے ہیں۔ اس کی نظم کا عنوان ہے:

''انقلاب 1911 کے واقعات کے صفحہ اول پر لکھا گیا''

پل بھر میں پچاس برس گزر گئے ہیں
حکومتوں کی بدلتی ہوئی تقدیروں کے پردے الٹتے ہیں
چنگ سلطنت کا اژدھائی پرچم
ہمیشہ کے لئے بہتے دریا میں غرق ہو چکا ہے

جاگیرداری نظام کی بساط بورژوا جمہوریت نے الٹ دی ہے
جاگیردار باقیات کی خوفناک مزاحمت کے باوجود
شہنشاہی کا داغدار پھول دلدل میں گر گیا ہے
دو مرتبہ واپسی کی کوشش ہوئی۔۔۔ مگر بیکار

جہاں طبقات ہونگے، جدوجہد ضرور ہوگی
ان واضح تضادات کے سبب جو موجود ہونگے۔
گزرے دنوں کا سوچ کر مجھے تاسف ہوتا ہے

کہ ہم کئی بار دوست اور دشمن کی تمیز کھو بیٹھے تھے

تین بوجھل چٹانیں ہم پر بہت بھاری تھیں
مگر عوام کا اتحاد مضبوط تر نکلا
''نیا جمہوری انقلاب'' برپا کر کے
عوام چین کو ایک نئے زمانے میں لے آئے ہیں
ہمارے پاس اچھے رہنما تھے اور عوام کی طاقت تھی
اور یہ ضروری تھا کہ کارکن متحد رہتے
فتح اور شکست محض اتفاق کی بات نہیں ہوتی
ہمیں اچھے تجربات کا اچھی طرح تجزیہ کرنا چاہیے

(31 اگست 1961)

مگر 1911 کے انقلاب نے نہ مزدوروں کو کچھ دیا، اور نہ کسانوں کے لئے آسانیاں پیدا کیں۔ اس انقلاب نے کوئی بنیادی اصلاحات نہ کیں اور عورتوں کی توقعات کا ادراک نہ کیا۔ جو آئین بنا اس نے عورتوں کے حقِ رائے دہی سے انکار کر دیا۔

لوہسون بھی بہت جلد اس انقلاب سے مایوس ہو گئے۔ کیونکہ اس میں بادشاہت کے خاتمے پر بوژوا حکومت قائم ہو گئی تھی اور استحصالی نظام جُوں کا توں برقرار رہا تھا۔ 1911 کا یہ انقلاب سن یات سن کی قیادت میں ہوا تھا جس نے فنگ بادشاہت کا خاتمہ کر دیا تھا مگر وہ سامراجی اور فیوڈل ظلم و استحصال کا تختہ الٹنے میں کامیاب نہیں ہوا۔ اس نے بادشاہ سلامت کے بستر ے تو گول کر دیے مگر چین کو سامراج اور فیوڈل استبداد میں ہی رہنے دیا۔ اس طرح سامراج دشمن اور فیوڈل دشمن انقلابی فریضہ نامکمل رہ گیا۔۔۔ لوہسون کمیونسٹوں کے حامی بن گئے۔

1912ء میں عبوری حکومت کی وزارتِ تعلیم پیکنگ آ گئی تو لوہسون بھی قدیم چینی ادبیات کے مدیر و محقق کی حیثیت سے پیکنگ آ گئے۔ یہاں دیگر ملازموں کی طرح ان پر بھی ہر وقت رجعتی صدرِ جمہوریہ چین کے جاسوس نگرانی کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ یہ عرصہ لوہسون نے انتہائی غصے، پریشانی اور تنہائی کے عالم میں گزارا۔ البتہ وہ گہری نگاہ سے ملکی صورتحال کا تجزیہ کرتے رہے۔ انہوں نے نوجوانوں کی ذہنی تربیت کی طرف توجہ کی۔ وہ آزادی اور آزادیِ رائے کے متوالے تھے۔ اس زمانے میں چینی دانشوروں اور نوجوانوں میں ایک ثقافتی نشاطِ ثانیہ پیدا ہوئی جنہوں نے چینی معاشرے کے بنیادی ڈھانچے اور روایتی نظریے پر سوالات کرنا شروع کر دیئے۔ بالخصوص فیوڈل معاشرے میں عورتوں کی حیثیت کے بارے میں۔

1917 میں روس میں انقلاب برپا ہوا جس نے بین الاقوامی سرمایہ داروں کو ہلا کر رکھ دیا اور پوری دنیا کے محکوموں کو امید بخشی۔ لوہسون بھی اس انقلاب سے زبردست طور پر متاثر ہوئے۔ روسی انقلابیوں کے بارے میں انہوں نے کہا تھا: ''انہوں نے اپنی اعلیٰ آدرشوں کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دیا۔۔۔ وہ دشمن کے ہتھیاروں کو اپنی ہڈیوں سے چھلنی کرتے رہے اور شعلوں کو اپنے خون سے بجھاتے رہے۔ جب تلوار کی چمک اور آگ کی دھک مر گئیں تو انہوں نے صبحِ صادق کی پہلی کرن دیکھی، ایک نئے عہد کی صبح''۔

روسی حقیقت پسند لٹریچر نے پوری دنیا کی طرح لوہسون کے پورے شاندار کیریئر کو اہم طور پر متعین کیا۔ سوویت ادبی جگمگاتے ستاروں میں سے شدرن، چیخوف، گرشین اور گورکی ان کے پسندیدہ ادیب بنے۔ چینی مارکسسٹوں نے ایک مجسم کلیدی نعرہ ''سامراج مردہ باد'' پیش کیا۔ ان کے خیال میں حکمران طبقے اور اقتدار اور پرانے معاشرے کا ملکیتی ڈھانچہ ترقی کی راہ میں اصل رکاوٹ کی حیثیت رکھتے تھے۔ وہاں لی تا چاؤ نے انقلاب کی راہ اپنائی اور تختہ دار پر پہنچ کر انقلاب کے اولین شہداء میں نام پایا۔ (11)

دراصل 1917 کے روسی انقلاب سے بہت پہلے ہی چین میں دانشوروں اور طلباء کے ایک گروپ نے مارکسزم کو گلے لگا لیا تھا۔ چین میں کمیونزم کے اولین دوستوں میں سے ایک ''لی ڈاژاؤ'' نے مارکسزم پہ 1912 سے مضامین لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ اور اس کے کئے ہوئے مارکس اور لینن کے تراجم نے انقلابی خیالات کی بنیاد رکھ دی تھی۔ طلباء کی سوسائٹیاں قائم کی گئی تھیں تا کہ مارکسزم کا لٹریچر تخلیق اور تقسیم ہو۔ ان ساری سرگرمیوں کا چین کے نوجوانوں پر بہت زبردست اثر پڑا۔

ادبی اور ثقافتی ابھار کے نتیجے میں سینکڑوں نئے رسالے شائع ہونے شروع ہوئے۔ ''نئی جوانی''، ''نشاطِ ثانیہ'' جیسے ریڈیکل رسالے۔ ''نئی عورت''، ''عورتوں کی گھنٹی''، ''گرلز ڈیلی آف کیٹن''، ''دی وومنز منتھلی'' وغیرہ وغیرہ۔ ان رسالوں میں چین کے فیوڈل سماج کے پورے ڈھانچے کو چیلنج کیا جانے لگا اور بہت متاثر کن انداز میں نئے تصورات پیش ہونے لگے۔ لوہسون جیسا نابغہ ادیب اس اہم عصر مباحثے میں سرگرم طور پر شامل تھے۔

جنوری 1918ء میں لوہسون رسالہ ''نئی جوانی'' کے شعبہ ادارت میں شامل ہو گئے۔ 15 مئی 1918ء کو ان کا عظیم افسانہ ''پاگل کی ڈائری'' اسی رسالے میں شائع ہوا۔ اس افسانے نے پورے چین کو ہلا کر رکھ دیا۔ کیوں کہ اس میں کہا گیا تھا کہ چین کا جاگیردارانہ معاشرہ آدم خوروں کا معاشرہ ہے جہاں ہر شخص دوسرے شخص کو کھا رہا ہے اور جو شخص اس آدم خوری کی نشاندہی کرے وہ ''پاگل'' کہلاتا ہے۔ اس کہانی نے فیوڈل پدرسری نظام کی تباہ کاریوں کو بے نقاب کیا، اور فیوڈل اخلاقیات کی اصلیت بتا دی۔ وہ ایک پاگل شخص کی آنکھوں سے فیوڈل اخلاقیات کی ناترسی بیان کرتے ہیں۔ (12) ''ایک پاگل کی ڈائری'' میں حقیقی انقلابی فکر موجزن ہے اور اس میں انقلابی فکر کو جدید آرٹ کے چوکھٹ کے ساتھ خوبصورتی سے بیان کیا گیا۔ ''پاگل کی ڈائری'' کو جدید چینی فکشن کے اولین شاہکار کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

لہسون بے شمار لیفٹسٹ تنظیموں کے بانی ممبر بنے۔ جن میں بائیں بازو کے رائٹرز کی لیگ، چائنا فریڈم لیگ، شہری حقوق کے دفاع کی لیگ شامل ہیں۔

اپنے مشہور مضمون ''عصمت پہ میرے خیالات'' (1918) میں وہ کنفیوشس کی اخلاقیات پہ کڑی تنقید کرتے ہیں۔ انہوں نے ہِن اور یانگ کے نر اور مادے کے قوانین پر مبنی دلائل کو ''بالکل لغو'' قرار دیا اور کھل کر لکھا: ''یہ ثابت کرنے کی گنجائش نہیں کہ یانگ، ہِن سے زیادہ اشرف ہے، یا نر مادہ سے اعلیٰ ہے۔ اس کے علاوہ سماج اور ریاست کو صرف مرد نہیں بناتے۔ اس لئے ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ مرد و زن برابر ہیں۔ (13)

چین کی عورت پہ صدیوں سے جاری ظلم کو مسترد کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

''عورتوں پہ رحم آنا چاہیے۔ بغیر کسی وجہ کے روایت کی جال میں پھنسی ان کو بغیر کسی مقصد کے قربان کیا جاتا رہا ہے۔ ہمیں ان کے لئے ایک بہت بڑا میموریل سروس کرنا چاہیے۔ مرنے والوں پہ ماتم کرنے کے بعد ہمیں عہد کرنا چاہیے کہ ہم مزید ذہین بنیں گے، بہادر بنیں گے، بلند حوصلہ بنیں گے اور ترقی پسند بنیں گے۔ ہمیں ہر طرح کا نقاب اکھاڑ پھینکنا چاہیے۔ ہمیں دنیا میں ہر اُس احمقیت اور استبداد کو برباد کرنا چاہیے جو دوسروں کو بھی زخمی کرتا ہو اور خود ہمیں بھی''۔ (14)

لوہسون نے عصمت کے مسئلے پر دوہرے معیار پر تنقید کی اور اس الزام کا مذاق اڑایا کہ بے حجاب عورتیں سماج کو تباہ کر رہی ہیں:

''بے حجاب عورتیں کس طرح ہمارے ملک کو خراب کر رہی ہیں؟۔۔۔ بزدلانہ طور پر ارتکاب کرنے والے جرائم کی کوئی حد ہی نہیں، اور جنگ' ڈاکے، قحط اور سیلاب یکے بعد دیگرے آتے ہیں۔۔۔ مزید برآں ساری حکومت، فوج، اکیڈمک اور تجارتی پوسٹیں سب کی سب مردوں سے بھری ہوئی ہیں نہ کہ بے حجاب عورتوں سے۔ اور یہ بات بعید از قیاس ہے کہ حکمرانی والے مردوں پر ایسی عورتوں نے اس قدر جادو کر رکھا ہے کہ وہ غلط اور صحیح کا ہر احساس کھو دیتے ہیں اور عیاشی میں غرق ہو جاتے ہیں''۔ (15)

1918 میں ابسن کی کتاب Doll's House کا چینی میں ترجمہ ہوا۔ یہ ترجمہ بہت مقبول ہوا۔ گھر چھوڑنے کا نورا کا اقدام بہت زیر بحث آیا۔ حتیٰ کہ 1923 میں بیجنگ ویمن کالج میں لوہسون کا ایک لیکچر اسی عنوان سے ہوا: ''گھر چھوڑنے کے بعد نورا پہ کیا بیتی؟''۔ اس لیکچر کا اختتام وہ اس بات پر کرتے ہیں کہ معاشی آزادی کے بغیر اس معاشرے میں اُس کیلئے واحد راستہ فاقہ کشی تھا، واپس جانا تھا، یا ایک رنڈی بننا تھا۔

''گھر چھوڑنے کے بعد وہ خراب ہونے یا واپس جانے سے نہیں بچ سکتی تھی۔ بصورت دیگر سوال اٹھتا ہے: وہ اپنے ساتھ کیا لے گئی سوائے اپنے جاگے ہوئے دل کے؟ اگر اس کے پاس کچھ نہ تھا سوائے اس طرح کے ایک سرخ رنگ کے پشمینہ سکارف کے جو کہ آپ نوجوان خواتین نے پہن رکھے ہیں، خواہ یہ دو تین فٹ لمبا ہی کیوں نہ ہوتا تب بھی یہ ہر طرح سے بیکار ثابت ہوتا۔ اسے اس سے زیادہ کی ضرورت ہے، اسے اپنے بٹوے میں کچھ چاہیے۔ زیادہ واضح الفاظ میں کہوں کہ اسے پیسے کی ضرورت ہے''۔

یہ عظیم عوامی بے چینی بالآخر اس پر منتج ہوئی کہ 4 مئی 1919 کو بیجنگ کے طلباء سرکاری دفاتر کے باہر جمع ہو گئے جہاں اس وقت وزرا جاپانی سفارتکاروں سے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ پولیس نے مظاہرین پر گولی چلا دی۔ اور کئی کو گرفتار کر لیا۔ اس پر ملک بھر میں طلباء اٹھ کھڑے ہوئے۔ قومی بورژوا طبقے نے بائیکاٹ اور دیگر کارروائیاں شروع کر دیں۔ شنگھائی میں، برطانوی ملکیت کھائی لان کوئلے کی کانوں میں، اور بیجنگ۔ ہانکھو ریلوے کے مزدوروں نے چین کی پہلی ہڑتال کی۔ (16) سرکار خوفزدہ ہو گئی اور اسیر طلباء کی رہائی کا حکم دیا۔ جن وزیروں کے خلاف مظاہرے ہوئے تھے انہوں نے 28 جون کو استعفےٰ دے دیئے۔ چین نے اعلان کیا کہ وہ ورسائی معاہدے پر دستخط نہیں کریگا۔ واضح رہے کہ چار مئی کی تحریک روس میں اکتوبر سوشلسٹ انقلاب کے دو سال بعد ابھری تھی۔

دراصل چینی کمیونسٹ پارٹی نے اپنی پوری سیاست چار مئی 1919 کی تحریک کی دانش ورانہ خمیر سے شروع کی۔ گو کہ سن یات سن جیسے سیاسی نظریہ دان اور سرگرم لوگ بڑی شدو مد کے ساتھ سیاسی اور معاشی ماڈرنائزیشن کیلئے کام کر رہے تھے، مگر وہ زیادہ تر کنفیوشن ازم میں اپنی بنیادیں رکھے ہوئے تھے۔ لیکن 4 مئی کی تحریک نے روایتی کنفیوشن ثقافت کی مکمل تباہی کو اپنا خاص الخاص مقصد بنایا تھا۔ 4 مئی کی تحریک کنفیوشن ازم کی بجائے ایک ایسی ثقافت چاہتی تھی جو کہ مغربی ثقافت اور عقیدوں سے مشابہت رکھتی ہو۔ 1917 اور 1923 کے درمیان پروفیسروں، طالب علموں، دانشوروں اور انقلابیوں نے تحریک چلائی کہ مغربی سائنس، کلچر، اور جمہوری اصولوں کو اپنایا جائے۔ یہ لوگ جمہوریت اور سماجی مساوات کا مطالبہ کر رہے تھے۔ یہ پانچ برس کا دورانیہ جسے کچھ لوگ ''چینی نشاۃ ثانیہ'' بھی کہتے ہیں۔ کنفیوشس کے عہد کے بعد شاید چین میں سب سے زیادہ دانشورانہ انقلابی عہد تھا۔ اس تحریک کو ''جدید ثقافتی تحریک'' کہتے ہیں۔ یہ لوگ نام نہاد رواج و روایات اور رسوم کو مسترد کر رہے تھے۔

اس تحریک نے چینیوں، بالخصوص چینی طالب علموں کو سیاسی بنا ڈالا۔ ''جدید ثقافتی'' مفکروں نے حکومت، تعلیم، ثقافت، معیشت اور مغربی سائنس کے اپنے نظریات کتابوں اور رسالوں میں چھپوائے۔ اس کثیر تعداد میں اور اس قدر کھلے بندوں ایسا مواد چین کی پوری تاریخ میں نہ چھپا تھا۔ جلد ہی چینی طالب علم اپنے رسالے نکالنے لگے اور چین کی ہر روایت، ہر رواج پر ڈنڈے برسانے لگے۔ انہوں نے کنفیوشن ازم، شیاؤ، چینی کلاسیک اور جدید کنفیوشین سائنس پر تابڑ توڑ حملے کئے۔ ''جدید ثقافتی تحریک'' اور اس کے حامی طلباء نے چینی ثقافت کے کسی بھی حصے کو نہیں بخشا۔ انہوں نے چین کی ہر روایت کا مذاق اڑایا، ہر بات پہ تنقید کی۔ حکومت کے بارے میں روایتی چینی نظریات، بالخصوص ان کی تنقید کا نشانہ بنے۔ اس سرگرمی اور دانشورانہ ابھار نے ایک بڑے پیمانے کی بغاوت کو چنگاری دی اور چار مئی کی تحریک ابل پڑی۔

4 مئی کی تحریک میں خواتین رائٹرز بھی زبردست تخلیقات جاری رکھے ہوئے تھیں۔ ایک دو نہیں بلکہ ایک جھرمٹ تھا خواتین کی' جن کی تحریروں نے ایک نئے عہد کی بات کی۔ فیوڈل دشمنی اور جمہوریت نوازی کی صدا پر لبیک کہتے ہوئے قلم اٹھایا۔ اور فرد کی آزادی اور مرد وزن کی برابری کی وکالت کرنے لگیں۔ انہوں نے اپنی تخلیقات کے تیر ٹھیک ٹھیک نشانے پر رکھے۔۔۔۔ اور نشانہ تھا فیوڈل اخلاقیات۔۔ انہوں نے والدین کی طرف سے طے کی جانے والی شادی کے خلاف بغاوت کر دی، اور اپنی پسند یعنی محبت کی شادی کرنے کے حق میں لکھا۔ (17)۔

4 مئی کی تحریک کا نقطہ عروج وہ تھا جب پہلی جنگ عظیم میں جاپان نے چین کے شانگ تنگ پر قبضہ کیا تھا۔ جنگ کے آخر میں جاپان نے شان تنگ اپنے پاس رکھنے پر اتحادی قوتوں کو مجبور کیا اور ''معاہدہ ورسیلز'' پر دستخط ہوئے جس کے تحت یہ علاقہ جاپان کو مل گیا۔ 4 مئی 1919 کو اس معاہدے نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور چین بھر میں قوم پرست جذبات بھڑکا دیئے۔ طلباء نے تیان من سکوائر پر بہت بڑا احتجاجی جلوس نکالا۔ (18) یہ چینی تاریخ میں پہلا عوامی جلوس تھا۔ اس میں انہوں نے قومی آزادی، جمہوریت۔ لسانی اصلاحات، سائنس کی تدریس اور کنفیوشس فلسفہ اور توہمات سے رشتہ توڑنے کے مطالبات پیش کئے۔

4 مئی کی تحریک چینی تاریخ میں بہت اہمیت رکھتی ہے اس لئے کہ اس نے ''جدید ثقافتی تحریک'' میں دانشورانہ انقلاب کی ایک نئی لہر دوڑا دی۔ اس کے بہت سارے لیڈر جو کہ پرجوش مغرب نواز تھے وہ ''ورسیلز کانفرنس'' پہ چین سے بے وفائی کرنے پر بہت مایوس ہوئے۔ ان تلخ دانشوروں نے مارکسزم کی طرف رجوع کیا اور وہ 1917 کے بالشویک انقلاب کے اسباق کی طرف مائل ہوئے۔ اس طرح ''جدید ثقافتی تحریک'' نے چینی کمیونسٹ پارٹی کی داغ بیل ڈال دی۔

4 مئی چین کے یوم بیداری کی سالگرہ ہے۔ فرانس کے آندرے مالرو کے

ناول ''انسان کا مقدر'' کے پس منظر میں شنگھائی کی یہی خون ریزیاں تھیں۔

چینی کمیونسٹ پارٹی کے بانی اسی ''جدید ثقافت تحریک'' کے ممتاز لیڈر لی تاچاؤ اور چین تو شو تھے۔ 20 جولائی 1921 میں پارٹی کی پہلی کانگریس منعقد ہوئی جس میں بارہ چینی مندوب تھے اور کمنٹرن (کمیونسٹ انٹرنیشنل) کی طرف سے دو مندوب۔ ماؤزے تنگ ان میں شامل تھے۔

یہ ہوتے ہیں اثرات دانشوروں کی سچی تحریروں کے۔ اور ان دانشوروں نے کسی قسم کی موقع پرستی نہ دکھائی۔ لوہسون اور ان کے ساتھیوں نے چینی ادیبوں اور آرٹسٹوں کو نچلے طبقات کی غیر انسانی زندگی کے بارے میں شعور دیا۔

لُوہسون دیوانہ وار 4 مئی کی تحریک میں شامل ہو گئے اور کنفیوشس کے فلسفے کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ ان کا خیال تھا کہ کنفیوشس کا فلسفہ ہمیشہ سے چین کے جاگیرداروں کا سب سے بڑا ہتھیار رہا ہے جس کی مدد سے وہ صدیوں سے چینی عوام کا استحصال کرتے رہے ہیں۔ کیونکہ یہ فلسفہ عوام میں خوئے غلامی پیدا کرتا تھا۔ کمالِ ذہانت وجرأت کے سبب وہ کنفیوشس دشمن فکری تحریک اور ثقافتی انقلاب کے عظیم رہنما بن گئے۔ انہوں نے چین کے قدیم تصوراتِ اخلاق کے فریب کے پردے بھی چاک کیے۔ ایک جگہ وہ لکھتے ہیں: ''اگر چینی علوم کا لُبِ لباب غیر معمولی طور پر اچھا ہے تو پھر ایسا کیوں ہے کہ چین کے موجودہ حالات غیر معمولی طور پر خراب ہیں؟ میرے ایک دوست نے نہایت مناسب پیرائے میں کہا کہ لُبِ لباب کو اس قابل ہونا چاہیے کہ وہ ہماری حفاظت کر سکے نہ کہ ہم اس کی حفاظت کریں۔''

لوہسون فیوڈل ازم کے بدترین دشمنوں میں سے تھے۔ وہ نہ صرف ان پڑھ عام انسان کی حالتِ زار بیان کرتے ہیں جو کہ فیوڈل توہمات میں گھرا ہوا ہے بلکہ وہ پوری دیہی زندگی کی کبھی نہ بدلنے والی حالت کی بھی تصویر کشی کرتے ہیں۔ چینی کسان لوہسون کے افسانوں کا مرکز ہے اور انہی کے حالات بدلنا اس کا مطمع نظر۔ کسان کی بھوک، اس کی کثرت اولاد، اس پہ مالیے اور ٹیکسوں کا بوجھ، جنگیں، ڈاکو، کرپٹ سرکاری افسر اور ظالم و ناترس جاگیردار۔ ان سب سے لوہسون کی دشمنی تھی۔

وہ فیوڈل سماج کو آئیڈیل کبھی قرار نہیں دیتے تھے۔ ان کا تو کہنا تھا ''چین کو قدیم کہنا اس کا مذاق اڑانا ہے۔ آج اپنے ابتر حالات میں بھی اگر ہم دوسروں کو بتاتے ہی چلیں کہ ہمارے آباؤ اجداد کتنے مالدار اور دولتمند تھے، ان کے کتنے بڑے بڑے محل تھے، کیا جواہرات تھے ان کے پاس، اور وہ دوسروں سے کس قدر معتبر اور باوقار تھے۔۔۔ تو کیا ہم لوگوں کو خود پہ ہنسانے کا موقع نہیں دے رہے؟'' (19)۔ انہوں نے روایت پرستی کے سارے گڑھوں کے خلاف تابڑ توڑ حملے جاری رکھے۔ یہ گڑھے تھے: قدیم ادب، قدیم اخلاقیات، قدیم انسانی رشتے، اور کنفیوشس کا استبدادی فیوڈل فلسفہ۔ انہوں نے قدیم طرز ہائے فکر، قدیم رواجوں، سردار و سرکار کے ساتھ شخصی وفاداری، پدرسری نظام، توہمات، مرد اور عورت کی عصمت کی پاکیزگی کے دوہرے معیار، فیوڈل خاندانی نظام اور سب سے بڑھ کر بادشاہت، نوابیت اور وار لارڈ ازم کے خلاف ان تھک حملے جاری رکھے۔ لوہسون اور اس کے ساتھی اپنے سماج کے دانشوروں کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگا رہے تھے اور انہیں ایک نئی ادبی ثقافت کی طرف متوجہ کر رہے تھے۔ چین کے پرانے رجعتی فیوڈل (رجعتی صرف مذہبی نہیں ہوتا) روایت اور ثقافت کے بارے میں لوہسون نے کہا ''چینی ثقافت آقا کی خدمت گزاری کی ثقافت ہے۔ آقا لوگ ہزاروں مجبوروں کی تکالیف کی قیمت پر متحد ہیں۔ جو لوگ چین کی ثقافت کی تعریف کرتے ہیں، خواہ وہ چینی ہیں یا غیر ملکی، وہ دراصل حکمران طبقہ سے اپنی وابستگی چھپا رہے ہوتے ہیں۔۔۔۔ جو لوگ قدیم لٹریچر جانتے ہیں وہ ایک زبردست حیلہ بناتے ہیں۔ جب بھی کوئی نیا تصور پیش ہوتا ہے تو وہ اسے ''کفر'' گردانتے ہیں اور اسے تباہ کرنے کے لئے اپنی ساری توانائیاں یکجا کرتے ہیں۔ اور اگر یہ نیا آئیڈیا ان کی کوششوں کے خلاف اپنی جدوجہد سے اپنے لئے کوئی مقام بنا لیتا ہے تو پھر وہ انکشاف کرتے ہیں ''یہ وہی چیز ہے جو ہزاروں

سال پہلے کنفیوشس نے بتائی تھی''(20)

4 مئی کی تحریک کے اسباب ونتائج میں لوہسون کی کہانی ''پاگل کی ڈائری'' بہت مشہور ہے۔ یہ کہانی ایک پاگل شخص کی ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ صرف وہی دماغی طور پر تندرست ہے اور بقیہ ساری دنیا پاگل۔ اسی زمانے میں ''دوائی'' بھی لوہسون کے غنی قلم سے نکلی کہانی تھی۔

لوہسون کے کسیلے پن، کسی حد تک ویسٹرنائزڈ سوچ وطرز اور چین کے فیوڈل روایات پر ہمہ وقت طنزیہ حملوں نے اسے چین کا سب سے بڑا تنقید نگار اور ادیب بنا دیا۔ اس کی ''آہ کیو کی سچی کہانی'' (1921)، چین میں 20ویں صدی کے اوائل کی قدامت پسندی پر ایک تباہ کن تنقید تھی۔ یہ 4 مئی کے زمانے کی نمائندہ تصنیف اور ایک بین الاقوامی کلاسیک قرار پائی۔

یہ کہانی دراصل اس زمانے کے چین کے دیہات میں طبقاتی تصادموں کو بیان کرتی ہے۔ وہ اس کہانی میں چینی کسانوں کے باشعور ہونے کی امید رکھتے ہیں اور انقلاب کی توقع کرتے ہیں۔ یہ کہانی دراصل 1911 کے انقلاب کی تصویر ہے۔ اس میں لوہسون چین کو مغربی تہذیب اور ٹیکنالوجی کے اثرات سے نمٹنے کے لئے ''ناتیار'' دیکھتا ہے۔ اس کہانی نے عالمی شہرت حاصل کی۔ اور اسی ''آہ کیو کی سچی کہانی'' کو تخلیق کرنے کے بعد وہ مارکسسٹ رائٹر قرار پائے۔ اور یہ چینی ادب کی تاریخ میں عظیم ترین تحریروں میں سے ایک ہے۔

ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے:

''آہ کیو، بھی ایک سخت اخلاقیات والا آدمی تھا۔ وہ ہمیشہ ''مرد وعورت کو سختی کے ساتھ الگ رکھنے کا قائل تھا۔۔۔۔۔ اس کا خیال تھا کہ ''اگر ایک عورت سڑک پر اکیلی چل رہی ہو تو لازمی طور پر وہ ہر برے آدمی کو گناہ کی ترغیب دینا چاہتی ہوگی۔ اگر ایک مرد اور عورت آپس میں بات کر رہے ہوں تو یقیناً ملاقات کا انتظام کرنے کا کہہ رہے ہونگے۔ ایسے لوگوں کو سیدھا کرنے کے لئے وہ غصے سے سرخ ہو جاتا، بلند اور کاٹ ڈالنے والے جملے کستا، اور اگر جگہ ویرانہ ہوتی، تو پیچھے سے ایک پتھر پھینکتا''۔

''سال نو کی قربانی'' ان کی ایک اور بہت ہی مشہور کہانی ہے۔ جس میں وہ ایک عام محنت کش عورت کی زندگی کا نقشہ کھینچتے ہیں۔ اس کی زندگی اور اس کے دل کی کیفیات کا کھوج لگاتے ہوئے لوہسون پورے سماج کا ایک جامع تجزیہ کر ڈالتے ہیں۔ اس عورت پہ سماجی دباؤ کا ذکر کرتے ہیں اور کنفیوشس کی غیر انسانی اخلاقیات کا ذکر کرتے ہیں جس سے اس عورت کی زندگی تباہ ہو جاتی ہے اور عزتِ نفس برباد ہو جاتی ہے۔

لوہسون اور اس کے 4 مئی تحریک کے اس کے ہم رکابوں نے عورتوں پہ اس ظالمانہ جبر کی ڈٹ کر مخالفت کی۔ انہوں نے فیملی لائف اور عورت کی سماجی پوزیشن کے لئے نئے تصورات پیش کئے۔ انہوں نے کوآپریٹو انتظامات اور پبلک نرسریوں کے ذریعے بچوں کی دیکھ بھال اور گھریلو کام کاج کے بھاری بوجھ سے عورتوں کی نجات کے لئے جدوجہد کی۔

لوہسون کنفیوشن ازم کے بدترین مخالفوں میں سے تھے۔ کنفیوشس بادشاہ سلامت کو ہر وقت مستحکم حکومت کے لئے مشورے دیا کرتا تھا۔ ''سماجی ذمہ داریاں'' اس کے فلسفے کی چابی تھیں۔ بیٹے کی باپ کو فرمانبرداری کرنی ہے۔ بیوی شوہر کی فرمانبرداری کرے، چھوٹا بھائی بڑے بھائی کی، رعیت حاکم کی (21)۔ کنفیوشس کا سارا فلسفہ حکام کی فرمانبرداری، فرد کی حکومت، خاندان، اور خاندان کے بڑوں کے سامنے سرنگونی، اور روایات کو بلاچون وچرا تسلیم کرنے پر زور دیتا ہے۔ لوہسون کنفیوشن ازم کو استبدادی اور منافقانہ فلسفہ قرار دیتے ہیں جو کہ استحصال، ناانصافی، عدم مساوات، مفعولیت اور تسلیم ورضا کو بڑی باریکی سے چھپاتا بھی ہے اور اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے۔

1921ء میں چینی کمیونسٹ پارٹی کے وجود میں آنے کے بعد وہ اس کی طرف امید کی نگاہوں سے دیکھنے لگے تھے۔ پارٹی نے چینی مزدور طبقے کے ساتھ مارکسزم کو مضبوطی سے

جوڑتے ہوئے قبضہ کر جاپانیوں اور دیگر سامراجی قوتوں کے ساتھ علی الاعلان ٹکر لینے کا فیصلہ کیا۔لوہسون اس لائن کو ہمدردی اور پیار سے دیکھنے لگے۔انہوں نے اعلان کیا کہ ''لٹریچر طبقاتی جدوجہد کا ہتھیار ہوتا ہے''(22)۔

لوہسون نے 1925 کے آخر میں فکشن لکھنا ترک کر دیا اور پیکنگ سے شنگھائی منتقل ہونے کے بعد اپنی پوری تخلیقی قوت روسی لٹریچر کے ترجمے اور کاٹ ڈالنے والے طنزیہ مضامین لکھنے پر صرف کردی۔اور یہ دونوں اصناف اس کا ٹریڈ مارک بن گئے۔1925ء میں خواتین یونیورسٹی پیکنگ کی طالبات نے کالج کے رجعت پرست صدر کے خلاف تحریک چلا کر اسے کالج سے نکال دیا۔لوہسون اس زمانے میں وہاں بطور استاد تعینات تھے۔چنانچہ انہوں نے ان طالبات کی کھل کر حمایت کی۔1926ء میں اسی یونیورسٹی کی ایک طالبہ دیگر نوجوانوں کے ساتھ جلوس میں ماری گئی تو لوہسون نے اس کی یاد میں پر جوش مضامین لکھے۔1926 کے طلباء کی اس محبّ وطن تحریک کی طرفداری کرنے پر حکومت ان سے ناراض ہوئی اور انکا ژیامن یونیورسٹی فیوجیا میں تبادلہ کر کے انہیں شہر بدر کیا گیا۔

وہ اب چینی کمیونسٹ پارٹی سے دل و جان سے محبت کرنے لگے تھے۔چنانچہ وہ کہتے تھے کہ میری تحریریں پارٹی لائن کے تابع ہیں اور یہ کہ انقلاب کی خاطر ''ادب کو جرنیل کے حکم پر چلنا چاہیے۔''ایک مرتبہ انہوں نے کہا کہ ''ان کی تحریریں حسب الحکم لکھی جاتی تھیں مگر جس حکم کی میں تعمیل کرتا تھا وہ اس زمانے کے انقلابی راہبر کی طرف سے جاری ہوتا تھا جس کی اطاعت پہ مجھے مسرت ہوتی تھی۔یہ حکم بادشاہ سلامت کی طرف سے نازل نہیں ہوتا تھا نہ ہی سونے کے ڈالروں کے ذریعے اور نہ ہی تلوار کی نوک پر''(23)۔ان کا ایک خوبصورت فقرہ آپ بھی سن لیجئے: ''ضمیر کی صدا واضح گونجتی ہے اور وہ جب بھی گونجتی ہے ہمیشہ لوگوں کے دلوں تک جاتی ہے''۔(24)

ہمارا یہ افسانہ نگار محض افسانہ نگاری کے لئے افسانے نہیں لکھتا تھا۔بلکہ وہ تو اپنے عوام کو روشن خیال بنانے کی امید میں لکھتا تھا' انسانیت کے لئے لکھتا تھا۔''میں فکشن کو تفریح کی حیثیت سے بیان کرنے والی قدیم عادت کو مسترد کرتا ہوں جو کہ آرٹ برائے آرٹ کہہ کر اسے وقت گزاری کا ذریعہ قرار دیتے تھے۔اسی لئے اس ابنارمل سماج میں بدقسمت لوگ ہی میرے موضوعات رہے۔میرا مقصد مرض کو بے نقاب کرنا تھا اور اس کی طرف توجہ مبذول کروانا تھا تاکہ اس کا علاج ہو سکے''(25)

وہ 1927 میں گوانگ ژو میں سن یات سین یونیورسٹی میں پڑھانے گئے۔اپریل 1927ء میں جب رجعتی کومنتانگ نے کمیونسٹوں کا قتلِ عام کیا اور سن یات سین یونیورسٹی کے بیشمار طلبہ کو گرفتار کر لیا تو لوہسون نے اجلاس بلوایا جس میں مطالبہ کیا کہ تمام طلبہ کو رہا کیا جائے۔جب کامیابی نہ ہوئی تو انہوں نے سن یات سین یونیورسٹی کی ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔اکتوبر 1927ء میں وہ شنگھائی چلے گئے۔جہاں انہیں انٹرنیشنل سٹلمنٹ میں پناہ ملی۔وہ زیادہ تر شنگھائی میں رہے، یہیں انکا مکان تھا۔یہاں انہوں نے انتہائی استغراق سے مارکسزم کا مطالعہ کیا اور پکے کمیونسٹ بن گئے۔

انہوں نے لکھا ''میں عملاً سارا وقت پڑھنے لگا۔''پرومیتھی اُس'' تو دیوتاؤں سے انسانیت کے لئے آگ چرا کر لایا تھا، اور لوہسون مارکسی نظریاتی تخلیقات کا ترجمہ کر کے انسانیت کی خدمت کر رہا تھا۔''میں ایک اور ملک سے آگ چرا رہا ہوں خود اپنا گوشت پکانے کے لئے۔اگر اس سے اس کا ذائقہ بہتر ہوتا ہے تو جو اسے کھا رہے ہیں لطف اندوز ہونگے، اور اس طرح میرا بدن ضائع نہ جائیگا''(26)۔''دو دلوں کا پیش لفظ'' میں انہوں نے بہت خلوص کے ساتھ اپنا تجزیہ پیش کیا۔اور کھلے عام اعلان کیا کہ وہ پرولتاریہ کی نجات کے لئے وقف ہیں:''جس طرح''......میں اپنا سر دیوار سے مار رہا ہوں'' یہ بات صحیح ہے کہ جب کہ میں نے اپنے طبقہ سے نفرت کرنی شروع کر دی جسے میں اچھی طرح جانتا تھا، اور اس کی تباہی پہ مجھے کوئی پشیمانی نہیں ہوئی۔بعد میں حقائق نے مجھے بتایا کہ مستقبل، حتمی طور پر ابھرتے ہوئے

پرولتاریہ کا ہے''۔

وہ 1928 میں رسالہ ''یَین لیو'' کے ایڈیٹر بنے۔2 مارچ 1930ء کو انہوں نے چائنیز لیگ آف لیفٹ ونگ رائٹرز قائم کی۔ یہ لیگ شنگھائی میں بنی اور لوہسون اپنی موت تک اس کے چیف رہے۔اس ''بائیں بازو کے مصنفین کی انجمن'' کے تاسیسی جلسے میں تقریر کرتے ہوئے لوہسون نے کہا کہ اگر بائیں بازو کے لکھاری مزدوروں اور کسانوں سے دور رہ کر انقلابی ادب پیدا کرنے کی کوشش کریں گے تو یہ بے معنی بات ہوگی، اور بالآخر وہ خود دائیں بازو کے مصنفین سے جا ملیں گے''۔ پھر انہوں نے کہا کہ ''عوامی ادبی تحریک کا ایک مقصد یہ ہے کہ ادبی سپاہیوں کی ایک تازہ فوج پیدا کی جائے۔''

1930ء ہی میں انہوں نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر ''ڈان بلازمز پریس'' قائم کیا۔اس پریس کے بڑا حصے دار اُن کے دوست ''جُو شیہ'' تھے جنہیں 7 فروری 1931ء کو کومنتانگ نے قتل کر دیا۔۔اس پریس کا مقصد مشرق اور شمالی یورپ کے ادب اور چوب تراشی کے نمونوں کو چین میں متعارف کرانا تھا۔32-1931ء میں وہ رسالہ ''بوچھاڑ'' کے مدیر رہے۔17 جنوری 1931ء کو پولیس انہیں گرفتار کرنے پہنچی مگر وہ اپنی بیوی اور بیٹے کو لے کر روپوش ہوگئے اور ہوٹل میں جا چھپے۔اس کے بعد تقریباً سال بھر اِدھر اُدھر روپوشی کی حالت میں رہے۔جس زمانے میں چیانگ کائی شیک کمیونسٹ علاقوں کی ''محاصرہ'' مہمات میں لگا ہوا تھا،اس زمانے میں کومنتانگ کے مقبوضہ علاقوں میں ترقی پسند لوگوں پر انتہائی ظلم روا رکھا گیا تھا۔لُوہسون نے یہ تمام ظلم وستم سہہ کر بائیں بازو کے ادیبوں کی مذکورہ بالا لیگ قائم کی اور جاگیردارانہ ثقافت کے خلاف جنگ لڑتے رہے۔

1934 میں وہ رسالہ ''لی ون'' کے ایڈیٹر بنے۔اگلا سال ان کے سیاسی خیالات کے لئے فیصلہ کن سال تھا۔1935ء میں جب لانگ مارچ ختم کر کے چیئرمین ماؤزے تنگ شمالی شینسی پہنچے تو لُوہسون نے فرطِ مسرت سے انہیں مبارک کا پیغام بھیجا اور کہا کہ: ''چین اور بنی نوعِ انسان کی امیدیں آپ سے وابستہ ہیں۔''

لُوہسون نے چین کے جھوٹے انقلابی دانشور چویانگ کے نظریات کی قلعی کھولی جو موقع پرست لائن کو ادب میں فروغ دیتا تھا اور کہتا تھا کہ ادب کا مقصد قومی تحفظ ہے۔جبکہ لوہسون کا کہنا تھا کہ ادب کو قوم کی انقلابی جنگ کا علمبردار ہونا چاہیے۔

لُوہسون کو نوجوانوں سے خاص محبت تھی اور ادب میں ان کی توجہ نوجوانوں پر رہتی تھی۔وہ سوشلسٹ حقیقت پسندی کے نمائندہ رائٹر ہیں۔لوہسون ماؤزے تنگ کے پسندیدہ ادیب تھے۔ماؤ انہیں انقلاب کا جدامجد کہتے تھے۔ان کی عظیم خدمات کا اعتراف چیئرمین ماؤزے تنگ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''چین کا سپہ سالارِ اعظم!____ وہ نہ صرف ایک جید عالم تھے بلکہ ایک عظیم مفکر اور انقلابی بھی تھے۔لُوہسون ایک ناقابلِ شکست دیانت کا مالک شخص تھے۔ہر قسم کی خوشامد اور چاپلوسی سے مبرا! یہ صفت نوآبادیاتی اور نیم نوآبادیاتی اقوام میں ایک متاعِ گراں بہا ہے۔قوم کی عظیم اکثریت کی نمائندگی کرتے ہوئے لُوہسون نے دشمن کے قلعے میں شگاف ڈالا اور اس پر ایک طوفان بن کر نازل ہوا۔ثقافتی محاذ پر وہ بہادر ترین اور صحیح ترین، مستحکم ترین اور وفادار ترین اور انتہائی پرجوش قومی سورما تھے۔ایک ایسا سورما جس کی ہماری تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔جو راہ اس نے اختیار کی وہ وہی تھی جو چین کے نئے قومی کلچر کی راہ ہے۔''

لُوہسون نے نظمیں بھی لکھیں جو کہ سب کی سب نثری نظمیں ہیں۔ان نظموں کا مجموعہ ''جنگلی گھاس'' کے نام سے موجود ہے۔ان نظموں میں وہ سامراج اور شمالی وارلارڈز کے خلاف چینی عوام کی جدوجہد کے بارے میں اپنے احساسات بیان کرتے ہیں۔ان کی شاعری کا زیادہ حصہ حکمرانوں کے ہاتھوں اپنے وطن کی تباہی کے بارے میں ہے۔اس

شاعری میں ان ناانصافیوں اور اموات کا ذکر ہے جو ان کے دوستوں کو جھیلنا پڑیں۔لُوہسون کی کلیاتِ نظم ونثر بیس جلدوں میں چینی اور انگریزی میں شائع ہو چکی ہیں۔علاوہ ازیں انہوں نے دیگر زبانوں کے ادب کے ترجمے بھی چینی زبان میں کیے ہیں۔

انقلاب کے جدامجد والی ان کی حیثیت چینی تاریخ کے پورے مدوجزر کے دوران کبھی بھی چیلنج نہ کی گئی۔وہ چین کے گورکی کہلائے۔لوہسون صرف ادب کی تخلیق تک محدود نہ تھے۔انہوں نے آرٹ میں دو اور اہم کام بھی کیے۔ایک تو غیر ملکی آرٹ کو چین میں مقبول کیا اور دوسرا روایتی چینی آرٹ کو از سرِ نو دیکھا۔اس نے یورپین وڈکٹ آرٹسٹوں کی آرٹ ''چوب تراشی'' کو چین میں رائج کیا۔اور اسے لوگوں کے سماجی معاملات سے جوڑا۔ بعد میں اس صنف سے کمیونسٹ پارٹی نے خوب خوب استفادہ کیا۔

لوہسون کی زندگی بہادری اور شجاعت کے کارناموں سے بھری پڑی ہے۔

کومنتانگ میں انقلابی ادیبوں کے قتل کو بے نقاب کرنے کے لئے لوہسون نے ''تاریک ترین چین میں آرٹ کی موجودہ صورتحال حال'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھا اور اشاعت کے لئے ملک سے باہر بھیج دیا۔(شنگھائی کے اخبارات میں رپورٹ شائع ہوئی کہ اگست سے اکتوبر 1930 تک ایک لاکھ کمیونسٹ اور ترقی پسند قتل کئے گئے)۔لوہسون کے قتل کے خدشات کے پیشِ نظر دوستوں نے انہیں سمجھایا کہ اس مضمون میں وہ بطور لکھاری اپنا نام نہ لکھیں مگر لوہسون نے کہا''یہ لفظ کہنے لازمی ہیں''۔

لوہسون پولیس کی مسلسل نگرانی کی وجہ سے ایک نیم روپوشی کی زندگی گزارتے رہے ۔چنانچہ انہوں نے 130 سے زائد قلمی ناموں سے مضامین لکھے۔وہ ادب اور انقلاب کے درمیان تعلق قائم کرنے کے لئے لڑتے رہے۔وہ مکمل طور پر انقلاب کیلئے تھے۔''...... انقلاب ہی کی وجہ سے تو سماج خود کو ٹھیک کرتا ہے، انسانیت ترقی کرتی ہے، وحشت سے تہذیب کی طرف آتی ہے۔۔۔کوئی لمحہ ایسا نہیں ہوتا جو انقلاب سے تعلق نہ رکھتا ہو''۔

جب کومنتانگ کے ایک ایجنٹ نے چائنا لیگ برائے شہری حقوق (یہ لیگ لوہسون اور ان کے دوستوں نے 1933 میں قائم کی تھی) کے ایک سرکردہ ممبر کو قتل کر دیا تو بہت سے لوگوں نے لوہسون کو مشورہ دیا کہ وہ خود کو بچا لیں (اس لئے کہ لوہسون بھی اس ایجنٹ کے ہٹ لسٹ پر تھے)۔مگر لوہسون اپنے اس کامریڈ کے جنازے میں شریک ہوئے اور''یانگ چوآن کے لئے ایک نوحہ''میں لکھا:

جنوبی بارشوں کی طرح آنسوؤں میں
بھیگے
کس نے سوچا تھا کہ مجھے،
عوام کے
ایک اور خوبصورت بیٹے کیلئے
رونا پڑیگا

لوہسون نے ناول البتہ،کبھی نہ لکھا۔

لوہسون 19اکتوبر 1936 میں شنگھائی میں پچپن برس کی عمر میں تپ دق کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال کر گئے۔ان کی قبر پہ جو کتبہ آویزاں ہے وہ ان کے بہت بڑے فین یعنی ماوزے تنگ کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہے اور اس پہ جو کچھ لکھا ہے وہ کسی بھی قبر کا مختصر ترین کتبہ ہے:

''جناب لوہسون کی قبر''(27)

حوالات جات

1۔فنگ،وانگ شی:''لوہسون''1984 فارن لینگویج پریس بیجنگ صفحہ 28
2۔ایضاً۔ صفحہ 33
3۔جلالپوری،علی عباس۔روایتِ تمدنِ قدیم۔تخلیقات لاہور صفحہ 252

4۔ایضاً

5۔گامر۔ای رابرٹ۔انڈرسٹینڈنگ کنٹمپریری چائنا۔لینن ویز پبلشرز۔لندن۔1999 صفحہ 283

6۔ایضاً صفحہ 279

7۔گامر صفحہ 298

8۔گامر صفحہ 282

9۔لین یوتا نگ: جینے کی اہمیت۔فکشن ہاؤس لاہور. صفحہ 310

10۔جے وردینا،کماری۔ Feminism and Nationalism in the third world۔صفحہ 181

11۔افیون اپسٹن اسرائیل۔جنگِ افیون سے آزادی تک۔1984۔غیر ملکی زبانوں کا اشاعت گھر۔بیجنگ۔صفحہ 189

12۔لوہسون۔1990۔ڈائری آف اے میڈیسن اینڈ ادر سٹوریز۔

ترجمہ: ولیم اے لائل ہونولولو۔یونیورسٹی آف ہوائی پریس۔

13۔لوہسون۔منتخب تصانیف۔جلد دوئم 1980 فارن لینگویج پریس بیجنگ۔صفحہ 18

14۔ایضاً۔صفحہ 24

15۔ایضاً صفحہ 15

16۔اپسٹن اسرائیل۔صفحہ نمبر 177

17۔Li Ziyun کا مضمون، کتاب ”Selected works by members of Shanghai P.E.N Cente“ جلد نمبر 2۔ 1998۔شنگھائی ٹرانسلیشن پبلشنگ ہاؤس صفحہ نمبر 322

18۔گامر۔ای رابرٹ۔1999۔انڈرسٹینڈنگ کنٹمپریری چائنا۔لین ریز پبلشرز۔ لندن۔صفحہ 373

19۔فنگ۔ ”لوہسون“۔صفحہ 74

20۔ ”انقلاب کیلئے لکھنا“ http://rwor.org

21۔گامر۔صفحہ 64

22۔فنگ۔لوہسون۔صفحہ 238

23۔انقلاب کیلئے لکھنا

24۔فنگ ”لوہسون“۔صفحہ 74

25۔لوہسون ”میں نے افسانے لکھنے کیسے شروع کئے“

26۔انقلاب کیلئے لکھنا

27۔تارڑ۔م ح۔تتلی پیکنگ کی۔2004۔سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور۔صفحہ 288

ماؤزے تنگ

(26 دسمبر 1893-----9 ستمبر 1976)

سیکنڈ ائیر ایم بی بی ایس کے امتحان میں میرا بائیوکیمسٹری کا VIVA ہو رہا تھا۔ جو کہ ملتان سے بائیوکیمسٹری کے بزرگ استاد جناب مشتاق صاحب لے رہے تھے۔ بزرگ سنی، دھیما لہجہ، ہمدرد اور ایک مکمل استاد۔ VIVA جاری تھا کہ کسی نے آ کر ماؤزے تنگ کے انتقال کی خبر سنائی۔ مشتاق صاحب پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا ہو۔ انہوں نے بہت افسوس کا اظہار کیا۔ وہ دیر تک ان کی توصیف کرتے رہے۔ میں ماؤزے تنگ کا پکا شاگرد ہونے کے باوجود ان کی ہاں میں ہاں نہ ملا سکا کہ انہیں یہ شک نہ گزرے کہ میں محض امتحان میں ہمدردیاں لینے ایسا کر رہا ہوں۔ ماؤ کی موت کی خبر نے البتہ یہ نقصان کیا کہ میرا اب تک کا بہت اچھا ہوا VIVA انہیں بھول گیا اور وہ از سرِ نو سارا VIVA لینے لگے۔ گو کہ یہ خبر بعد میں سچ نہ نکلی اور وہ مرحوم ماؤ نہ تھے بلکہ ان کا نام ملتا جلتا تھا۔ لیکن ماؤ کے نام پر مجھے پورا VIVA دوبارہ دینا پڑا۔ میں اچھے نمبروں سے پاس ہوا مگر 30 برس گزرنے کے باوجود میں مشتاق صاحب کو نہ بتا سکا کہ اُس روز ماؤ کی خبر پہ مجھے بھی واقعی بہت تکلیف ہوئی تھی۔ شاید اُن سے زیادہ۔

ان کا انتقال تو بعد میں 9 ستمبر 1976 کو 83 برس کی عمر میں بیجنگ میں ہوا۔

ماؤزے تنگ ہمارے توکلی مست کی وفات سے 5 برس قبل 26 دسمبر 1893 میں چین کے صوبے ہونان کے ایک گاؤں شاؤ شان میں پیدا ہوئے۔ شاؤ شان گاؤں کے باسیوں کو کیا خبر تھی کہ ان کا یہ بیٹا شان میں، بلوچستان کے کوہِ شاشان سے بھی بلند ہو جائیگا۔ ماؤزے تنگ کا فیملی نام ماؤ تھا اور انکا شخصی نام زے تنگ تھا۔ اس عظیم مارکسسٹ نظریہ دان، بہترین سپاہی اور مدبر سیاستدان کی ابتدائی تعلیم اسی گاؤں کے پرائمری سکول میں ہوئی تھی۔ وہ سترہ برس کی عمر تک دیہی زندگی گزارتے رہے۔ پھر وہ ثانوی تعلیم کے لئے ہونان کے دارالخلافہ شنگشا چلے گئے، فلاسفر یانگ چانجی سے پڑھنے۔ بعد میں انہی کی بیٹی یانگ کائی ہوئی سے ماؤ کی شادی ہونی تھی۔ فلاسفر یانگ چانجی نے ایک مضمون لکھا تھا جس نے ماں باپ کی طرف سے کرائی گئی شادی کے چینی نظام کو مغرب میں میاں بیوی کی آزاد، اور، پسند کی شادی کے مقابلہ میں ظلم قرار دیا۔ یوں ماؤ مکمل سیاسی بننے سے بھی پہلے عورتوں کے حق میں ایک جمہوری اور ہمدرد موقف اپنانے لگے تھے۔ (1)

ابھی وہ زیرِ تعلیم ہی تھے کہ 1911 میں مانچو خاندان کی بادشاہت کے خلاف

بغاوت شروع ہوگئی۔اور سن یات سن کی قیادت میں عوامی انقلاب نے بادشاہ کا تختہ الٹ دیا۔
ماؤ نے تعلیم چھوڑ دی اور قوم پرستوں کی انقلابی فوج کے ایک دستے میں بھرتی ہو گئے اور چھ ماہ تک ایک عام سپاہی کی حیثیت سے انقلابی فوج میں شامل رہے۔

جب 1912 میں سن یات سین کی قیادت میں چین میں ری پبلک قائم ہوئی تو ماؤزے تنگ نے پھر سے تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور گریجویشن کی ڈگری حاصل کر کے پیکنگ یونیورسٹی میں اسسٹنٹ لائبریرین لگ گئے۔انہوں نے وہاں خود مطالعاتی پڑھائی شروع کی۔وہاں پر وہ ڈارون، مل اور روسو کی تحریروں سے آشنا ہوئے۔قسمت کی کارروائی دیکھئے کہ اس لائبریری کا سربراہ بھی مارکسسٹ تھا اور لٹریچر کا پروفیسر بھی مارکسسٹ تھا۔ایسے میں، ماؤزے تنگ جیسا حساس اور ایماندار انسان کیسے بچ سکتا تھا۔لہٰذا وہ مارکسسٹ بن گئے۔

جب بھی ہم 1917 کے بعد کے ماؤزے تنگ کی بات کر رہے ہوتے ہیں تو ہم اصل میں چینی کمیونسٹ پارٹی کی بات کر رہے ہوتے ہیں، اور ہم دراصل چین کی اپنی بات ہی کر رہے ہوتے ہیں۔اس لئے کہ یہاں سے اگلے 60 برس تک یہ تینوں وجود یعنی ماؤزے تنگ، کمیونسٹ پارٹی اور چین ایک ہی وجود بن جاتے ہیں اور ایک دوسرے کی کامیابیوں، ناکامیوں، غلطیوں، اور سارے سیاسی معاشی ثقافتی اتار چڑھاؤ میں اکٹھے رہے ہیں۔ایک دوسرے کو متاثر کرتے ہوئے۔

1917 میں روسی مزدوروں نے لینن کی رہنمائی میں زارشاہی، جاگیرداری اور سرمایہ داری کا خاتمہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔دنیا کے اس اولین سوشلسٹ انقلاب نے عالمی سرمایہ داری نظام کو ہلا ڈالا۔اس انقلاب کی گھن گرج چین کے انقلابی عوام نے بھی سنی اور چین کے لوگوں کو پہلی بار مارکسزم اور لیننزم کے خیالات سے روشنائی ہوئی۔

سوویت انقلاب کے اثرات کو چین میں سب سے زیادہ طلباء نے قبول کیا۔اور جب سامراجی ملکوں نے چین میں جاپان کو چند رعایتیں دینے کا فیصلہ کیا تھا تو سامراجیوں کی اس سازش کے خلاف پیکنگ میں طلباء نے زبردست مظاہرے کئے جو سارے چین میں پھیل گئے۔4 مئی 1919 کی طلباء کی یہ تحریک چین میں سامراج دشمن اور فیوڈل مخالف تحریک کی بنیاد بنی، اور جس نے چین کے انقلاب پر گہرے اثرات چھوڑے۔ماؤزے تنگ اس تحریک میں شامل رہے۔

1918ء میں ماؤ نے کائی ہیسن کے ساتھ مل کر ''نیو پیپلز سٹڈی سوسائٹی'' منظم کی جس میں 1919 تک 80 انقلابی طلبا شامل ہوئے جن میں سے کئی بعد کے برسوں میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوئے۔گروپ میں مشہور چنگشا سکولوں کی اساتذائیں اور طالبات شامل تھیں جن میں سے ایک تسائی چانگ تھیں جو بعد میں خواتین کی ایک مشہور لیڈر بنیں۔(2)

ماؤ نے ایک اور تنظیم بنانے میں مدد کی جس کا نام تھا: ''سوسائٹی فار ورک اینڈ سٹڈی اِن فرانس''۔اس تنظیم کی لڑکیوں کی ایک شاخ 1920 کی دھائی کے اوائل میں قائم ہوئی تا کہ چینی انقلابی خواتین کی فرانس میں پڑھنے اور سیاسی تربیت کیلئے حوصلہ افزائی کی جائے (3)

ماؤ کی ابتدائی سیاسی تحریروں کو جس معاملہ نے متاثر کیا وہ مس چاؤ نام کی ایک لڑکی تھی جسے والدین اس کی پسند کے خلاف شادی پر مجبور کر رہے تھے۔اس نے نومبر 1919 کو عین شادی کے دن خودکشی کر لی۔مس چاؤ کی خودکشی پہ ماؤ نے کم از کم نو مضامین لکھے جس نے ''کیس سٹڈی'' کے سٹائل کو رواج دیا جو کہ 4 مئی کے مناظرے والے ادب کی بنیاد بنا۔(4)

ماؤ نے مس چاؤ کے کیس کو چینی شادی کے پدرسری نظام پہ حملے کے لئے استعمال کیا اور لڑکی کی موت کا ذمہ دار سماج کو ٹھہرایا۔

''کسی شخص کی خودکشی مکمل طور پر ارد گرد سے متعین ہوتی ہے۔کیا مس چاؤ کا اولین ارادہ موت کا تھا؟ نہیں۔وہ تو زندگی کی تلاش میں تھی۔اگر اس کے برعکس مس چاؤ نے موت ڈھونڈی تو وہ اس لئے کہ حالات نے اسے اس جانب دھکیلا۔جن حالات میں مس چاؤ نے

خود کو گھرا پایا تھا، یہ تھے:

''(1) چینی معاشرہ (2) چاؤ کا خاندان (3) اس شوہر کا خاندان جسے وہ نہیں چاہتی تھی۔ یہ تینوں عناصر تین آہنی جال بن گئے جس سے ایک تکونی پنجرہ سا بن گیا۔ ایک بار ان جالوں میں پھنس کر اس کا زندگی پانا کسی طور پر ممکن نہ تھا۔ زندہ رہنے کے لئے اس کے پاس کوئی راستہ تھا ہی نہیں۔ حیات کا الٹ موت ہے، اور مس چاؤ نے خود کو موت کے لئے مجبور پایا۔۔۔ یہ موت Arranged شادیوں کے شرمناک نظام کی وجہ سے وقوع پذیر ہوئی ہے۔ سماجی نظام کی اندھیر کی وجہ سے، انفرادی انتخاب کی نفی کی وجہ سے، اور اپنے لئے رفیقِ حیات خود ہی منتخب کرنے کی عدم آزادی کی وجہ سے۔ امید کی جاتی ہے کہ دلچسپی رکھنے والے لوگ۔۔۔ ایسی لڑکی کے وقار کا دفاع کریں گے جو خود اپنی محبت کے انتخاب کی آزادی کے کاز کے لئے ایک شہید کی موت مری۔۔۔

''اگر ہم شادی کی اصلاح کے حق میں ایک مہم شروع کریں تو سب سے پہلے شادی سے متعلق مافوق الفطرت اعتقادات کو ختم کرنا ہوگا اور سب سے پہلے یہ عقیدہ ختم کرنا ہوگا کہ شادیاں پہلے ہی سے مقدر میں لکھی ہوتی ہیں۔ ایک بار جب یہ عقیدے ختم کئے جائیں تو جس مفروضے کے پیچھے والدین کی طرف سے شادی طے کرانے کے رواج نے خود کو چھپایا ہوا ہے اسی وقت غائب ہو جائیگی۔۔۔ خاندانی انقلاب کی فوج اٹھ کھڑی ہو جائے گی اور شادی کی آزادی اور محبت کی آزادی کی لہر پورے چین کو بہالے جائیگی''۔ (5)

اُدھر مغربی لبرل ازم سے مایوس ہو کر اور روس کے سوشلسٹ انقلاب سے متاثر ہو کر دوسرے نوجوانوں کی طرح ماؤزے تنگ نے بھی مارکسزم لینن ازم کا زبردست انداز میں مطالعہ شروع کیا۔ سچی بات یہ ہے کہ مارکسزم لینن ازم کے نظریات ہی نے چین کے انقلاب کی سمت متعین کردی۔ ماؤ کے اپنے بقول ''روسیوں کے عمل کے ذریعے چینیوں نے مارکسزم دریافت کیا۔ اکتوبر انقلاب سے قبل چینی نہ صرف لینن کو نہیں جانتے تھے بلکہ وہ مارکس اور اینگلز کو بھی نہیں جانتے تھے''۔

1920 میں اپنے استاد کی بیٹی ''یانگ کائی ہوئی'' سے ان کی شادی ہوگئی۔ ماؤ اسی سال چنگ شا میں ایک پرائمری سکول کے پرنسپل بنے اور فارغ وقت میں زور شور سے کمیونزم پھیلانے لگے۔ بالآخر جولائی 1921ء میں شنگھائی کے فرانسیسی علاقے کی ایک گلی کے ایک چھوٹے سے گھر میں ماؤزے تنگ دیگر انقلابیوں سے ملتا ہے اور چینی کمیونسٹ پارٹی کا قیام عمل میں آتا ہے۔ فرانسیسی پولیس کے اس گھر پر دھاوا بولنے سے ذرا پہلے یہ 27 سالہ کمیونسٹ فرار ہونے میں کامیاب ہوا۔ (6) اس چینی کمیونسٹ پارٹی کا نام تھا کنگ تسیا تنگ تنگ (KTT)۔ ماؤزے تنگ، ہی شوہینگ، ڈونگ بی وو، چین تن کیو، وانگ جن می، ڈینگ این منگ، لی دا، لی ہن جون، ژانگ گوتاؤ، لیورین جنگ، چین گونگ بو، اور ژو فوہی نے 50 رکنی کمیونسٹوں کی نمائندگی کرتے ہوئے CPC کی پہلی نیشنل کانفرنس منعقد کرکے یہ پارٹی قائم کی۔

پارٹی نے مارکسزم کو چینی حالات سے ہم آہنگ کیا۔ جاپانی سامراج سے آزادی اور جاگیرداری کا خاتمہ اس پارٹی کے منشور ٹھہرے۔ یہ گویا پورے چینی عوام کی مجموعی انقلابی کاز تھا۔ ماؤزے تنگ چینی کمیونسٹ پارٹی کی سینٹرل کمیٹی کے ممبر منتخب ہوگئے۔ وہ ہونان کے مندوب کی حیثیت سے اس میں شامل ہوئے تھے۔

اپنی پیدائش ہی سے کمیونسٹ پارٹی نے عورتوں اور مردوں کیلئے مساوی حقوق اور عورتوں کو ووٹ کا حق دلانے کا بیڑہ اٹھایا۔ اس نے عورت مزدوروں کے لئے حفاظتی اقدامات کا نعرہ اپنایا اور امتیازی قوانین ختم کرنے کا عہد کیا۔ پارٹی کی ایک خواتین شاخ 1923 میں ژیانگ جنگ یو کی لیڈر شپ میں قائم ہوئی۔ یہ خاتون ایک ٹیچر تھیں جنہوں نے 4 مئی کی تحریک میں سرگرمی سے حصہ لیا تھا اور جو 1919 سے 1922 تک فرانس میں رہی تھیں جہاں وہ ایک مارکسسٹ سٹڈی گروپ میں شامل ہوگئی تھیں۔

یہی تو وہ خاتون تھیں جنہوں نے اس بات کو لغو قرار دیا کہ عورتوں کو مردوں کے خلاف تحریک چلانی چاہیے۔اسی عظیم خاتون نے ''ووٹ''، فرد کی آزادی اور'' آزادیِ محبت'' کو مجرد نعروں کے بطور اٹھانے کا زبردست مذاق اڑایا۔ بے سود و بے سمت فیمنسٹ خواتین کی بجائے ان کا صراطِ مستقیم یہ تھا کہ سماجی تبدیلی کے بغیر عورتوں کی آزادی بے معنی ہے۔اس نے سچی سیاسی تحریک کے بنا عورتوں کے حقوق وغیرہ کے کسی بھی تصور کو حقارت سے رد کر دیا۔(7)

ادھر کمیونسٹ پارٹی سے ذرا ہٹ کر چین کے معاصر، عمومی سیاسی فضا کے ارتقا پر نظر دوڑائیے تو آپ کو سن یات سین نظر آئیگا۔سن یات سین (1866-1925) ایک جمہوری، قوم پرست رہنما تھا۔وہ یورپ کا تعلیم یافتہ تھا۔اس تعلیم نے اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اس نے شدت سے محسوس کیا کہ چین میں منچو شہنشاہیت انتہائی بددیانت اور فرسودہ ہے۔اسے بادشاہت اور فیوڈل وڈیرہ گیری سے نفرت ہوگئی۔اور اس نے انقلاب کے لئے کام کرنا شروع کر دیا۔اس نے کومن تانگ نامی نیشنل پارٹی قائم کی۔

1911 میں منچو خاندان کا بستر گول ہوا اور سن یات سن ''جمہوریہ چین'' کا صدر بن گیا۔فرانس اور روس کی طرح یہاں شاہی اتھارٹی تباہ نہ کی گئی بلکہ شاہی فرمان کے ذریعے پہلے یو آن شیہ کائی کے حوالے کی گئی اور بعد میں یہ سن یاسن کو ملی۔

سن یات سن کا انقلاب رواں تھا، ملک اتھل پتھل میں تھا اور ماؤزے تنگ بیس برس سے بھی کم عمر کا تھا۔مگر سن یات سین کنفیوشس کے نقش قدم پر چل کر ایک طبقاتی مصالحت پر چل رہے تھے۔وہ قدیم چین کا ایک جدید (بورژوا) ری پبلک کے ساتھ مصالحت چاہتے تھے۔انہوں نے چین کو سامراج اور فیوڈل استبداد میں ہی رہنے دیا۔یوں سامراج دشمن اور فیوڈل دشمن انقلابی فریضہ نامکمل رہ گیا۔چین کی ری پبلک کے قیام کے بعد چونکہ سن یات سین چین میں بورژوا جمہوری سماج قائم کرنا چاہتے تھے اس لئے وہ سرمایہ دار ملکوں سے امداد و تعاون کے خواستگار ہوئے۔لیکن سرمایہ دار ملکوں نے امداد کی بجائے چین کے حصے بخرے کرنے اور اسے اپنے زیر اثر لانے کے لئے ریشہ دوانیاں شروع کر دیں اور اس طرح چین میں طوائف الملوکی کا دور شروع ہوا۔سن یات سین ان ریشہ دوانیوں سے مایوس ہوگئے اور ان کو چین کی آزادی کے استحکام اور جمہوری سماج کی تعمیر کا کوئی راستہ سجھائی نہ دیا۔اسی عرصہ میں پہلی سامراجی جنگ شروع ہوگئی اور 1917 میں روس میں سوشلسٹ انقلاب کامیاب ہوگیا جس میں سن یات سین کو امید کی کرن نظر آئی۔انہوں نے لینن سے امداد چاہی اور نئے چین کی تعمیر کے لئے تین اصول وضع کئے، جو یہ تھے: جاگیرداری نظام کا خاتمہ، مزدوروں کے حقوق کی بحالی اور سامراجی اثر سے نجات۔۔۔۔چین کی کمیونسٹ پارٹی سے اس نے 1923 میں الحاق کر لیا۔سوویت یونین نے سن یات سین حکومت کی ہر طرح سے امداد شروع کر دی۔سوویت مدد سے چین کی نئی فوج بنانے کے لئے جو ملٹری اکیڈمی قائم ہوئی اس کے سربراہ چیانگ کائی شک اور اس کے ڈین، چوئن لائی مقرر ہوئے۔اس طرح کومنتانگ اور چینی کمیونسٹ پارٹی مل کر انقلاب کی تکمیل کرنے لگے۔

اس ملٹری اکیڈمی میں انقلاب کی تکمیل کے لئے نوجوانوں کی تربیت جاری تھی کہ 1925 میں سن یات سین وفات پا گئے۔اور ان کی جگہ نوجوان جرنیل چیانگ کائی شیک چین کا صدر بن گیا۔اس دوران بھی سوویت امداد بدستور جاری رہی۔ماسکو میں قائم مشرق کے محنت کشوں کی کمیونسٹ یونیورسٹی چینی مرد اور خواتین کو داخلہ دیتی رہی۔یہ یونیورسٹی 1921 میں قائم ہوئی تھی۔چینی کمیونسٹ پارٹی خواتین کیڈرز کی ٹریننگ پر بہت زور دیتی تھی۔اور اس کورس کے لئے باقاعدگی سے عورتیں بھیجا کرتی تھی۔1924 میں ایک سو چینی طلباء اس کورس میں داخل ہوئے جن میں سے 10 عورتیں تھیں۔اس کورس میں مارکسزم، عالمی انقلابی تحریکیں، سوویت پارٹی، مزدور تحریک کی تاریخ، عورتوں کی تحریک کی تاریخ پڑھائی جاتی تھی۔چین کی مشہور خواتین رہنما اسی یونیورسٹی سے تعلیم یافتہ تھیں۔(8) انہی خواتین میں سے ایک محترمہ سونگ چنگ لنگ تھیں۔

1927ء میں ماؤزے تنگ نے ظلم کی اُن شکلوں (''چار موٹی رسیاں'') کو بیان کیا جو چینی کسان عورت کو باندھے رکھتی تھیں۔ ماوزے تنگ کا یہ بیانیہ دنیا بھر میں مشہور ہوا۔

''چین میں ایک مرد عموماً اتھارٹی کے تین نظاموں میں جکڑا ہوا ہے (سیاسی اتھارٹی، برادری کی اتھارٹی، اور مذہبی اتھارٹی)۔ مگر عورتیں ''اتھارٹی کے ان تین نظاموں کے علاوہ مردوں کی اتھارٹی کی بالا دستی کا بھی شکار ہیں یعنی شوہر کی اتھارٹی۔ یہ چار اتھارٹیاں۔۔۔سیاسی، برادری، مذہبی اور مردانہ۔۔۔فیوڈل پدرسری نظریہ اور نظام کا مجسم شکل ہیں، اور یہی وہ چار موٹی رسیاں ہیں جنہوں نے چینی عوام کو باندھے رکھا ہے۔ بالخصوص کسانوں کو۔ کسان تحریک کے ابھار کے ساتھ بہت سی جگہوں پر عورتوں نے دیہی عورت تنظیموں کو منظم کرنا شروع کر دیا ہے، ان کے لئے اپنے سر اٹھانے کا موقع آ گیا ہے، اور شوہر کی اتھارٹی روز بروز متزلزل ہو رہی ہے۔ ایک لفظ میں، کسان قوت کی بڑھوتری کے ساتھ سارا فیوڈل نظریہ اور نظام ہچکولے کھا رہا ہے(9)۔

چیانگ کائی شیک نے 1927ء میں کمیونسٹ پارٹی سے الحاق توڑ دیا اور سامراجی ملکوں سے گٹھ جوڑ کر کے کمیونسٹوں کو ختم کرنے کے لئے اقدامات کئے۔

اس نے اپریل 1927ء میں شہروں میں کمیونسٹوں اور فعال ورکروں کے سفاکانہ قتل عام کا حکم دیا۔ شنگھائی میں لاکھوں مزدوروں کو تہہ تیغ کر دیا گیا۔ یہ شہر کمیونسٹوں کا گڑھ تھا۔ اور انہوں نے حال ہی میں شہر پر قبضہ کیا تھا۔ چوئن لائی بھی اسی شہر شنگھائی میں گرفتار کر لئے گئے اور انہیں موت کی سزا سنائی گئی مگر وہ جیل سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔ جائے پناہ ماسکو تھا۔

ماؤزے تنگ بھی شہر سے بھاگ کر دیہات میں چلے گئے اور کسانوں کو منظم کرنا شروع کیا۔ یہ مقام کیانگسی صوبہ تھا۔ وہ اکتوبر 1927ء میں ہونان کے کسانوں کا ایک چھوٹا گروپ یہاں کیانگسی کے پہاڑوں میں لائے۔ جہاں ماؤ نے ایک مرکز قائم کیا۔ اسی زمانے میں کومنتانگ نے ماؤ کی بیوی کو قتل کر دیا۔ جب چینی پارٹی نے عوام الناس کے ساتھ خود کو جوڑا تو 1927 میں مارکسسٹ سکالر چن توسیو کی بجائے کسان نظریہ کے علمبردار ماؤزے تنگ پارٹی کے سراہ بنائے گئے۔ اسی کیانگسی میں ماؤ اور اس کے ساتھیوں نے 7 نومبر 1931 کو اپنی سوویت حکومت قائم کرنے کا اعلان کیا۔ (7 نومبر کی تاریخ پر ضرور غور کیجئے)۔ 1927 سے 1934 تک ماؤ کمیونسٹ گوریلا یونٹوں کو منظم کرتے رہے۔ ان میں اکثریت کسانوں کی تھی تاکہ جنرل چیانگ کائی شیک کی نیشنلسٹ پارٹی کی فوجوں کے خلاف دیہات میں اپنے کیمپ کا دفاع کیا جا سکے۔ چین کی فوج کے ایک کمیونسٹ جنرل مارشل چوتیہ تھے۔ وہ اپنی فوج کو الگ کر کے چین کے محنت کشوں سے جا ملے تھے۔ اور بھی بہت سے کمیونسٹ رہنما ماؤ سے آن ملے۔

چیانگ کائی شیک نے اپنی بہترین فوجیں کمیونسٹوں کے خلاف کیانگسی بھیج دیں۔ کیانگسی انقلابیوں کا ہیڈ کوارٹر۔۔۔۔ شنگھائی اور کینٹین کے درمیان واقع ہے۔ یہاں چھ سال تک انقلابی حکومت رہی تھی۔ کمیونسٹوں نے ساری زمین جاگیرداروں سے لے کر کسانوں میں تقسیم کی۔ ٹیکس گھٹا دیئے، افیون، بردہ فروشی، بیگار، غلامی اور بے روزگاری کا خاتمہ کیا اور زبردستی کی شادی پر پابندی لگا دی۔ چھ برسوں کے اندر اندر شرح تعلیم 80 فیصد تک پہنچ گئی(10)

کمیونسٹوں نے شہروں کا محاصرہ کیا اور ایک ایک کر کے قوم پرستوں کے گیریزنوں کا گلا گھونٹنے لگے۔ کومنتانگ کے پاس 400 جنگی جہاز تھے جبکہ کمیونسٹوں کے پاس صرف چند جہاز تھے جو انہوں نے چیانگ کائی شیک کی سپاہ سے چھینے تھے۔ کمیونسٹ سخت محنت سے کسانوں کو منظم کرتے رہے اور پورے ہونان اور کیانگسی میں ایک کے بعد ایک سوویتیں تشکیل دیتے رہے۔ وہ جاگیرداروں کی زمینوں پر قبضہ کرتے اور اسے مسرور کسانوں میں تقسیم کرتے۔ اس طرح انہوں نے 7 نومبر 1931 کو جوئی چن نامی اپنے دارالخلافہ

میں آل چائنا سوویتوں کی کانگریس منعقد کی۔ کانگریس نے ماؤ کو آل چائنا سوویت گورنمنٹ کی سینٹرل کمیٹی کا چیئرمین منتخب کیا اور ریڈ آرمی کا چیف پولیٹیکل کیسار چنا۔

یہیں پہ چواین لائی بھی تھے جن کے سر کی قیمت چیانگ کائی شیک نے 80 ہزار ڈالر مقرر کیئے (11) ڈینگ سیاؤ پنگ جیسا کسانوں کو منظّم کرنے والا، اور 1956 میں ماؤ کی چیئرمینی کے دوران کمیونسٹ پارٹی کا جنرل سیکرٹری رہنے والا لیڈر بھی اسی لانگ مارچ میں موجود تھا۔(12)

چیانگ کائی شیک کو یہ سب کچھ اچھا نہ لگ رہا تھا۔ اور اس نے جرمن ملٹری سے مشورہ لے کر کمیونسٹوں کے خلاف حملوں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر میں کمیونسٹوں کو سب سے زیادہ نقصان انکے انہی قوم پرست اتحادیوں سے پہنچتا رہا۔ اس نر کے بچے چیانگ کائی شیک نے ماؤ سے بھی زیادہ کمیونسٹانہ نعرے دیئے۔ چیانگ کائی شیک کمیونسٹوں کے خلاف چار حملے کر چکا تھا۔ جو سب کے سب پسپا کیئے گئے۔ اب یہ پانچواں حملہ تھا۔ اس نے 9 لاکھ کی فوج سے چڑھائی کی۔ انقلابیوں کے پاس کل ملا کر ایک لاکھ 80 ہزار کی نفری تھی۔ رضا کاروں کے ''سرخ دستے'' کے دو لاکھ اس کے علاوہ تھے۔ اُس کی یہ مہم کامیاب ہوئی اور کمیونسٹ پارٹی نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنے مرکز جنوبی چین سے شمال مغربی حصے میں منتقل کر دے تاکہ چیانگ کی فوجوں سے بھی بچا جا سکے اور جاپانیوں کے خلاف وطن کی آزادی کے لئے بھی لڑا جا سکے۔ تاریخ میں یہ سفر لانگ مارچ کے نام سے مشہور ہے۔ جو 35-1934 میں کی گئی۔ لاکھوں چینی عوام نے کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں چھ ہزار میل کا سفر طے کیا۔ اس قافلے نے 24 دریا پار کیئے، 12 صوبے اس کے راستے میں آئے اور اِسے دس جنگجو سرداروں کی افواج کا گھیرا توڑنا پڑا (13)

یہ لانگ مارچ اس قدر خفیہ اور خاموشی سے شروع ہوئی کہ 90 ہزار انقلابی فوج راتوں کے پردے میں مارچ کرتی ہوئی نکل گئی۔ تاریخی لانگ مارچ میں چوئن لائی بھی تھے۔ 6000 میل کے اس طویل لانگ مارچ میں 50 خواتین بھی شامل تھیں (14)۔ شدتِ موسم کی انتہاؤں میں، بے خوراکی، کم کپڑوں اور بغیر بستروں کی یہ فوج ہزاروں ساتھیوں کو بھوک کے ہاتھوں موت کی آغوش میں دے دے کر آگے ہی بڑھتی رہی۔ ریڈ آرمی میں شامل خواتین کی اکثریت ان کم نصیب عورتوں کی تھی جو اُن مظالم سے تنگ آ کر بھاگی تھیں جو کہ، فیوڈل چین ہی کا خاصہ تھے۔ ان عورتوں کی ریڈ آرمی میں شمولیت کو ''آزاد پاؤں'' کا نام دیا گیا۔ ایک عورت جس کے پیروں کی لمبائی محض دس سنٹی میٹر تھی، اس نے بھی لانگ مارچ کو پورا کیا۔

لانگ مارچ میں بے شمار لوگ ان پڑھ تھے جن کو ریڈ آرمی نے پڑھنا لکھنا سکھایا۔
لانگ مارچ میں پہلے فرنٹ ٹروپ میں شامل خواتین نے بے سروسانی کے عالم میں بچوں کو جنم دیا۔ کئی بچے برف آلود پہاڑوں کے سفر کے دوران پیدا ہوئے۔ اتنی مشکلات میں نوزائیدہ بچوں کو ساتھ رکھ کے سفر کرنا ممکن نہ تھا لہذا پیدائش کے فوراً بعد ان بچوں کو مقامی لوگوں کو دے دیا جاتا تھا۔ مگر بدقسمتی سے ان میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچ سکا۔ خود ماؤزے تنگ کی اپنی بیٹی بھی نہ بچ سکی۔(15)

اس سفر کے دوران وہ چیانگ کائی شیک کی فوجوں کے حملوں کا مقابلہ بھی کرتے رہے۔ اور ان تمام علاقوں میں جہاں سے وہ گزرے کسانوں میں بیداری پیدا کرتے اور ان کی تنظیم کرتے ہوئے ان علاقوں میں اصلاحات بھی نافذ کرتے گئے۔ یہ بہت دلچسپ اور یکتا بات ہے کہ آزاد کردہ علاقوں میں نچلے طبقے کو اقتدار دلایا جائے اور وہاں انقلابی اصلاحات بھی نافذ کی جائیں۔ اور سب سے بڑی اصلاح تو کسی بھی معاشرے میں زرعی اصلاحات کا نفاذ ہوتا ہے۔ لانگ مارچ میں کمیونسٹوں کو جہاں کہیں کامیابی ملتی وہ بڑے زمینداروں سے زمین چھین کر کاشتکاروں کے سپرد کر دیتے۔ لانگ مارچ کے دوران تھیٹر گروپ ساتھ چلتے تھے۔

ایڈگر سنو کو ان آزاد کردہ علاقوں میں افیون کا نشان تک نظر نہیں آیا۔ ''سرکاری

افسروں میں رشوت خوری بالکل معدوم ہے۔ گداگری کا بھی قلع قمع کر دیا گیا۔ سرخ اضلاع میں اپنے سفر کے دوران مجھے ایک گداگر بھی دکھائی نہیں دیا۔ پاؤں باندھنے اور نوزائیدہ بچوں کا قتل ضابطہ فوجداری کے تحت جرم قرار دیے گئے تھے۔ ایک سے زیادہ شوہر اور ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا ممنوع قرار دیا جا چکا تھا۔(16)

چینی سوویٹ ری پبلک کے شادی کے قوانین مجریہ جولائی 1936 میں بعض دلچسپ شقیں موجود ہیں مثلاً ساس کے ظلم کے خلاف تحفظات، عورتوں کو بیوی یا داشتہ کے طور پر خریدنے یا بیچنے پہ پابندی اور ''جوڑے مہیا کرنے'' کی رسم کا خاتمہ وغیرہ۔ قوانین کے مطابق شادی کیلئے فریقین کی باہمی رضامندی لازمی تھی۔ شادی کی قانونی عمر بڑھا کر مردوں کیلئے 20 اور عورتوں کیلئے 18 سال کر دی گئی تھی۔ جہیز قانونی طور پر ممنوع تھا۔ اشتراکی قوانین کے مطابق کوئی بچہ ناجائز نہیں ہے۔

لانگ مارچ کے علاوہ بھی دنیا بھر میں انقلابیوں کی فتح کا راز صرف ایک چیز میں مضمر ہے اور وہ حملہ کرتے وقت اپنے فوجیوں سے مخاطب ہو کر سرخ افسروں کا ''چلو دوستو'' کہنے کی بجائے ''آؤ دوستو'' کہنے کا طریقہ۔(17)

لانگ مارچ کے دوران سرخ فوج کے کمانڈر نے لولو سرداروں کے سامنے تازہ ذبح کیے ہوئے چوزے کا خون پیا۔ سرداروں نے خود بھی یہ مشروب پیا اور قسم کھا کر قبائلی رسم ورواج کے مطابق اس خونی رشتے، کا اقرار کیا، سرخ فوج نے اعلان کیا کہ اس قسم کے مطابق جو فریق بھی اس معاہدے کی خلاف ورزی کریگا وہ چوزے کی طرح کمزور اور بزدل ہو جائے گا۔(18)

خود ماؤ اس لانگ مارچ کے بارے میں لکھتے ہیں: '' آج تک کیا تاریخ میں ہمارے لانگ مارچ جیسی کوئی مثال ملتی ہے؟ بارہ ماہ تک روزانہ بیسیوں ہوائی جہازوں کے ذریعے ہماری جاسوسی ہوتی رہی اور ہم پر بمباری ہوتی رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ زمین پر کئی لاکھ افراد پر مشتمل ایک بہت بڑی فوج ہمارے اردگرد گھیرا ڈالتی رہی، ہمارا تعاقب کرتی رہی۔ راستے میں رکاوٹیں پیدا کرتی رہی اور مزاہم ہوتی رہی۔ اور ہمیں راستے میں نا قابل بیان مشکلات اور خطرات کا سامنا کرنا پڑا۔ بایں ہمہ ہم نے اپنی دونوں ٹانگوں کے ذریعے گیارہ صوبوں سے گزر کر بیس ہزار لی سے بھی زیادہ فاصلہ طے کر لیا۔ ہم پوچھتے ہیں کہ کیا تاریخ میں ہماری لانگ مارچ جیسی کوئی مثال ہے؟ نہیں کہیں نہیں۔ لانگ مارچ ایک منشور ہے۔ اس نے ساری دنیا پر یہ واضح کر دیا کہ سرخ فوج مجاہدوں کی فوج ہے اور سامراجی اور ان کے کتے بالکل نکمے ہیں۔۔۔۔ لانگ مارچ ایک تشہیری قوت بھی ہے۔ اس نے گیارہ صوبوں کے تقریباً بیس کروڑ عوام پر یہ حقیقت آشکارا کر دی ہے کہ سرخ فوج نے جو راہ اختیار کی ہے وہ ان کی آزادی کی واحد راہ ہے۔ لانگ مارچ کے بغیر عوام کو دنیا کی اس عظیم صداقت کے وجود کا، جس کی سرخ فوج تجسیم کرتی ہے، اتنی جلدی کیسے علم ہو سکتا تھا؟ لانگ مارچ تخم ریزی کا مشین بھی ہے۔ اس نے گیارہ صوبوں میں بہت سے بیج بوئے ہیں جو پھوٹیں گے۔ ان سے پتے نکلیں گے، پھول کھلیں گے اور وہ بار آور ہوں گے اور آئندہ فصل دیں گے''۔

جیسے کہ بیان ہوا یہ لانگ مارچ چھ ہزار میل پر مشتمل مصائب و آلام بھرا سفر تھا۔ دشوار پہاڑوں پہ، جان لیوا میدانوں میں، دریاؤں پہ، جنگلات پر، اور موت کی دلدلوں میں۔ یہ لانگ مارچ دنیا کی تاریخ کا سب سے طویل، سب سے مشکل اور سب سے زیادہ خطرناک لانگ مارچ تھا۔ راستے میں جگہ جگہ ان پر دشمن پاگل بھیڑیے کی طرح جھپٹتا تھا مگر اس عظیم فوج نے حوصلہ نہ ہارا، دور دراز شمالی یانگسی صوبہ میں یانان کے پہاڑی قصبہ تک مارچ شروع کرنے والے 85 ہزار فوجوں اور 15 ہزار پارٹی ورکروں سے پہلے تین ہفتوں میں 25 ہزار آدمی مر گئے۔ مارچ کرنے والوں نے گیارہ صوبے دیکھے۔ یانان تک پہنچتے پہنچتے ان میں سے صرف دسواں حصہ زندہ بچا۔ کیمونزم گپ نہیں ہے!!

یانان میں ماؤ کو شاعری لکھنے، اپنے خیالات کو مجتمع کرنے اور چین کیلئے مارکسزم

لینن ازم کے اطلاق کا نظریہ وضع کرنے کا وقت ملا۔

اس وقت دنیا میں نئی صورتحال پیدا ہو گئی تھی۔ 1937 میں جاپان نے چین پہ جارحانہ جنگ چھیڑ دی۔ جرمنی میں ہٹلر کے برسر اقتدار آنے سے یورپ میں فاشزم نے اپنے پاؤں پھیلانے شروع کیے۔ اٹلی میں مسولینی کی حکومت قائم ہو چکی تھی اور جاپان اپنی عسکری قوت کے بل بوتے پر وسیع سلطنت قائم کرنے کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ یورپ اور ایشیاء میں دوسری سامراجی جنگ کے بادل منڈلانے لگے تھے۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل نے اس خطرے سے نمٹنے کے لئے یہ فیصلہ کیا کہ فاشزم کے خلاف جمہوریت پسندوں اور قوم پرستوں کا متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔ کمیونسٹ انٹرنیشنل نے جاپان کی جارحیت کے خلاف چینیوں کی جنگ کو فاشزم کے خلاف عالمی جدوجہد کا حصہ قرار دیدیا۔ چنانچہ چینی کمیونسٹ پارٹی نے ماؤ کی رہنمائی میں چیانگ کائی شیک سے متحدہ محاذ بنانے کی سرتوڑ کوشش کی۔ یہ متحدہ محاذ 1937 میں قائم ہو گیا۔ مگر چیانگ کائی شیک کی نیت میں کھوٹ تھی۔ وہ در پردہ اپنے فوجی کمانڈروں کو کمیونسٹ علاقوں پر قبضہ کرنے کی ترغیب دیتا جاتا۔ اسی ارادے سے چیانگ کائی شیک جب شمال مشرق میں اپنے فوجوں کا دورہ کر رہا تھا تو ایک کومنتانگ نوجوان نے اس جنرل کو گرفتار کر لیا جس نے جاپان کو شکست دینے کے لئے ساری متحارب فوجوں کو اکٹھا کرنے کی ماؤ کی کوششوں کے بارے میں پڑھ رکھا تھا۔ وہ منچوریا اور شمال مشرقی چین پر جاپانی قبضے پر چیانگ کائی شیک کی خاموشی پہ اس سے نفرت کرتا تھا۔ ماؤ نے اس وقت سب کو حیران کر دیا جب اس نے اپنے دستِ راست چواین لائی کو بھیجا کہ وہ چیانگ کائی شیک کی زندگی بچالے تاکہ ہر ایک پر ثابت ہو جائے کہ جاپان کو شکست دینا سب سے بڑی ترجیح ہے۔ چیانگ 1937 میں جاپان کے حملے کو سست کرنے کے لئے ایک متزلزل الائنس بنانے پر مجبوراً رضا مند ہوا۔ اس طرح نیشنلسٹوں اور کمیونسٹوں نے مشترکہ دشمن یعنی حملہ آور جاپان سے لڑنے کیلئے محاذ کھول دیا۔ کمنٹرن نے بھی ان کی مدد کی۔ 1937 سے 1945 تک چیانگ قومی حمایت برقرار رکھنے کیلئے اپنی فوجیوں کو جاپان سے لڑنے اور کمیونسٹ پارٹی کو اقتدار حاصل کرنے سے روکنے کیلئے شعبدہ بازی کرنے پر مجبور تھا۔ کمیونسٹ مضبوط سے مضبوط تر ہوتے جا رہے تھے اس لئے کہ جاپان کے پاس افرادی قوت تھی نہیں کہ وہ دیہاتوں میں جائے اور کسانوں کو تباہ کر دے۔ اس طرح انقلابیوں کی قوت بالکل سلامت رہی۔

جاپان بہت ہی سفاک قبضہ گر ثابت ہوا۔ اس نے مقبوضہ علاقوں کی عورتوں کو جنسی غلامی پہ مجبور کیا جنہیں بدنام زمانہ ''کمفرٹ وومن'' Comfont Women کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جنگ کے اختتام تک جاپانی 35 ملین چینیوں کو قتل کر چکے تھے۔ انھوں نے بہت سوں سے فارموں اور فیکٹریوں میں غلاموں کے بطور مشقت کروائی اور اپنے ''تین تمام'' والی پالیسی (تمام قتل کرو، تمام جلادو، تمام برباد کرو) کے تحت پورے کے پورے گاؤں کو ملیامیٹ کر دیا۔ اناج، سوتی کپڑے، دھاتوں اور دوسری چیزوں پر کنٹرول عائد کرنے والے ایک قانون کے ذریعے چینی عوام ''اقتصادی مجرم'' بن گئے۔ مثال کے طور پر عام چینیوں کو چاول کھانے کی سخت ممانعت تھی، اور اگر کسی کی قے میں چاول کے بچے کھچے دانے نظر آ جاتے تو اسے ''اقتصادی مجرم'' کی حیثیت سے سزا دی جا سکتی تھی۔ صرف 45-1944 کے سال میں تین لاکھ سترہ ہزار ایک سو افراد کو ''اقتصادی جرائم'' کی سزا دی گئی۔ (19)

اپریل 1945 میں سوویت فوجوں نے ہٹلر کی افواج کو شکست دے کر برلن پر قبضہ کر لیا۔ ہٹلر نے خودکشی کی اور اس کی فوجوں نے اتحادیوں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے۔ 1945 میں سوویت یونین نے جاپانی عسکری قوت کی کمر توڑ دی اور اسے شکستِ فاش دے دی جس کے نتیجے میں چین پر جاپانیوں کی جارحیت ختم ہوئی۔ (20) جاپان کی عسکری قوت کی تباہی اور فاشزم کی شکست نے چین کے انقلاب، ویت نام کے انقلاب اور ایشیاء افریقہ کے محکوم عوام کی قومی آزادی کی جدوجہد کی کامیابی کے لئے زبردست مواقع پیدا کر دیئے۔

چنانچہ ماؤ کے کنٹرول کا علاقہ 100 ملین لوگوں تک بڑھا۔ ریڈ آرمی کی تعداد پانچ

لاکھ سے دس لاکھ تک بڑھی۔ مگر 1945 میں چیانگ کائی شیک نے ایک بار پھر کمیونسٹوں سے الحاق توڑ دیا اور امریکی سامراج کے ڈالر اور ہتھیار کی مدد سے ان پر حملہ بول دیا۔ متواتر دو سال تک اس کی فوجیں کمیونسٹوں کو پیچھے دھکیلتی رہیں۔ 1947 میں کمیونسٹوں نے جوابی حملے کا آغاز کیا۔ 1949ء تک چین کے تمام بڑے بڑے شہر آزاد کرا لئے گئے اور امریکی مشنوں کو مجبور کر دیا گیا کہ وہ چیانگ اور اس کی بچی کھچی چھوٹی سی، منظّم فوج کو امریکی طیاروں اور بحری جہازوں میں بھر کر تھائیوان لے جائیں۔ اور تھائی وان ہی اس کے لئے پناہ گاہ کا کام دے سکتا تھا، کیونکہ اسے ایک آبنائے نے خاص چین سے جدا کر رکھا تھا جس میں امریکی بحری بیڑا منڈلا رہا تھا۔

چین کے شہروں میں فتح فوجی لحاظ سے ہی نہیں، سیاسی اور معاشی اعتبار سے بھی حاصل کی گئی۔ جب سامراجی پٹھوؤں کو میدان جنگ سے مار بھگایا گیا تو وہ اس امید پر جینے لگے کہ شہری ٹیکنیشن اور دانشور عوامی فوج آزادی کے ڈر سے بھاگ نکلیں گے، یا اس کے ساتھ تعاون سے انکار کر دیں گے۔ ان کا خیال تھا کہ کمیونسٹ پارٹی اتنا عرصہ دیہات میں رہی ہے کہ اس کے لئے 20 لاکھ کی آبادی والے شنگھائی جیسے بڑے شہروں میں پیچیدہ معاشی اور انتظامی مسائل سے نمٹنا ناممکن ہوگا۔ اور ان شہروں میں غیر ملکی تسلط اور کرم خوردہ چینی رجعت پسندوں کی حکمرانی کے باعث جو برائیاں پیدا ہو چکی ہیں، وہ کمیونسٹ پارٹی کو بدعنوانیوں کا شکار کر دیں گی۔

لیکن ان خوش فہمیوں کی دھجیاں بکھر گئیں۔ حقائق نے ثابت کر دیا کہ عوامی فوج کو مزدوروں اور کسانوں ہی کی نہیں، دانشوروں، ٹیکنیشنوں اور محبّ وطن قومی بورژوا طبقے کی حمایت بھی حاصل تھی۔ ان تمام گروپوں نے، بھاگنے کی بجائے، آزادی سے ہمکنار قوم کی رہنما قوتیں سمجھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ نئی حکومت نے چند ماہ کے اندر اندر پیداوار بحال کر دی، بے لگام افراط زر پر قابو پا لیا، اور ان مسائل کو حل کیا جن کے سامنے کومنتانگ برسوں تک حکمرانی کے باوجود بے بس رہی تھی۔

تب امریکی حکومت نے، جو ہمیشہ ''چین سے دوستی'' کے دعوے کرتی رہی تھی، شنگھائی کے بجلی گھر پر بمباری کے لئے تھائی وان میں چیانگ کائی شیک کو طیارے فراہم کئے۔

یکم اکتوبر 1949ء کو ماؤ نے عوامی جمہوریہ چین کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اس نے حقوق اور فرائض میں برابری کی بنیادوں پر ملک کی تمام قومیتوں کو متحد کیا۔ اس حکومت کے قیام نے چینی عوام کے سامراج دشمن اور جاگیرداری دشمن انقلاب کی فتح پر مہر تصدیق ثبت کر دی اور سوشلزم تک رسائی کا عبوری دور شروع ہو گیا۔

چینی کمیونسٹ پارٹی نے ایک وعدہ کرپشن کو ختم کرنے کا کیا تھا اور اس پر جرات مندی سے عمل کیا تھا۔ چنانچہ تجارت میں ایک ہزار سال پرانی پریکٹس کو ختم کیا گیا جسے چینی میں ''Squeez'' کہتے تھے۔ یہ جو امریکہ میں اب بھی جاری ساری ہے جسے Kick Backs, Pay off وغیرہ کہتے ہیں۔ بلوچستان میں تو اس کے ہزار نام ہیں۔ چینی کمیونسٹوں نے ایمانداری کے بے مثال معیار قائم کیے۔

وہ انقلاب ہی کیا جو اصلاحات کا عمل جاری وساری نہ رکھ سکے۔ 1949 کے انقلاب نے چین کی صورت ہی بدل دی۔ چھ ماہ کے اندر اندر یعنی 1950 میں اس انقلاب نے عورتوں کیلئے ایک نیا قانون لاگو کر دیا۔ کم عمری کی شادیاں ممنوع قرار دی گئیں، Arranged شادی غیر قانونی قرار دی گئی، ایک سے زیادہ بیویاں رکھنا ممنوع ہوا۔ شادی کو دو بالغ انسانوں کے درمیان ایک رضا کارانہ معاہدہ بنا دیا گیا۔ عورت کو طلاق دینے لینے کی یکساں آزادی دی گئی۔ غیر شادی شدہ، طلاق یافتہ یا بیوہ عورت کو اپنے نام سے زمین رکھنے کی اجازت دی گئی۔ کمیونسٹ پارٹی نے قرار دیا کہ مرد وزن کی برابری کیلئے عورتوں کو پبلک شعبوں میں کام کرنا چاہیے۔ صنفی مساوات کی اپنی کمٹ منٹ کے بطور عورتوں کو سیاسی عمل میں لانے کیلئے پالیسیاں شروع کیں۔ اسکے لئے الیکشن پروگرام بنائے۔ اور عورتوں کیلئے

محضوص نشستیں مقرر کیں۔

سماجی اعتبار سے، آزادی کے صرف تین سال بعد یعنی 1952 میں ماؤ کی زیر قیادت چینی عوام نے زرعی اصلاحات مکمل کر کے دو ہزار سال پرانے جاگیر دارانہ شکنجوں کو توڑ دیا۔اور مزید چار سال بعد 1956 میں زراعت، صنعت اور تجارت کی نجی ملکیت کو قدم بقدم سوشلسٹ ملکیت میں تبدیل کرنے کا عظیم اور پیچیدہ فریضہ پایہ تکمیل تک پہنچا دیا۔ یہ تغیرات، رفتار، پیمانے اور روانی' اور اس حقیقت کو مدنظر رکھتے ہوئے کہ اس دوران پیداوار میں کمی کی بجائے خاصا اضافہ ہوا ہے، تاریخ میں اپنی مثال آپ تھے۔

اقتصادی ترقی ایک اعتبار سے غیر معمولی رہی۔ پہلی عالمی جنگ کے بعد، چین میں فولاد کی دیسی مصنوعات عملاً ناپید تھیں، معمولی چیزیں بھی برطانیہ اور جرمنی سے درآمد ہوتی تھیں ۔قلم کی نب تک درآمد ہوتی تھی۔ ماچس، جنہیں ''غیر ملکی آگ'' کہا جاتا تھا، زیادہ تر سویڈن سے آتی تھی۔ پیٹرولیم جو ''غیر ملکی تیل'' کے نام سے معروف تھا، کی مصنوعات سٹینڈرڈ آئل، ٹیکساکو' یا' رائل ڈچ شیل کی تھیں۔ سائیکلیں برطانیہ اور جرمنی کی ساختہ ہوتی تھیں۔ 1949ء میں آزادی کے وقت تک چین میں موٹر گاڑیوں کی تیاری تو کجا اسمبلنگ کا کام بھی نہیں ہوتا تھا ۔زراعت میں (جس پر ملک کی بقا کا انحصار تھا اور جو 90 فیصد آبادی کا پیشہ تھا) لکڑی کا ہل استعمال ہوتا تھا۔

سٹالن کے ساتھ زبردست یاری کے باوجود 1950 کی دہائی کے وسط میں ماؤزے تنگ کو اس لائن نے مزہ نہیں دیا اس لئے کہ اس میں کمیونسٹ پارٹی بیورو کریٹک اور سخت ہو جاتی ہے اور منیجریل ازم اور ٹکنوکریسی مضبوط ہو جاتی ہے۔ ان کا کہنا تھا: ''نوکر شاہی کی لعنت کو جسے کوئی کامریڈ پسند نہیں کرتا، گندی نالی میں پھینک دینا چاہیے۔ تمام کامریڈز کو ایسے طریقے اختیار کرنے چاہئیں جو عوامی ہوں یعنی ایسے طریقے جن کا تمام مزدور اور کسان خیر مقدم کرتے ہوں''۔

1960 کی دہائی میں سوویت چین تعلقات میں نظریاتی وسیاسی ہر دو اعتبار سے خلیج پیدا ہو گئی۔

1966 میں کامریڈ ماؤزے تنگ اور ان کے قریبی رفقاء نے سوشلزم کی تاریخ میں سب سے متنازعہ اقدام کیا اور اسے ''ثقافتی انقلاب' کا نام دیا۔ یہ صحیح ہے کہ سترہ برس سے پارٹی اقتدار میں تھی۔ اس کے کارکن اور رہنما حاکم بنتے بنتے خودسر ہو گئے تھے اور ان میں بڑی کجرویاں بھی پیدا ہوئی ہونگی۔ شہروں میں Intelligentia کا طبقہ پیدا ہو گیا ہوگا جس کا دیہی زندگانی سے متعلق ایک روایتی شہری (بازاری) رویہ بنا ہوگا۔ یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ اس زمانے میں پارٹی اور سماج میں بورژوا عناصر، ایلیٹ اور بیوروکریسی محسوس کی جا سکتی تھی ۔مگر اس سارے منظر نامے میں 73 سالہ ماؤ نے دیہی آبادی کو ڈھال بنا کر وہاں سے بھرتی شدہ فوج کے ذریعے شہری تعلیم یافتہ آبادی کا گلا دبانا شروع کر دیا۔ ان ریڈ گارڈز نے ہر اس شئے کو صفحہ ہستی سے مٹانا شروع کر دیا جس کا تعلق ماضی سے ہو۔ بزرگ انقلابیوں کو اسی الزام کے تحت بازاروں میں گھسیٹا گیا۔ ادیبوں، اساتذہ، اداکاروں اور حکومتی اہلکاروں کو زدوکوب کیا گیا۔۔۔ (تاکہ شہری اور دیہی کا فرق ختم ہو!!) لاکھوں تعلیم یافتہ نوجوانوں کو ملازمتوں سے نکال کر دیہی علاقے میں بھیجا گیا تاکہ وہ کھیتوں میں کام کریں اور کسانوں سے سیکھیں ۔ہر شئے کو تباہ کر دیا گیا۔ ''نہ جانے کتنے دانشوروں کو رسیوں سے باندھ کر انہیں لیکچر دیئے گئے''۔(21)

انقلابی جوش وابھار کے زمانے میں پارٹی ورکر پاگل ہو جاتے ہیں۔ اور لیڈروں کی طرف سے جب انہیں شہہ ملتی ہے تو پھر وہ مڈل کلاس پر بجلی بن کر ٹوٹ جاتے ہیں۔ ایک حقیقت واضح ہے، کہ وبا کی طرح وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے پاگل پن نے لوگوں کو باور کرایا تھا کہ چین عالمی انقلاب کا مرکز ہے اور اس طرح ہر جوان خود کو انقلاب کا پکا حوالدار ثابت کرنے پہ بے چین تھا۔

ان دنوں جب چین انقلاب اور بغاوت کی آگ میں تھا جس کسی نے بھی بیعت سے انکار کیا اس نے گویا اپنے ماتھے پر انقلاب دشمنی کا داغ لینے کا خطرہ مول لیا اور زمین پر پٹخے جانے کا نشانہ بن گیا اور انقلاب کے نام نہاد آہنی پیروں تلے کچلے جانے کا خطرہ مول لیا ۔(22)

سوشلزم کو چین میں لاگو کرنے کے طرز کو ''ماؤازم یا فکر ماؤ'' کہا جانے لگا۔اس نے کسانوں کو بہت اہمیت دی۔اور چینی کسان انجمنوں کے چودہ عظیم کارنامے اس طرح بیان کئے ہیں:

1۔کسان انجمنوں کی تنظیم

2۔زمینداروں پر سیاسی ضرب مثلاً حسابات کی جانچ پڑتال کرنا، موت کی سزا، چندوں کی وصولی، معمولی باز پرس، بڑے مظاہرے، زمینداروں کی تاج پوشی کر کے دیہاتوں میں ان کا جلوس نکالنا۔کاؤنٹی جیل میں نظر بندی، گاؤں بدر کرنا، موت کی سزا

3۔زمینداروں پر معاشی ضرب مثلاً متعلقہ علاقہ سے اناج کی برآمد، اناج کی قیمتوں میں اضافے اور ذخیرہ اندوزی وچور بازاری کی ممانعت، لگان اور زرضمانت بڑھانے کی ممانعت، لگان اور زرضمانت میں کمی کے لئے ایجی ٹیشن، سود کی شرح میں کمی

4۔مقامی ظالموں اور بدکردار رؤسا کے جاگیردارانہ اقتدار کا تختہ الٹنا

5۔زمینداروں کی مسلح افواج کا خاتمہ اور کسانوں کی مسلح افواج کا قیام

6۔کاؤنٹی مجسٹریٹ اور اس کے ہرکاروں کے سیاسی اقتدار کا خاتمہ

7۔آبائی مزدور اور قبائلی سرداروں کے قبائلی قصبے اور گاؤں کے دیوتاؤں کے مذہبی اقتدار اور شوہروں کے مردانہ اقتدار کا خاتمہ۔کسانوں میں توہم پرستی کے خلاف تقریر میں ماؤ نے کہا ''دیوتا؟ تم بے شک ان کی پوجا کرو لیکن اگر تمہارے پاس صرف لارڈ کوان ہوتا اور رحم کی دیوی ہوتی اور کوئی کسان انجمن نہ ہوتی تو کیا تم مقامی ظالموں اور بدکردار رؤسا کا تختہ الٹ سکتے تھے؟ یہ دیوتا اور دیویاں خود ہی قابل رحم چیزیں ہیں۔تم صدیوں سے ان کی پوجا کرتے آ رہے ہو۔لیکن انہوں نے تمہاری خاطر مقامی ظالموں اور رؤسا میں سے کسی ایک کا بھی تختہ نہیں الٹا۔اب تم اپنی لگان میں کمی کرانا چاہتے ہو۔میں تم سے پوچھتا ہوں کہ یہ کام کیسے کرو گے؟ کیا تم دیوتاؤں پر اعتقاد رکھو گے یا کسان انجمن پر؟''

8۔وسیع پیمانے پر سیاسی پروپیگنڈہ

9۔کسانوں کی طرف سے ممانعتیں اور پابندیاں۔۔۔خاص کر افیون نوشی، قمار بازی اور تاش کے کھیل پر

10۔ڈاکہ زنی کا انسداد

11۔کمزور محاصل کی تنسیخ

12 ثقافتی تحریک

13۔تحریک امداد باہمی

14۔سڑکوں، تالابوں اور بندوں کی مرمت۔

کامریڈ ماؤزے تنگ نے چین کے سماج میں بہت خوبصورتی سے طبقات کا تجزیہ کیا تھا۔ان کے مطابق چین میں بالائی طبقات میں مندرجہ ذیل لوگ آتے تھے۔(1)زمیندار اور کمپراڈور کا طبقہ (2) متوسط بورژوا طبقہ، مالک کسان، مالک دستکار، دانشور، طلباء، سکولوں کے اساتذہ، کلرک، چھوٹے تاجر اور وکیل (3) ادنیٰ بورژوا۔

نچلے طبقات میں انہوں نے مندرجہ ذیل لوگ رکھے: (1) نیم پرولتاریہ، نیم مالک کسان، غریب کسان، چھوٹے دستکار، دکانوں کے ملازمین اور خوانچہ فروش (2) پرولتاریہ۔

ان کے تئیں درمیانہ طبقے کی کوئی مستقل حیثیت نہیں ہے۔ان کا خیال تھا: ''درمیانی طبقے لازمی طور پر بہت جلد منتشر ہو جائیں گے اور بعض دائیں جانب مڑ کر انقلاب دشمن صفوں میں جا ملیں گے اور بعض بائیں جانب مڑ کر انقلاب کی صفوں میں شامل ہو جائیں گے۔ان کے

لئے خود مختار رہنے کی کوئی گنجائش نہیں''۔

آخری عمر میں ماؤزے تنگ کی صحت گرتی گئی۔ وہ 1976 میں پیکنگ میں انتقال کر گئے۔ یعنی وہ اپنی قیادت میں کمیونسٹ انقلاب کے ثمرات دیکھنے کیلئے 27 برس تک زندہ رہے۔ ماؤزے تنگ 41 برس تک دنیا کی سب سے بڑی انقلابی پارٹی کے چیئرمین رہے۔ ان کی انقلابی قیادت کے طفیل عوامی جمہوریہ چین جدید زراعت، جدید صنعت اور جدید سائنس وکلچر والا مضبوط ملک بن گیا۔

لینن کے بعد کے عہد میں ماؤزے تنگ نے پرولتاریہ آمریت کے تصور کو اپنی عوامی جمہوری آمریت کی تھیوری سے امیر بنا دیا۔ وہ چین کے خصوصی حالات کے مطابق لیننسٹ تصور کو ٹھوس طور پر عمل میں لائے۔ لینن کی طرح یہاں بھی عام آدمی کے لئے جمہوریت کو شکست خوردہ حاکم طبقات کے اوپر آمریت کے ساتھ پرمسرت انداز میں ملا دیا گیا۔

ماؤ کا عوام پر پکا ایمان تھا۔ انہوں نے لکھا: ''گزشتہ ہزاروں برس کے دوران تعمیر ہونے والے جاگیردار شہنشاہوں کے محلات پر غور کیجئے۔ کیا وہ اپنی دیواروں اور خندقوں کی وجہ سے بہت مضبوط نہ تھے؟ لیکن جب عوام الناس اٹھ کھڑے ہوئے تو وہ یکے بعد دیگرے پیوندِ خاک ہوتے چلے گئے۔ زار روس دنیا کے انتہائی خونخوار حکمرانوں میں سے ایک تھا لیکن جب پرولتاریہ اور کسان' انقلاب کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے تو اس کا وجود باقی رہا؟ قطعاً نہیں۔ کامریڈو۔ حقیقی آہنی فصیل عوام الناس ہیں۔ وہ کروڑوں لوگ جو سچے دل سے انقلاب کی حمایت کرتے ہیں۔ یہ صحیح معنوں میں آہنی فصیل ہے جسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں توڑ سکتی۔ بالکل نہیں توڑ سکتی۔''

وہ فن وثقافت اور ادب کے بارے میں بھی بہت واضح نظریات رکھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا: ''آج کی دنیا میں تمام ثقافت یا تمام ادب وفن مخصوص طبقوں کی ملکیت ہوتا ہے اور مخصوص سیاسی راہ عمل سے منسلک ہوتا ہے۔ حقیقت میں فن برائے فن، طبقات سے بالاتر فن اور ایسے فن نام کی کوئی چیز نہیں جو سیاست سے علیحدہ یا آزاد ہو۔ پرولتاری ادب وفن پورے انقلابی کاز کا ایک جزو ہوتا ہے۔ (23)

جدلیاتی مادیت پر ان کی خوبصورت کتابوں میں ''عمل کے بارے میں'' اور'' تضاد کے بارے میں'' اہم ہیں۔ فوجی امور پر ان کی پہلی کتاب ''چین کی انقلابی جنگ کی حکمت عملی کے معاملات'' تھی۔ اس کے بعد ''طویل جنگ پر'' موضوع نامی ان کی تحریر بھی ایک زبردست تصنیف ہے۔

دنیا میں سب سے مضحکہ خیز شخص وہ ہے جو ''عالم کل'' ہے۔ جو ادھر ادھر کی سنی سنائی باتوں سے علم کی شد بد حاصل کر لیتا ہے اور پھر یہ دعویٰ کرتا ہے کہ وہ ''علامہ دہر'' ہے۔ ماؤ کے نزدیک علم ایک سائنس ہے اور اس میں کسی قسم کی بددیانتی اور غرور کی کوئی گنجائش نہیں۔۔ ان کا ایمان تھا کہ جو شخص اپنی آنکھیں بند کر لے۔ کانوں میں روئی ٹھونس لے اور معروضی خارجی دنیا سے بالکل قطع تعلق کر لے وہ کوئی علم حاصل نہیں کر سکتا۔ علم کی ابتداء تجربے سے ہوتی ہے ----۔ یہ نظریہ علم کی مادیت ہے۔ علم کو محسوساتی مرحلے سے عقلی مرحلے تک پہنچانے کی ضرورت ہے۔ یہ نظریہِ علم کی جدلیات ہے''۔ ان کی تعلیمات یہ تھیں کہ اگر نظریے کا تعلق انقلابی عمل سے نہ ہو تو وہ بے مقصد ہو جاتا ہے، بالکل اسی طرح جیسے انقلابی نظریے کی روشنی نہ ہو تو عمل اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہے گا۔ وہ حتمی انداز میں کہتے ہیں کہ موضوعی اور معروضی کے درمیان ---۔ نظریے اور عمل کے درمیان ---۔ جاننے اور کرنے کے درمیان ٹھوس اور تاریخی اتحاد ہونا چاہیئے۔

عمل کے ذریعے صداقت کرو اور پھر بذریعہ عمل صداقت کی تصدیق کرو اور اسے ترقی دو۔ محسوساتی عمل سے ابتدا کرو اور اسے سرگرمی سے عقلی علم تک پہنچا دو اور پھر عقلی علم سے ابتدا کرو اور موضوعی اور معروضی دنیا، ہر دو کو تبدیل کرنے کے لئے سرگرمی سے انقلابی عمل کی

رہنمائی کرو۔عمل۔علم۔ پھرعمل اور پھرعلم۔۔۔۔۔۔، یہ چکر کبھی ختم نہیں ہوتا اور ہر چکر کے ساتھ عمل اور علم کی سطح بلند ہوتی جاتی ہے۔یہی جدلیاتی مادیت کا مکمل نظریہِ علم ہے اور یہی جدلیاتی مادیت کا جاننے اور کرنے کا نظریہ ہے۔

ماؤ کہتے ہیں کہ کسی شے کی نشونما کا بنیادی سبب خارجی نہیں بلکہ داخلی ہوتا ہے۔یہ سبب اس شے کے اندر کی تضادیت میں مضمر ہوتا ہے۔ ہر ایک شے میں اندرونی تضاد پایا جاتا ہے۔یہ اس کی حرکت اور نشونما کا باعث ہوتا ہے۔ شے کی اندر کی تضادیت اس کی نشونما کا بنیادی سبب ہوتی ہے۔جبکہ دوسری اشیاء کے ساتھ اس کے تعلقات اور باہمی اثر اندازی کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔

فطرت میں تبدیلیاں زیادہ تر فطرت کے داخلی تضادات کی نشوونما کی بناء پر ہوتی ہیں۔سماج میں تبدیلیاں زیادہ تر سماج کے داخلی تضادات کی نشوونما کی وجہ سے ہوتی ہیں یعنی پیداواری قوتوں اور پیداواری رشتوں کے درمیان تضاد، طبقات کے درمیان تضاد اور قدیم اور جدید کے درمیان تضاد۔یہ ان تضادات کی نشوونما ہی ہے جو سماج کو آگے بڑھاتی ہے اور نئے سماج کے ہاتھوں پرانے سماج کے خاتمے کے لئے قوت مہیا کرتی ہے۔خارجی اسباب تبدیلی کی شرط ہوتے ہیں اور داخلی اسباب تبدیلی کی بنیاد ہوتے ہیں' اور خارجہ اسباب داخلی اسباب کے ذریعے عمل میں آتے ہیں۔

تضاد تمام اعمال میں موجود ہوتا ہے اور تمام اعمال میں شروع سے آخر تک جاری و ساری رہتا ہے۔حرکت، اشیاء، اعمال، فکر۔۔۔۔۔ یہ تمام تضادات ہیں۔تضاد سے انکار کرنے کا مطلب ہر چیز سے انکار کرنا ہے۔

سرداروں کے بارے میں ان کا رویہ کتنا سچا تھا۔انہوں نے کہا: ''کیا کبھی کوئی ایسی بلی ہوئی ہے جسے مچھلی سے رغبت نہ ہو یا کبھی ایسا جنگی سردار گزرا ہے جو انقلاب دشمن نہ ہو۔''

انہوں نے قومی بورژوا کے بارے میں کہا کہ ''بایاں ہاتھ سامراجیوں کو مار گرانے کے لئے اٹھاؤ اور دایاں ہاتھ کمیونسٹوں کو چت کرنے کے لئے''۔

سوویت یونین کے دو دوروں کے علاوہ ماؤ نے اپنا ملک حکمرانی کے دور میں کبھی نہ چھوڑا (24)۔

کسی کو ماؤ کی پالیسیوں سے اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ چین کا انقلاب اور انقلاب کے بعد چین میں سوشلزم کی تعمیر چینی کمیونسٹ پارٹی اور اس کے لیڈر ماؤ کی رہنمائی میں ہوئی ہے۔

اُن کی شخصیت پرستی اب نہیں کی جاتی، نہ ہی ان کے مجسمے پورے چین میں نظر آتے ہیں۔وہ شیشے کے ایک تابوت میں آرام فرما ہیں۔لوگ قطار بنا کر اندر جاتے ہیں، ایک لمحہ ان کے پیروں کے پاس احتراماً کھڑے ہوتے ہیں اور پھر آگے بڑھتے جاتے ہیں۔وہ روحانی طور پر ہر کھلی سڑک، ہر وسیع ائیرپورٹ، ہر خاندان کی ہنسی اور ہر سوچنے والے کے دل میں ہیں۔طبعی طور پر تو وہ ٹورسٹوں کی دلچسپی کے لئے سوینیئر شاپس پر فروخت ہوتا ہے، ماؤ کیپ کی صورت یا پھر ان کے مجسمے کی شکل میں۔مگر اس مجسمے میں بٹن دبا دو تو سگریٹ لائیٹر بن جاتا ہے۔ہم نے اپنے قبائلی انا کو مارتے رہنے کی خاطر ماؤ کے مجسمے کی صورت ایک لائٹر 30 یوآن (240) روپے میں خریدی۔مگر بلوچستان واپس لوٹ کر اپنے پاس رکھنے کا یارا نہ پایا اور اپنے ایک دوست کو تحفے میں دے دی۔

ماؤ زے تنگ عالمی تاریخ کا درخشاں ستارہ ہیں۔کوتاہیاں اور مظالم سرزد ہونے کے باوجود وہ چین کے نجات دہندہ پارٹی کے بانی اور سوشلزم کے معمار ہیں۔۔۔۔یہ واضح کرنا بہت ضروری ہے کہ ثقافتی انقلاب ماؤ کی زندگی کا پورٹریٹ نہیں ہے۔ان کی زندگی کی اصل اور مستقل تصویر انقلاب ہے۔وہ انسانی برادری کو ایک ایسا چین بخش گئے جہاں نہ بادشاہ ہیں نہ درباری، نہ کاہن ہیں نہ فیوڈل لارڈز۔۔۔۔۔بس خلقِ خدا ہے اور ان کا راج۔پبلو نرودا نے اپنی ''یادداشتوں'' میں لکھا کہ ماؤ کی سیاسی شخصیت سے کون انکار کر سکتا ہے جو ایک

آرگنائزر ہیں، عوام کو آزاد کرنے والے عظیم انسان ہیں۔ میں اس کی رزمیہ تقدیس سے کیسے متاثر نہ ہوتا، اس کی سادگی سے کیسے متاثر نہ ہوتا جو کہ اس قدر شاعرانہ ہے، اس قدر درویشانہ ہے اور اس قدر قدیم ہے"۔

ماؤزے تنگ کی زندگی اور تعلیمات بنی نوع انسان کے لئے عظیم اہمیت رکھتے ہیں۔ فاشزم کو شکست دینے، نو آبادیایت کی زنجیریں توڑ دینے اور غلامانہ زندگی گزارنے والے فاقہ کش چینیوں کے اندر سوشلزم تعمیر کرنے والے اس عظیم انسان کو تاریخ ہمیشہ یاد رکھے گی۔

حوالہ جات

1۔ سپنس جانیتھن ڈی۔ The Gate of Heavenly Peace
The Chiese and Their Ravolution 1895-1980.
فیبر اینڈ فیبر، لندن 1982 صفحہ 131

2۔ جے ورد ھنے، کماری۔ فیمنزم اینڈ نیشلزم۔۔۔ صفحہ 186

3۔ ایضاً۔ صفحہ 186

4۔ Witke, Roxane , mao Tse-Tung women and Suicide in May Founrth era , in" chinese Quarterly no 31,July Sep 1967, صفحہ 128

5۔ Schram ,Sraurt R.The poltical thought of Mao Tse Tung (Pelican books , 1969) صفحہ 334

6۔ جے ورد ھنے۔ فیمنزم۔۔۔ صفحہ 178

7۔ ایلزبتھ، کرول، فیمنزم اِن سوشلزم۔ شوکن بکس۔ نیو یارک۔ 1980۔ صفحہ 120

8۔ جے رو ھنے۔ فیمنزم۔۔ صفحہ 190

9۔ ماؤزے تنگ۔ منتخب تصانیف۔ جلد 1۔ 1967۔
فارن لینگویج پریس بیجنگ۔ صفحہ 44

10۔ ابن انشا۔ چین کو چلئے۔ صفحہ 47

11۔ ایڈگر سنو/ارشاد احمد۔ نئے چین کا رزمیہ۔ حصہ اول۔ مکتبہ مطالعہ مشرق، لائلپور صفحہ 82۔

12۔ سپا چائی پانچپکڑی "چائنا اینڈ ڈبلیو ڈی او -2002 جان ولی اینڈ سنز سنگا پور۔ صفحہ 15

13۔ ابن انشا۔ چین کو چلئے۔ صفحہ 151

14۔ جے ورد ھنے۔ فیمنزم۔۔۔ صفحہ 193

15۔ کوکب خواجہ۔ نی ہاؤ۔ 1990۔ فیروز سنز لاہور۔ صفحہ 132

16۔ ایڈگر سنو/ارشاد احمد۔ نئے چین کا رزمیہ۔ حصہ دوئم۔ صفحہ 29

17۔ ایڈگر سنو/ارشاد احمد۔ حصہ دوئم صفحہ 70

18۔ ایڈگر سنو/ارشاد احمد۔ حصہ اول۔ صفحہ 213

19۔ پھُوای۔ شہنشاہ سے شہری تک۔ جلد دوئم۔ 1985۔ غیر ملکی زبانوں کا اشاعت گھر۔ بیجنگ۔ صفحہ 572

20۔ ہفت روزہ عوامی جمہوریت۔ لاہور۔ 27 جنوری 1976۔ صفحہ نمبر 1

21۔ تارڑ، تتلی پیکنگ کی۔ صفحہ 124

22۔ شنگھائی ادیب۔ صفحہ 77

23۔ نوائے وطن 25 اکتوبر 1975

24۔ بیرن، لی ڈین۔ ماؤ، مارکس اینڈ مارکیٹ۔ 2002۔ جان ولی نیویارک۔ صفحہ 157

باجین

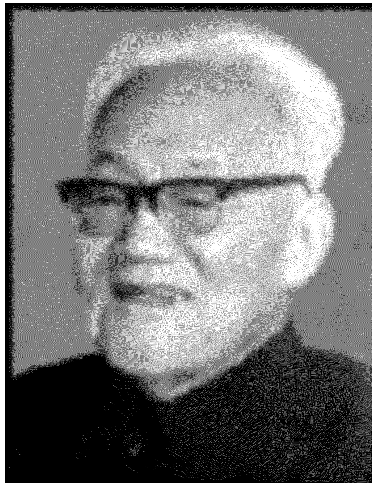

باجین پچھلی صدی میں عالمی ادب میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے ادیب

رہے ہیں۔ وہ ہمارے عہد کے حساس ترین دل کے مالک ادیب تھے۔ وہ لگاتار بیس برس تک دنیا کی سب سے بڑی ادبی تنظیم، چائنیز رائٹرز ایسوسی ایشن کے سربراہ رہے۔ اور یہ اعزاز ان کی زندگی کی آخری سانسوں تک ان کے ساتھ رہا۔ اس تنظیم کی وسعت کا اندازہ اس بات سے کیجئے کہ اس تنظیم میں صرف خواتین ادیبوں کی تعداد ایک ہزار ہے۔ چودہ وائس چیئرمینوں پر مشتمل یہ ایسوسی ایشن سات ذیلی کمیٹیوں کی نگرانی کرتی ہے:

ادیبوں کے حقوق مراعات اور فلاح کی کمیٹی، بچوں کے ادب کی کمیٹی، ادبی جرائد کی کمیٹی، قومی اقلیتوں کی کمیٹی، ادبی نقد ونظر کی کمیٹی، فوجی ادبیات کی کمیٹی، بیرونِ ملک ادبی تبادلات کی کمیٹی (1)۔ اور باجین اس بڑی تنظیم کے مرکزی سربراہ تھے۔ جس میں ممبرشپ کی واحد مگر بہت بڑی شرط یہ ہے کہ درخواست دہندہ معروف معنوں میں ادیب یا شاعر ہو۔ (2)

باجین نے اس تنظیم کو بہت ترقی دی۔ یہ تنظیم چینی ثقافت اور نظریاتی ارتقا کی تشہیر کرتی ہے، پارٹی پالیسی کا مطالعہ کروانے، ادبی ایوارڈز دینے، ادبی نظریات پر ریسرچ کرنے، اور چین کی مختلف قومیتوں کے ادب کو فروغ دینے کا کام کرتی ہے۔ باجین نے ان تمام امور کی ترقی ترویج میں ساری زندگی لگادی تھی۔

وزارتِ ثقافت سے وابستہ اس تنظیم نے باجین اور ان کے ہم عصر ادیبوں کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اپنا مشن بنایا کہ ادبی اور فنی کام سچ کے ساتھ جڑے رہیں۔ باطل، واہمہ اور جھوٹ کی مخالفت ہو۔ حسن اور نیکی سربلند ہوں۔ باجین کی سربراہی میں اس تنظیم سے وابستہ ادیبوں نے ایسا خوبصورت ادب تخلیق کیا جس میں بدی کے خلاف بھرپور جدوجہد کا درس ہے، سائنس کی طرفداری ہے اور حماقت و جہالت کے خلاف لڑائی کا سبق ہے۔ باجین 1983 سے لے کر 2005 کے اواخر میں اپنی وفات کی گھڑی تک اس بہت بڑی تنظیم کے چیئرمین رہے۔ اسی باجین نے صاف ضمیر اور نیک نیتی سے چینی جدید ادب کا بہت بڑا میوزیم بیجنگ میں بنوایا۔

باجین کا اصل نام لی یاؤ تانگ ہے۔ وہ 1904 میں سی چوان صوبہ میں پیدا ہوئے۔ اور اس طرح ہم 2004 میں گویا ان کی سویں سالگرہ میں چین گئے تھے اور 25 نومبر 2004 کو عین ان کی سالگرہ کے دن ہم وہیں شنگھائی میں موجود تھے جہاں کے ایک ہسپتال میں وہ داخل تھے۔ ہمیں بتایا گیا کہ انہیں پھیپھڑے کی پیچیدہ بیماری تھی۔ پھر ''پارکن سونزم'' نامی بیماری کے ہاتھوں ان کے چلنے پھرنے حتیٰ کہ گویائی کی قوت ختم ہو چکی تھی۔ اس روز بہت سارے لوگوں نے ہمیں بتایا کہ ''ہوا آڈونگ'' ہسپتال میں باجین کے وارڈ سے لے کر باہر برآمدے تک پھولوں کے گلدستے ہی گلدستے تھے، سالگرہ کے کارڈ ہی کارڈ تھے، رنگ ہی رنگ، خوشبو ہی خوشبو۔ اس ادبی دیوتا کی یہ سالگرہ بہت رومانوی، بہت خوبصورت تھی۔ ہمارا اپنا میزبان جنکشی یو، ادیبوں کی مرکزی تنظیم اور ہم پاکستانیوں، کی طرف سے ہسپتال ہو آئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ہزاروں لوگ گلدستے اور سالگرہ کارڈ لئے وہاں لے جا رہے تھے۔ اس کے علاوہ چین کے ہر حصے سے ان کے قارئین نے ہسپتال فون کر کے سالگرہ مبارک کا پیغام ریکارڈ کرایا۔ اخبارات ایک رہنما کے بطور ان کی تصاویر، مضامین اور فیچروں سے بھرے ہوئے تھے۔ ٹی وی کے تمام اہم چینل ان کی سالگرہ شان کے ساتھ منا رہے تھے۔ ہمارے ہوٹل میں کام کرنے والے مزدوروں تک کو پتہ تھا کہ ان کے محبوب ادیب کی سالگرہ ہے۔ عوام اپنے محسنوں کو کہاں فراموش کرتے ہیں!!۔

باجین کی زندگی بہت دلچسپ رہی۔ وہ ہم بلوچوں کی طرح بہت وسیع اور مشترک خاندان میں رہتے تھے۔ تیس افراد کا خاندان تھا ان کا، اس کے علاوہ اتنے ہی نوکر تھے۔ باجین کا بچپن بڑے خاندان کی اس بڑی رجمنٹ کے بیچ گزرا۔ یہ خاندان ہر لحاظ سے ایک روایتی فیوڈل خاندان تھا۔ سڑا ہوا، دم گھٹا دینے والا فیوڈل خاندان۔ جہاں بدترین پدرسری نظام نافذ تھا، اور جہاں ایک شخص یعنی باجین کا دادا پورے گھرانے کا خدا بنا بیٹھا تھا۔ اپنے بچوں، پوتوں اور نواسوں کے سارے فیصلے وہی کرتا تھا۔ ان کی تعلیم، ان کی منگنیاں شادیاں، اٹھنا بیٹھنا، لباس..... سب کچھ اسی کے اشارہِ ابرو کی مطابقت میں سرانجام پاتا تھا۔ ہر فرد کی، ہر انفرادی جنبش اسی کی رضا سے ہوتی تھی۔ بقیہ پورا گھرانہ ذہنی طور پر مفلوج اور کرپٹ تھا۔(بالکل یہی صورت ہمارے آج کے بلوچ خاندانی اکائی کی ہے۔ بدترین اور سخت گیر فیوڈل خاندانی نظام!!)

ہر ماں کی طرح باجین کی ماں بھی مہر بھری ماں تھیں۔ تعلیم یافتہ ماں جس نے چینی کلاسیک پڑھ رکھی تھی۔ وہی علم اس نے اپنے بیٹے میں اس وقت ودیعت کر دیا جب ابھی وہ بہت ہی چھوٹا تھا۔ اس ماں نے بچے کو جو خاص بات سکھائی وہ یہ تھی کہ ''بیٹا، ہر انسان سے پیار کرو، خواہ وہ امیر ہو یا غریب'' ۔(مائیں زندہ باد!!)۔ باجین دس برس کے ہیں جب 1914 کو اس کی مہرباں والدہ انتقال کر جاتی ہیں۔ ٹھیک تین برس بعد 1917 میں والد فوت ہو جاتے ہیں اور 1919 میں دادا چل بستے ہیں۔

اور اسی سال چین کے اندر 1919 والی ''چار مارچ کی تحریک'' چلی۔ باجین تب پندرہ برس کے تھے۔ یہ سامراج دشمن اور فیوڈل مخالف تحریک بیجنگ میں ابھری تھی جہاں جمہوری نظریات سے لیس طلباء نے جاپان سے چین کی سیاسی آزادی کی جدوجہد شروع کی اور ایک جمہوی ثقافتی زندگی مانگی۔ طلباء کی اس تحریک سے چین کا ہر نفس ہر بشر متاثر ہوا۔ اور باجین جیسا نوجوان تو وابستہ ہی ہو گیا اس نئی جمہوری سوچ والے کارواں کے ساتھ۔

آج کے ہر بلوچ کی طرح اس زمانے کے چینی خاندان میں مسلط فیوڈل اخلاقیات سے ہر نوجوان بیزار تھا۔ اور باجین تو ساٹھ افرد کے کنبے میں گھریلو سازشوں، چاپلوسیوں، چپقلشوں سے تنگ آ چکے تھے۔ چچاؤں کی آپسی کولڈ وار، ماسیوں ماموں کی پر اسرار کھسر پھسر، آزادی کو ترستے بچوں کی خفیہ قانون شکنیاں، ظاہرداری۔۔۔ اور اب جب والدین بھی انتقال کر گئے تو پھر اس 20 برس کے نوجوان کے لئے وہاں رہنے کا ذرا برابر جواز موجود نہ رہ گیا۔ چنانچہ وہ اپنے بڑے بھائی کی مدد سے 1923 میں اپنے گھر سے نکل پڑتے

ہیں اور شنگھائی چلے آتے ہیں۔ اپنے اس اقدام کو انہوں نے یوں بیان کیا: ''۔۔۔۔جیسے وحشتناک سائے سے نجات مل جائے''۔ شنگھائی آ کر وہ جوانوں کی اس دانشورانہ تحریک میں شامل ہو گئے جو فیوڈل نظام کے خاتمے کا مطالبہ کر رہی تھی۔ واضح رہے کہ وہ سولہ برس کی عمر میں انارکزم کے زبردست حامی بن چکے تھے۔ یعنی ایک ایسا سیاسی مکتبِ فکر جو ہر طرح کے جابرانہ کنٹرول اور اتھارٹی کو مسترد کرتا ہے۔

باجین 19 ویں صدی کے روسی تحریک سے بہت متاثر ہوئے (بھلا کون نہیں ہوا ؟)۔ انہوں نے ایک پیشہ ور انقلابی بننے کا ارادہ کیا تا کہ دیہات میں جائیں اور عوام کی آزادی اور خوشحالی کے لئے کام کر سکیں۔ انہوں نے اپنا قلمی نام روس کی دو عظیم شخصیات کے ناموں کے چینی تلفظ کے ساتھ جوڑ کر رکھ لیا تھا۔ ''باجین'' گویا دو لفظوں یا دو شخصیات کے ناموں کے حصوں کو جوڑ کر بنا: ''با'' تو باکونن سے لیا گیا ہے جو کہ انیسویں صدی کے انارکسسٹ تھے۔ وہی مشہورِ عالم باکونن جن کی مشہور کتاب ''خدا اور ریاست'' ہے۔ اور ''جین'' جدید انارکسسٹوں کا سائنسی شارح، پیٹر کراپٹوکن کا چینی بگڑا تلفظ ہے۔ یہ صاحب انارکسٹ کمیونزم کے پیر تھے۔ وہ تھے تو شہزادے مگر کسانوں میں دلچسپی لینے کی وجہ سے اپنا لقب چھوڑ دیا۔ وہ بادشاہ کی روسی جیل سے تو فرار ہو گئے مگر فرانس میں تین سال تک پابندِ سلاسل رہے۔ کراپٹوکن کے خیال میں انسانی معاشرے کی ترقی میں تین رکاوٹیں ہیں: ریاست، جائیداد اور مذہب(3)۔ وہ 1917 کے عظیم اکتوبر انقلاب سے قبل زبردست سیاسی زندگی گزارتے رہے تھے جہاں جلاوطنیاں تھیں، جیلیں تھیں اور صعوبتیں تھیں۔

اس طرح نوجوان یاؤ تانگ، باجین بن گئے اور پھر باجین ہی اس خوبصورت انسان کی شناخت بن گیا۔ اور کتنی مقدس شناخت تھی یہ۔ مگر بلوچوں میں تو بڑے انسانوں کے نام رکھنے سے انسان اپاہج، پاگل یا بدقسمت نکلتا ہے۔ باجین تو ایسا نہ نکلا۔ (اعتقادات باجینوں کے ہاتھوں ہر گھڑی قتل ہوتے جاتے ہیں!!)

1927 میں شنگھائی میں کمیونسٹوں کے قتلِ عام کے دوران باجین فرانس بھاگ گئے جہاں اور بھی بہت سے جلاوطن انقلابی پناہ لیتے تھے۔ باجین کو امید تھی کہ وہ اپنے عوام، ملک اور خود اپنے آپ کو بچانے کا کوئی نہ کوئی راستہ تلاش کر لیں گے۔ 1928 تک وہ وہیں پیرس میں رہ کر تعلیم حاصل کرتے رہے۔ یہاں وہ ایک چھوٹے سے نیم تاریک اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ وطن سے دوری، روحانی بے چینی، اور سیاسی حالات میں کنفیوژن ان کے لئے ناقابل برداشت ہو گئے۔ خود کو تباہی سے بچانے کے لئے باجین نے قلم اٹھایا۔ اور اپنے خیالات اور جذبات کو ٹکڑوں میں لکھنا شروع کر دیا۔ ایک مایوس نوجوان کے کیریکٹر تلے باجین نے اپنی روحانی اور ذہنی حالت لکھنی شروع کی۔ انہی تحریروں سے ان کا ناول ''تباہی'' صورت پذیر ہوا جو کہ 1929 میں شائع ہوا۔ چینی نوجوانوں میں یہ ناول بہت مقبول ہوا۔ یہ ناول رومانس اور انقلاب کی کہانی ہے۔ یہ ایک طرح کا سوانحی ناول ہے جس میں دنیا کے اندر چین کے حقیر مقام پر دکھ اور غم کا اظہار ہے اور انقلاب کو علاج کے طور پر دکھایا گیا ہے اور جس کے بارے میں پرامیدی کا تاثر ہے۔

اس طرح برسوں تک انقلاب کے سپاہی یا رائٹر میں سے ایک کا انتخاب کرنے کے شش و پنج میں مبتلا باجین، بالآخر قلم کے اسیر ہو گئے۔ اور پیرس سے واپسی پر انہوں نے ادب ہی کو اپنا کیریئر چنا۔۔۔۔ اور سچی بات یہ ہے کہ یہ کیریئر ہر لحاظ سے شاندار نکلا۔

1930 کی دہائی کے پہلے نصف میں انہوں نے شنگھائی میں تین ناولوں کا ایک سلسلہ (ٹرایالوجی) لکھا: محبت کے تین گیت۔ ان ناولوں کے انفرادی نام ہیں: دھند۔ بارش، اور، گرج چمک۔ ان ناولوں میں بھی وہ رومانس اور انقلاب پہ توجہ مرکوز رکھتے ہیں۔ 1933 سے 1940 کے برسوں میں انہوں نے تین اور ناولوں کا ایک سیٹ لکھا: شدید سیلابوں کے تین گیت۔ ان ناولوں کے انفرادی نام ہیں: خاندان، بہار، خزاں۔ ان سب میں سے ''خاندان'' ان کا مشہور ترین ناول بنا جس نے انہیں شہرت کے آسمان تک پہنچایا۔ باجین کے

دوسرے سارے ناولوں کی طرح ''خاندان'' بھی ایک طرح سے ان کی خودنوشت سوانح حیات ہے۔ یہ 1933 میں شائع ہوا۔اس میں مصنف نے چین میں وسیع خاندان کے عروج و زوال کی کہانی لکھی ۔ یہاں وہ نوجوان نسل پر روایتی فیوڈل خاندان کے زہریلے اثرات دکھاتے ہیں ۔ یہی تو ان کے اپنے وسیع خاندان کی کہانی تھی ۔اتفاق دیکھیے کہ جس روز اس ناول کی پہلی قسط اخبار میں چھپی ،اسی روز باجین کے سب سے بڑے بھائی نے خاندان کے سخت اور حاکمانہ رویوں کے ہاتھوں طویل ڈپریشن کا شکار ہوکر خودکشی کر لی ۔اس واقعے نے فیوڈل نظام سے باجین کی نفرت مزید گہری کر دی اور ان کا یہ ناول ایک ماسٹر پیس بن گیا۔ بلا شبہ فیوڈل ازم انسانی مسرتوں کو دیمک کی طرح چاٹتی ہے۔باجین نے ان تینوں ناولوں میں چین کے فیوڈل وسیع خاندانی ڈھانچے پر حملہ کیا۔

باجین نے ناول نویسی جاری رکھی ۔اور ''گروپ'' لکھا۔اس نے جاپانی حملہ کے خلاف جنگ مزاحمت (1937 تا 1945) کے دوران ایک جگہ سے دوسری جگہ بھاگتے رہنے کے باوجود ''سکون کا باغ'' (1944)،''وارڈ نمبر چار'' (1946) اور ''سرد راتیں'' (1947) جیسے مشہور ناول لکھے۔ان کا ناول ''سکون کا باغ'' میں نے فارن لینگوئج بیجنگ کی کتاب گھر سے خریدا اور وہیں بیجنگ میں پوری رات بیٹھ کر پڑھ ڈالا ۔ یہ بھی خاندانی رشتوں کے بارے میں بہت ہی موثر ناول ہے۔ بچوں کی پرورش کے بارے میں اس کتاب سے بہتر کوئی کتاب ابھی تک میری نظر سے نہیں گزری۔خاندان میں آپسی رشتوں کی تفصیل ، اور ان رشتوں میں روایت پرستی کا کھوکھلا پن بہت خوبصورت انداز میں بیان کئے گئے ہیں۔

مندرجہ بالا تینوں ناول باجین نے جاپانی جارحیت کے خلاف چین کی جنگ مزاحمت کے بارے میں تخلیق کئے ہیں ۔اور یہ تینوں ناول بھی باجین کی بہت ہی مضبوط تحریریں ہیں۔اسی دوران انہوں نے جنگ کے لئے لوگوں کو تیار کرنے کے لئے بڑی ثقافتی سرگرمیاں بھی جاری رکھیں ۔ان کی کتابوں نے خوب مقبولیت پائی ،نوجوانوں کو بیدار کیا، انہیں روایت پرستی کی مخالفت سکھائی اور ایک بہتر مستقبل کے لئے جدوجہد کا درس دیا۔اسی زمانے میں ان کی شادی ہوئی ۔ان کی محبوب بیوی کا نام چن یون ژین تھا۔ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ باجین ایک مثالی شوہر اور باوفا جیون ساتھی ثابت ہوئے۔

باجین نے بے شمار افسانے بھی لکھے،انہوں نے بچوں کے لئے مضامین اور کتابیں لکھیں۔ایک غضبناک تیز رفتاری سے لکھتے تھے وہ۔ایک غضب کے لکھاری تھے وہ۔انہوں نے کہیں لکھا ہے: ''میری نظروں کے سامنے بہت سے دردناک مناظر ہیں۔اوروں کے دکھ اور خود میری اذیتیں میرے ہاتھوں کو حرکت پر مجبور کرتی ہیں ۔ میں لکھنے کے لئے ایک مشین بن جاتا ہوں''۔

ایک اور جگہ اپنی برق نویسی کو یوں بیان کرتے ہیں:

''میرے دل پہ ایک قسم کا ''بوجھ'' تھا۔خواہ یہ تنہائی تھی ،تشویش تھی ، پشیمانی تھی ، اشتیاق تھا، یا دردمندی تھی ۔ میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔مگر مجھے لگتا ہے کہ جیسے کوئی چیز میرے دماغ پہ بھاری بوجھ ڈال رہی ہے۔۔۔ایک وزنی بوجھ جسے میں پھینک نہیں سکتا۔ایک ایسا بوجھ جو مجھے لکھنے پر مجبور کرتا ہے''۔(4)

باجین 1935 سے 1950 تک شنگھائی میں ''کلچرل لائف ہاؤس'' اور ''پنگ مِنگ پبلشنگ ہاؤس'' کے چیف ایڈیٹر رہے۔وہ 1953 میں چائنیز رائٹرز ایسوسی ایشن کے وائس چیئرمین منتخب ہوگئے۔اسی عرصے کے دوران یہ سچا ادیب کمیونسٹ پارٹی کے بارے میں اپنی سوچ بدل دیتے ہیں۔1954 میں انہوں نے انارکزم سے ناطہ توڑا۔اور اسی زمانے میں وہ کمیونزم کے قریب آئے ۔ باجین شنگھائی کے ادبی مجلوں ،'' لٹریری اینڈ آرٹ منتھلی'' ''ہارویسٹ'' اور ''شنگھائی لٹریچر'' کے چیف ایڈیٹر بھی رہے۔1962 میں وہ ''ادبی وفنی سرکلز'' کی شنگھائی فیڈریشن کے چیئرمین منتخب ہوئے۔

پھر 1966۔۔۔۔1976 کا دور آیا۔۔۔''ثقافتی انقلاب'' کا دور۔قہر و جبر کے

اندھے پن کا دور۔ باجین بھی معتوب ٹھہرے اور بدترین تکالیف اور بے حرمتیاں جھیلیں۔ بلا شبہ ہر جگہ کمیونزم کا بدترین زمانہ وہ رہا ہے جہاں پارٹی کے اندر اختلافات پیدا ہوئے ہوں ۔ایک تباہی ایک بربادی چھا جاتی ہے، پورا سماج اندھا ہو کر آپس میں چاقو بازی پر لگ جاتا ہے۔ہم نے یہ حشر افغانستان میں دیکھا، روس میں دیکھا، چین میں دیکھا۔ باجین جیسے ہزاروں فیوڈل دشمن، سچے اور ملوک انسان گالیوں، تھپڑوں، اور مشقتوں کی نذر ہوئے۔ حاکموں نے انہیں پیٹا، گھسیٹا، قید کیا اور پورے چین میں نفرت سے اس کا نام ''بہت ہی زہریلا پودا'' رکھا (یہ ساٹھ اور ستر کی دہائیوں کی بات ہے جب بلوچستان میں میرے چچا حاجی بختیار خان کو ''کالا ناگ'' کہہ کہہ کر بدنام کرنے کی مہم چلی تھی، جب ستر کی دہائی میں بابائے بلوچستان کو ''بابائے مذاکرات'' اور بلوچوں کے قومی شاعر گل خان کو ''گل خاتون'' کہہ کر تمسخر اڑایا جاتا تھا)۔مگر سونے کی قدر جوہری ہی جانے۔اسی باجین کے لئے عظیم ادیب لوہسون نے یہ سند جاری کی: ''ایک لکھاری سوز کے ساتھ، اور ترقی پسند فکر کے ساتھ''۔

باجین خوش قسمت نکلے کہ اسی دوران اٹلی کے مشہور عالم شاعر دانتے کی کتاب ''ڈوائن کامیڈی'' انکے ہاتھ لگی۔ یہ ایک ایسی کتاب ہے جو ایک آرٹ گیلری کی مانند ہے جس میں بیسیوں انسانی کیریکٹر ہیں، شیطان ہیں، فرشتے ہیں۔اس شہرہ آفاق تصنیف میں دانتے نے اس بات پر بحث کی کہ انسان کیا ہے، اس کی خواہشیں کیا ہیں اور ان خواہشوں کے حدود کیا ہیں۔ وہ اس پہ بھی قلم طراز ہوتے ہیں کہ خود دنیا کیا ہے، حق کیا ہے، اور گناہ کیا ہے؟۔ باجین اس کتاب سے بہت متاثر ہوئے۔ اور اسی کتاب سے سختیاں جھیلنے کا حوصلہ پاتے رہے۔

دانتے کے ساتھ ان کا یہ تعلق پھر زندگی بھر برقرار رہا۔1982 میں اسی دانتے کے ترجموں نے انہیں ''دانتے انٹرنیشنل پرائز'' سے سرفراز کیا۔

باجین نے صرف دانتے کا ہی ترجمہ نہیں کیا۔ انہوں نے مشہور روسی لکھاری کروپوٹکن کی بھی کئی تحریروں کا ترجمہ کیا۔ باجین نے بے شمار روسی ادب پاروں کو چینی میں ترجمہ کرنے اور چینی عوام میں روشناس کرنے میں اہم رول ادا کیا۔انہی خدمات کے اعتراف میں وہ سوویت یونین سے بھی اعزازات لے چکے ہیں۔ بیرونی زبانوں سے تراجم کی ان کی 20 کتابیں ہیں۔

گو کہ باجین خود ایک فیوڈل خاندان میں پلے بڑھے مگر اسی فیوڈل خاندان کے خلاف وہ زندگی بھر لڑتے رہے۔اسی لیے تو انہوں نے اپنے دونوں بچوں کی بڑی روشن خیال اور جمہوری تربیت کی۔ان کا ایک بیٹا ہے اور ایک بیٹی ہے۔دونوں نے اپنی اپنی مرضی کی شادیاں کیں۔ بیٹی ''لی ژیاؤلین'' ایک بڑے چینی ادبی رسالے کی ایڈیٹوریل بورڈ کی معزز ممبر ہیں۔اور بیٹے ''لی ژیاؤ تانگ'' ایک ابھرتے ہوئے ناول نگار ہیں۔اس طرح ادیب باپ کے وارث دونوں بچے بھی ادب ہی سے وابستہ ہیں۔

1973 میں ان کی بیگم انتقال کر گئیں۔اس بڑے انسان کو اپنی بیگم سے اس قدر پیار اور اخلاص تھا کہ اگلے بتیس برس تک انہوں نے دوسری شادی نہ کی اور آخری ساعت تک اپنی مرحومہ بیگم سے جذباتی طور پر وابستہ رہے۔انہوں نے ان کی راکھ اپنے گھر میں رکھی ہوئی تھی۔اور اپنے احباب سے کہہ رکھا تھا کہ ''جب میں مر جاؤں تو میری راکھ میری بیگم کی راکھ سے ملا دی جائے''۔

1980 کی دہائی میں ان کی مشہور ترین کتاب Random Thoughts کے نام سے چھپی۔ یہ ان کی طویل یادداشتیں تھیں۔اس کتاب میں ثقافتی انقلاب کے عذابوں بھرے زمانے کی کیفیات ہیں جہاں وہ انسانی وقار، اور انسانی حقوق کی ضمانت کا مطالبہ کرتے ہیں۔ان کا ایمان رہا ہے کہ آزادانہ سوچنے اور سچ کہہ ڈالنے کی جرات سے آمریت کی راہیں روکی جا سکتی ہیں۔اور یہ موقف انہوں نے اس وقت پیش کیا جب چینی ادیب ابھی ایسا کرنے میں جھجک رہے تھے۔ بہت سارے لکھاری خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے۔مگر باجین فرض کی

چوکی پہ قلم کاغذ لئے مستعدی سے ڈیوٹی پہ ہمہ وقت موجود رہے۔ وہ پاک تھے اس لئے کہ انہوں نے اخلاقی سچ کا پرچم تھامے رکھا۔ باجین نے سچ کے علاوہ کچھ نہ لکھا۔ اور سچ لکھتے ہوئے اس کا ایک ہی دشمن تھا، جھوٹ!۔ جھوٹ، جس کے کئی چہرے تھے، جس کے کئی بھیس تھے اور کئی طریقہ ہائے واردات تھے۔ جھوٹ کا تعلق حاکموں سے ہوتا ہے۔ اور سچ عام الناس کا لباس۔ باجین نے جھوٹ کے خلاف سچ کا ہتھیار اٹھایا اور عوام کے لباس کو سرفراز و پروقار بنانے میں زندگی بتادی، ظلم پیئے، جور سہے، بدنامیاں جھیلیں۔ وہ آکسیجن کا ایک ایک مالیکیول اس قرض پہ لیتے رہے کہ سماجی ترقی اور انسانی بہبود کے راستے میں حائل ہر فرسودہ روایت، ہر غیر منطقی نظام کے خلاف بے جگری سے لڑیں گے۔ اور وہ اس لین دین میں بہت ایماندار نکلے ۔ باجین نے عالمگیر محبت کے سامنے آنے والے ظلم کے ہر حملے کو اپنی روح اور لہو پہ سہا۔

چین کے یہ عظیم ادیب ایک بڑے اور بے لوث انسان بھی تھے۔ بلاتکبر، سادہ، آسانی سے رابطہ میں آنے والے، اچھے انسان۔ وہ تمام تر عزت واحترام کے باوجود سرکار پہ انحصار نہیں کرتے تھے۔ باجین وہ واحد پیشہ ور ادیب تھے جو تنخواہ نہیں لیتے تھے۔ حتیٰ کہ اپنی پیرانہ سالی میں انہوں نے اپنی محدود بچائی ہوئی رقم کا کچھ حصہ ماڈرن چائینیز لٹریچر کی لائبریری کے سپرد کر دیا، کچھ ''امید'' نامی ایک پروجیکٹ کو عطیہ کیا اور بقیہ رقم دیگر خیراتی اداروں کو دے دی۔

ہم نے چین میں گھوم پھر کر دیکھا اور اہل دانش سے بھرپور مکالمے کئے۔ اور ہمیں اندازہ ہوا کہ چین میں اس یادگار ادیب کی حیثیت ایک مرشد کی سی ہے۔ اور کیوں نہ ہو؟ انہوں نے یہ عزت تو بہت محنت بہت کرب اور ریاضت سے حاصل کی تھی۔ انہوں نے ایک بار لکھا کہ لوگ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ میرے مشہور فقرے ''زندگی کے پھول کو کھلنے دیا جائے'' کا کیا مطلب ہے؟ تو میں انہیں بتاتا ہوں کہ انسان صرف کھانے کے لئے ہی زندہ نہیں رہتا۔ بلکہ اسے سماج میں کچھ رنگ شامل کرتے رہنا ہے۔ انسان صرف اسی وقت مکمل طور پر کھِل سکتا ہے جب وہ اپنی زندگی دوسروں کی مدد کے لئے وقف کر دے۔

باجین نے کل بیس ناول لکھے۔ جی ہاں بیس ناول۔ ان کے افسانوں کی تعداد ستر ہے۔ ان کی تحریروں میں انسانی آزادی، جمہوریت، اور انسان کی نفسیاتی خودمختاری کی بے انت طلب موجود ہے۔ وہ انسانی فطرت سے متعلق گہری چھان بین کے مالک ادیب تھے۔ ان کی پوری ادبی زندگی اپنے محبوب وطن چین کے ساتھ قریبی طور پر جڑی ہوئی ہے۔ چینی تاریخ کے بارے میں وہ ایک اتھارٹی تھے۔ ان کی قلمی زندگی تقریباً ساٹھ برس رہی۔ ان کی تحریروں میں سے اکثریت کے ترجمے جاپانی، روسی، انگلش، فرانسیسی، ہنگیرین، پولش اور جرمن زبانوں میں ہو چکی۔ وہ زندگی کے آخری لمحوں تک امریکن انسٹی ٹیوٹ آف آرٹ اینڈ لٹریچر کے اعزازی ممبر رہے۔ انہوں نے سوویت یونین، فرانس، ویت نام، کوریا اور دیگر کئی ممالک کے ادبی دورے کے۔ 1999 میں چینی سائنس دانوں کے دریافت کردہ ایک سیارے کا نام باجین کے نام پر رکھا گیا۔ انہیں 2003 میں ''پیپلز رائٹر'' کا خطاب ملا۔

چین میں کالج کے نصاب میں ان کی زندگی اور تصانیف کے بارے میں ایک پورا باب وقف ہے۔ انہیں واقعتاً 4 مئی تحریک کا بیٹا سمجھا جاتا ہے۔ انہوں نے دانش و تنظیم کے لحاظ سے ایک لق ودق صحرا میں فیوڈل نظام کے خلاف نعرہِ مستانہ بلند کیا، نوجوانوں کو متوجہ کیا، انہیں اکٹھا کیا اور انہیں شرفِ انسان کے احترام کے قافلے میں منظم کیا۔ باجین کو ''دانشوروں کا ضمیر'' کہا جاتا ہے۔ انہوں نے اپنے ملک اور اس کے عوام سے بے پناہ محبت، وفاداری اور دردمندی استوار کر کے چینی قارئین میں بلندترین احترام حاصل کیا۔ اس بڑے ادیب کو نوبل پرائز کے لئے دوبارنامزد کیا گیا۔

باجین زندگی کے آخری برسوں میں پارکنسونزم کی بیماری کے ہاتھوں مفلوج ہو گئے ۔ وہ چھ برس تک ہسپتال میں موت سے لڑتے رہے۔ اور بالآخر پیر سترہ اکتوبر 2005 کو اپنی 102 ویں سالگرہ سے ایک ماہ قبل ایسٹ چائنا ہسپتال شنگھائی میں عین اس وقت فوت ہو

گئے جب ان کا محبوب وطن خلا میں دوبارہ خلائی جہاز شنزو-6 داخل کر چکا تھا۔

چین اور دنیا بھر میں اُس عظیم چینی ادیب کی موت کا غم چھا گیا جس نے قبل از انقلاب فیوڈل فیملی اور قومی زندگی کے تشدد اور درد کو مفصل اور موثر بیان کیا۔ اس نے انفرادیت اور سماجی ٹرینڈز کے برخلاف کنفیوشس کی رجعت کی مخالفت کی۔ اور نوجوان نسل کی اقدار کی وکالت کی۔ باجین چین کے جدید ادب کے اہم ترین کہکشاں کے آخری دمکتے ستارے تھے جو بیسویں صدی کے اولین نصف سے لے کر اکیسویں صدی کے اوائل تک اپنی روشنی انسانوں میں لٹاتے رہے۔ ان کا مقولہ تھا: ''سچ سے محبت، اور، ایمانداری سے زندگی گزارنا میرا وطیرہ رہا ہے''۔

باجین کا یہ شاندار قول اپنی اولاد کو ضرور سنایئے:

''اپنے آپ سے سچے رہیے، دوسروں سے سچے رہیے!!''

حوالہ جات

1۔ فیضی، عنایت اللہ، چین بہ جبین صفحہ 22

2۔ ایضاً صفحہ 22

3۔ قریشی، صدیق۔ اہم سیاسی مفکرین۔ مقتدرہ قومی زبان اسلام آباد 1987
صفحہ 148

4۔ باجین/جیک ہو۔ Garden of Repose ۔ فارن لینگویج پریس۔ بیجنگ۔
صفحہ 45

ماؤڈون

(1981-1896)

ماڈرن چائنیز لٹریچر میوزیم نے ہمیں ایک اور بڑے چینی ادیب سے روشناس کرایا۔یہ ماؤڈون تھے۔یہ دلچسپ بات ہے کہ چین کے جدید ادیب کہلانے والے سارے مشاہیر میں ایک قدر مشترک نظر آئیگی : وہ سب کے سب جاگیردار دشمن تھے۔ماؤڈن صوبہ چی چیانگ کے رہنے والے تھے۔روشن خیال والد نے بیٹے کو جدید سکول بھیجا۔ان کی والدہ کو ادب سے دلچسپی تھی۔ماؤڈن کا اصل نام شین ڈیہانگ تھا۔مگر انہوں نے 1920 کی شورش زدہ دہائی میں اپنا قلمی نام ’’ماؤڈون‘‘ رکھا۔اس مقدس نام کا مطلب ہے ’’تضاد‘‘۔اور تضاد کا قانون تو مارکسی فلسفہ کی جان ہے۔اور ایک شخص نے اپنا نام تبدیل کر کے اس فلسفے پر رکھا۔(پھر کہتے ہیں کہ سوشلزم ختم ہوگیا یا مارکسزم کو زوال آسکتا ہے!!)۔’’تضاد‘‘ کا والد اس وقت فوت ہوا جب وہ ابھی دس برس کا تھا۔وہی بیٹے کے لئے نصاب تشکیل دیتے تھے اور وہی ان کے ٹیچر تھے۔ان کی وفات کے بعد یہ فریضہ ان کی مکہ ماں نے سنبھالا۔

1911 کا انقلاب برپا ہونے کے بعد، بورژوازی کی اصلاح پسندی اور جمہوری فکر نے ان پر بڑا اثر ڈالا۔وہ 1916 میں شنگھائی تجارتی پریس میں کام کرنے لگے۔اس طرح ان کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔سامراج دشمن اور جاگیردار مخالف چار مئی کی تحریک میں ماؤڈون نے سرگرمی سے حصہ لیا۔1920 میں انہوں نے کمیونسٹ پارٹی آف سوویت یونین کے آئین و منشور کا چینی زبان میں ترجمہ کیا۔یہی آئین تو پھر چین کی کمیونسٹ پارٹی کے آئین کا منبع بنا۔

انہوں نے 1920 میں شنگھائی کمیونسٹ ٹیم میں شمولیت کی اور 1921 میں چینی کمیونسٹ پارٹی کے قیام میں مدد دی۔وہ پارٹی میں شامل ہونے والے اولین ادیب بنے۔

1920 میں انہوں نے نئے ادب کی تحریک میں پہلی ادبی تنظیم ’’ادب اکیڈمی‘‘ قائم کی اور ’’ادب برائے زندگی‘‘ کا نعرہ دیا۔1921 میں انہوں نے اپنی عظیم تصنیف ’’وہم کا ازالہ‘‘ شائع کیا۔ماؤڈون کا پہلا ناول ’’تباہی‘‘ 1928 میں شائع ہوا۔

جب ؁1928 میں قوم پرستوں نے کمیونسٹوں پر یلغار کر دی تو وہ بھاگ کر جاپان چلے گئے ۔اور 1930 میں واپس شنگھائی آ گئے ۔انہوں نے چین کے ''بائیں بازو کے مصنفین کی تنظیم'' میں حصہ لیا اوراس کی رہنمائی کرتے رہے۔ثقافتی محاصرے کے خلاف جدوجہد میں انہوں نے لوہسون اور دوسرے ادیبوں سے مل کر کومنتانگ حکومت اور اسکے دانشوروں کے خلاف بہادری سے جدوجہد کی ۔لوہسون اور ماؤڈون کے جتھے نے سماج کے حقوق کی خاطر خوب خوب جدوجہد کی اور وہ ادب کے مورچے میں انقلابی جدوجہد کرتے رہے ۔1937 میں ماؤڈون رسالہ ''آرٹ کا میدانِ جنگ'' کے ایڈیٹر ان چیف بنے ۔1939 کے آخر میں وہ سنگیانگ کالج کے استاد بنے ۔1949 میں عوامی جمہوریہ چین کے قیام کے موقع پر چائنیز رائٹرز ایسوایشن کے چیئر مین بنے۔

نئے چین کے قیام کے بعد سے 1964 تک وہ وزیرِ ثقافت رہے۔انہوں نے سوشلسٹ ثقافت اورفن وثقافت کی زبردست خدمت کی۔

وہ ماہنامہ ''افسانہ''،''عوامی ادب'' اور ''ترجمان'' کے چیف ایڈیٹر رہے۔ان کا اولین ناول ''واہمہ'' تھا۔ان کا مشہور ترین ناول ''نیم شب'' ہے۔

وہ ناول کے علاوہ ادبی تبصرہ نگاری، تاریخی کہانی اور نثر پہ بھی لکھا کرتے تھے۔ان کے مجموعہ تصانیف میں چھ ناول، چار درمیانے ناول، پچاس سے زائد افسانے، ایک ڈرامہ اور گیارہ نثری مجموعے شامل ہیں۔ان کا ناول ''موسم بہار کے ریشمی کیڑے'' اس عہد کا ترجمان ناول شمار ہوتا ہے۔

اس زبردست انسان کو ثقافتی انقلاب کے تاریک عہد میں بہت ہتک آمیز سلوک کا سامنا ہوا۔وہ 1981 کو بیجنگ میں انتقال کر گئے ۔موت سے ذرا قبل اپنے بسترِ مرگ پہ وہ بہترین چینی ناول نگاروں کی حوصلہ افزائی کے لئے ''ماؤڈون لٹریچر ایوارڈ'' کے قیام کی خاطر چائنیز رائٹرز ایسوسی ایشن کو 250,000 یوان عطیہ دے گئے۔

کومورو

(1978-1892)

ان کا پیدائشی نام ون باؤ تھا اور قلمی نام کومورو۔ وہ صوبہ سی چوآن کے ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ 1905 میں جیاڈنگ کاؤنٹی کی اعلیٰ درجے کے پرائمری سکول میں داخل ہوئے۔ پھر انہیں سکول میں پڑتال کی وجہ سے نکال دیا گیا۔ انہوں نے چن ڈوشہر میں مڈل سکول میں پڑھنے کے دوران بہت سے غیر ملکی ناول پڑھے اور سرگرمی سے سامراج کے خلاف وطن سے محبت کی مہم میں حصہ لیا۔ 1913 میں انہوں نے گریجوئیشن کر لی۔ نوجوانی میں انہوں نے بھی قدیم طرز کی شاعری لکھی۔ 1914 میں وہ تعلیم حاصل کرنے کے لئے جاپان گئے۔ 1918 میں ایک یونیورسٹی میں طب سیکھنے لگے۔ اس دوران انہوں نے ٹیگور، سپینوزا، گوئٹے، ہائن، شیلر، شیکسپیئر، شیلے، وٹمین اور فرانسیسی و روسی ترقی پسند ادیبوں کی تصنیفات پڑھیں۔ پھر روس کے اکتوبر انقلاب نے ان کی سوچ پر زبردست اثر ڈالا۔ اور انہوں نے سامراج اور جاگیردار دشمن شاعری شروع کر دی۔ سامراج اور جاگیرداریت کے خلاف چار مئی کی تحریک کے دوران انہوں نے انقلابی جذبے سے بھرپور شاعری کے ذریعے عوامی انقلاب اور سوشلزم کی تعریف کی اور شاعری کو ایک نیا طرز اور طریقہ عطا کیا۔ وہ چین کی نئی شاعری کے بانی قرار پائے۔

1923 میں وہ یونیورسٹی سے فارغ ہونے کے بعد شنگھائی واپس آ گئے، طب چھوڑ دی اور ادب کے لئے مخصوص ہو گئے۔ ہفت روزہ ''تخلیق'' اور ''سیلاب'' کی ترتیب کی۔ ان کی ماؤزے تنگ سے ملاقات 1926 میں ہوئی۔ 1927 میں نان چنگ بغاوت میں حصہ لیا اور اسی سال وہ چواین لائی کے تعارف سے باقاعدہ کمیونسٹ پارٹی کے رکن بن گئے۔ جاپان کے خلاف جنگ مزاحمت کے دوران انہوں نے چیانگ کائی شیک کے مقبوضہ علاقوں میں رہ کر ترقی پسند ادیبوں اور فن کاروں کو متحد کر کے جاپانی جارحیت کے خلاف قومی آزادی کے حق میں زبردست ثقافتی مہم چلائی۔ جاپان کی شکست کے بعد انہوں نے کومنتانگ کے رجعت پسندی والی فاشزم کے خلاف جرات مندانہ جمہوری تحریک چلائی اور یوں عوامی جنگ آزادی کو زبردست تقویت پہنچائی۔

عوامی جمہوریہ چین کے قیام کے بعد کومورو ریاستی کونسل کے نائب وزیر اعظم، چین کی سوشل سائنسز اکیڈمی کے صدر، چین کے ادب وفن کی فیڈریشن کے صدر، نیشنل پیپلز کانگریس کی مجلس قائمہ کے نائب صدر اور قومی سیاسی مشاورتی کانگریس کے نائب صدر رہے۔ ان سب عہدوں کے باوجود انہوں نے اپنی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں میں کمی نہ آنے دی۔

ان کی لوسٹوریز اور آزاد نظم پہ کوششوں بالخصوص ان کی شاعری کے مجموعہ The Goddesses (1921) کو بہت مقبولیت حاصل ہوئی۔ انہوں نے کئی تاریخی ڈرامے لکھے۔

1966 میں وہ ان اولین لوگوں میں سے تھے جن پہ ثقافتی انقلاب نے حملہ کیا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ وہ فکر ماؤزے تنگ کو اچھی طرح سمجھ نہ پائے۔ وہ اس بات پہ بھی راضی ہو گئے کہ ان کی تصانیف کو جلا دیا جائے۔

ان کی شاعری میں مادر وطن سے محبت، اپنی پارٹی سے وابستگی اور عوام سے والہانہ پیار نمایاں ہے۔ ان کی اہم تصنیفات مثلاً شاعری کا مجموعہ ''پری'' تاریخی ڈرامہ ''چو یوان'' ''سائے ون جی'' اور ''ووزے تھیان'' بہت مشہور ہیں۔ ان کی مجموعہ تصانیف 17 جلدوں پر مشتمل ہے۔

وزیر اعظم چواین لائی کی یاد میں

کومورو

انقلاب کے پیش رو، عظیم سیاست دان
تمہارا روشن ستارہ غائب ہو گیا ہے، پانچوں بر اعظم ماتم میں ہیں
آنسوؤں کی جھڑیاں لگی ہوئی ہیں
لامتناہی ہجوم اظہارِ عقیدت کو آ رہے ہیں
عوام، تمہارے مہرباں دل کو کبھی نہیں بھولیں گے
تمہارے عظیم کارنامے صدیوں یاد رہیں گے
اے باوفا بادل! تمہاری عظمت سورج کے ہمراہ چمک رہی ہے
تابد آسمانوں اور زمینوں کے ساتھ قائم ودائم!

نواں باب

چین کا بڑا آدمی

1۔ قد اور عقل، قد اور فتنہ

واپسی پہ ہمارے میز بان، جنکشی یو نے اپنی نئی کتاب ''مشرق کی سیاحت میں مغرب کی تفہیم'' کے متعلق بتایا۔ عجیب عنوان ہے یہ کہ صاحب گھوم تو رہے ہیں مشرق میں اور تفہیم حاصل کر رہے ہیں مغرب کی۔ یہ جو عنوان رکھنے کا فن ہے۔ ناں! یہ کتاب لکھنے سے زیادہ مشکل ہوتا ہے۔ اور یہ ''عنوان گر'' لوگ ایسی دلچسپ چیزیں جوڑ کر بنا دیتے ہیں کہ مزہ آجاتا ہے۔ اس کتاب میں زیادہ تر مضامین جاپان کے بارے میں ہیں۔ اس لئے کہ جنکشی یو چائینیز رائٹر ایسوسی ایشن کے شعبہِ جاپان سے وابستہ ہیں۔ البتہ اس میں تبرک کے طور پر دو مضامین پاکستان کے بارے میں بھی ہیں۔ جن میں سے ایک بلوچستان سے متعلق ہے، اور اس کا عنوان ہے: ''سیب کے لمبے لمبے درخت''۔ چین بھی عجیب ملک ہے۔ اس کے آدمیوں کی طرح اس کے سیب بھی چھوٹے قد کے ہیں۔ اس لئے جب جنکشی یو نے کوئٹہ کے سیب کے بڑے بڑے درخت دیکھے تو مضمون کا عنوان تو یہ ہونا ہی تھا۔ اب پتہ نہیں ہمارے وفد میں شامل سب سے بلند قد شخص ڈاکٹر سلیم اختر کے بارے میں وہ کیا لکھ ڈالیں گے۔ جو کہ چینیوں کے اعتبار سے بہت بلند قامت انسان ہیں۔ اور ہم نے بھی اس بارے میں کوئی شرارت نہ کی ۔ اور قد کے بارے میں وہ مشہور روایت کسی کو نہ سنائی۔ جس کے تحت لمبے قد والے احمق ہوتے ہیں اور چھوٹے قد والے فسادی۔ سلیم صاحب کی ''عقلمندی'' کا استحقاق مجروح ہونے کا اندیشہ ہوتا جو کہ ان کی ساٹھ تصانیف کی صورت میں ویسے ہی مسلّم ہے۔ قد کے بارے میں روایت کے دوسرے حصے سے خود چینیوں کی ''پرامنی'' خطرے میں پڑ جاتی۔

میں نے بلوچستان کا مضمون اس سے فوٹوسٹیٹ کروا کے لے لیا کہ پاکستان جا کر اس کا اردو ترجمہ کرواؤں گا۔ مگر اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود کوئٹہ میں اس کا ترجمہ کرنے والا ابھی تک کوئی نہ ملا۔ یہاں کوئی چینی زبان جانتا ہی نہیں۔ اور یہ چینیوں کے اپنے کرتوتوں کی سزا ہے۔ اس لئے جنکشی یو بھگتیں۔ سوویت یونین نے تو سینکڑوں غریب بلوچستانیوں کو اپنے خرچے پر وہاں پڑھایا تھا۔ لہٰذا بے شمار لوگ روسی بولتے روسی لکھتے ہوئے نظر آئیں گے۔ مگر

چینی دوست تو صرف ضیاء الحق سے ہی گلے ملتے رہ گئے۔ اس گناہ کے کفارے میں وہ یہ بھی نہ کر سکے کہ ہمارے چار بچوں کو تعلیم ہی دلا دیتے۔ (سربراہوں کی بجائے عوام کی یاری بہت اچھی ہوتی ہے سائیں!!)

ہم واپس ہوٹل پہنچ گئے۔ رات کا کھانا پاکستانی سفارتخانہ میں پریس اور کلچرل اتاشی مسٹر جاوید کے ہاں تھا۔ مگر وہاں جانے سے قبل ہمیں وفد کے دوستوں کا شاپنگ کے لئے جذبہِ شوق بھگتنا پڑا۔ بلوچستان میں سخت بھوک کے باوجود بجّی جیسی ڈش دیکھنے پر بھی منہ میں پانی آجائے تو معیوب سمجھا جاتا ہے۔ مگر بقیہ پاکستان، بالخصوص پنجاب کے احباب کا تو شاپنگ کے تذکرے ہی پر باقاعدہ لعاب بہنے لگتا ہے۔ شاپنگ کا شوق، گفتگوئے شوقِ شاپنگ، جھپٹ کر پلٹنے اور پلٹ کر جھپٹنے والا اظہارِ شوق۔ ہمیں حیرت ہوئی، ہم مرعوب ہوئے، ہم مطلوب ہوئے اور مجبور ہوئے۔۔۔۔ ہم ان کے ساتھ ہولئے اور ایک گھنٹہ کے لئے قریبی مارکیٹ چلے گئے۔

2۔ کوھلو اور کاہان بخش دوں۔ مستؔ

میں نے ماسکو میں ''گُم'' اور ''تسُم'' نامی بہت بڑی مارکیٹیں تو دیکھ رکھی تھیں مگر سچی بات یہ ہے کہ اتنی بڑی مارکیٹ میں نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہمارے جہاں گردیدہ ہمسفر، یوسفی صاحب کا بھی یہی خیال تھا کہ پورے برطانیہ میں ایک سپر مارکیٹ کے علاوہ اس جتنی بڑی مارکیٹ کوئی نہیں۔ اظہار صاحب بھی دنیا گھومے انسان ہیں۔ نگر نگر گھومتے رہتے ہیں اور اپنے دوست افسروں کے لئے ہر جگہ سے ٹائیاں اور شرٹس خریدتے رہتے ہیں۔ وہ بھی اس مارکیٹ کی وسعت، تنوع اور سلیقہ و ورائٹی سے بہت متاثر تھے۔ یہ شاپنگ سینٹر برانڈڈ سامان سے بھرا، دوز یر زمین اور تین بالائی منزلوں پر مشتمل تھا جہاں نہ تو دکانداروں کی بات پکی تھی اور نہ قول سچے تھے۔ پتہ نہیں دکان میں جا کر قول کی سچائی کیوں فوت ہو جاتی ہے اور بات کی پکائی کچائی میں کیوں بدل جاتی ہے!!۔ یہ مارکیٹ (اور ہر مارکیٹ) بدترین سرمایہ داری اخلاق کا مظہر تھی۔

آپ ہمارے کوئٹہ، سبی یا بلوچستان کے کسی بھی بکرا منڈی (پڑی) میں جائیں تو وہاں آپ عجیب حرکت دیکھیں گے کہ ایک شخص دوسرے کا ہاتھ کھینچ کر اپنی قمیض کے دامن کے نیچے لے جاتا ہے۔ وہاں دونوں کی انگلیاں آپس میں ٹکراتی ہلتی رہتی ہیں۔ اور پھر ''ہاں'' یا ''ناں'' ہو جاتی ہے۔ یہ دراصل مویشی کی قیمت پر مذاکرات ہو رہے ہوتے ہیں۔ یہ عجیب حرکت مذاکرات کی رازداری کے لئے ہوتی ہے۔ ایک انگلی کا مطلب ایک ہزار، ڈیڑھ انگلی کا مطلب ڈیڑھ ہزار۔ اگر گاہک خریدے تو ٹھیک ورنہ کم از کم ریٹ افشاں تو نہیں ہوتے۔ ہرا یک اپنی راہ لے گا اور بیچنے والے کو اگلے ضرورت مند گاہک پر پھر اپنی مرضی کے ریٹ لاگو کر دینے کی آزادی ملتی ہے۔ (بلوچ مذاکرات بھی انگلیوں پر کرتا ہے۔ نقد قیمت طے کرتے ہوئے بھی، ٹرائیگر دباتے ہوئے بھی)۔ کہتے ہیں کہ چین میں نرخوں پہ مذاکرات وغیرہ جیسی بدبخت حرکت سوشلزم کے زمانے میں نہیں ہوا کرتی تھی۔ ہر چیز پر اس کی کوالٹی کے مطابق قیمت لکھی ہوتی تھی۔ مگر اب وہ سبز پرندہ کب کا اڑ کر ایڈم سمتھ کی بدروح کی سپردگی میں جانے پہ مجبور کر دی گئی ہے۔ اب تو اور تماشے ہیں۔ یہاں ساری کی ساری ''دکاندارنیاں'' ہوتی ہیں۔ دکاندار ایک بھی نہیں ہے۔ یہ لڑکیاں (یا عورتیں؟؟ کہ چینی خواتین کی عمر کا اندازہ راسپوٹین بھی نہیں کر سکتا) آپ کو دیکھتے ہی ''ہیلو ہیلو'' کی سرمایہ دارانہ پالیوشن والی چیخیں کرانے لگتی ہیں۔ ایک سے ایک بلند ہیلو۔ پہلی بار اندازہ ہوا کہ ''منافع'' الفاظ کے تقدس کو کس قدر کرخت بنا ڈالتا ہے۔ لڑکی کے منہ سے ''ہیلو'' سننے کی ناتمام حسرت میں پوری تیسری دنیا کے مرد اپنی زندگیاں بتا دیتے ہیں۔ مگر آج جب ''ہیلوؤں'' کے خرمن برس رہے تھے تو ہمیں قے آرہی

تھی۔ وہ ''ہیلو'' کے ساتھ ساتھ کیلکو لیٹر تھامے اپنے بازو ہوا میں لہرا رہی ہوتی ہیں۔ جیسے بھٹو مزدوروں کو الّو بنانے کی تقریر کر رہا ہو۔ وہ آپ کی پسند کی ہوئی چیز کی قیمت دس گنا زیادہ کر کے کیلکو لیٹر پر لکھ ڈالیں گی اور آپ کو دکھا دیں گی۔ آپ کے ''نہ'' کی گنجائش اس لیے نہیں ہو گی کہ وہ آپ کو مجبور کر دیں گی کہ کیلکو لیٹر پر آپ اپنی پسند کے ریٹ لکھ دیں۔ اور جب ایک بار آپ کی انگلی کیلکو لیٹر کے ''کی پیڈ'' پر لگی، تو سمجھ لیں کہ آپ پھنس گئے۔ یعنی اب اپنے ریٹ پہ بارگین تک آ گئے آپ۔ آپ بے چارے کتنا نیچے جائیں گے۔ مثلاً آپ اس کی لگائی قیمت کا دسواں حصہ بھی لکھ دیں تب بھی آپ گویا مہنگا خرید رہے ہوتے ہیں۔ وہ دو چار بار اپنے ریٹ کم کر کے لکھ دیں گی اور اس دوران آپ کسی نہ کسی ریٹ پہ بالآخر آمادہ ہو ہی جائیں گے۔ یا جب آپ اپنے بتائے ہوئے ریٹ پر ہی ڈٹ کر چل پڑتے ہیں تو وہ آواز دیں گی ''او کے، او کے''۔ جنسِ مخالف کی زبان سے لفظ ''او۔کے'' پر ایک زمانہ کو ہلو اور باکھان بخش دینے پر تیار ہوتا ہے۔ ہم اپنی قومی تاریخ میں اسی ''او کے'' کی آس میں 30 برس تک رندو لا شار بنے ہنستی مسکراتی بادشاہت برباد کر کے سندھ اور ست گھرا میں جا گمنام مرے، اسی ''او۔کے'' نے ووکیبلری میں ہیلن، ٹرائے، اور قلوپطرہ عطا کر دیے، اسی ''او۔کے'' میں ہمارے دادا تلّی کی ساری جائیداد لٹا بیٹھے۔ مگر اب جبکہ یہاں چین کی اس مارکیٹ میں ''او۔کے'' ہی ''او۔کے'' تھا مگر اس ''او۔کے'' میں نہ طلب کی وہ طاقت تھی نہ ہمیں اپنے ہتھیار ڈالنے پر کوئی لطف آ رہا تھا۔ بس گناہِ کبیرہ کے احساس کے ساتھ ماؤزے تنگ کا چھوٹا سا مجسمہ 100 یوآن کی بجائے محض 5 یوآن میں خرید لیا۔ یہ مجسمہ سگریٹ سلگانے والے لائٹر پر بنا ہوا تھا۔

میں جب پروفیسر داور کے لئے ایک سوٹ کیس خرید رہا تھا تو میں نے اپنے ترجمان سے ایک ایسا فقرہ کہہ دیا کہ وہ حیرت میں غرق ہو گیا۔ پہلے مجھے مریخ سے آیا ہوا سمجھ کر استعجاب سے تکنے لگا مگر مجھے سنجیدہ دیکھ کر ترجمہ کرنے والی اپنی ڈیوٹی سرانجام دینے لگا۔ ایسے جھجکتے ہوئے اس نے میرا فقرہ چینی میں ترجمہ کر کے دکاندارنی کو بتایا جیسے اس سے کوئی بہت ہی بڑی بداخلاقی کی بات کر رہا ہو: ''کیلکو لیٹر کو جہنم میں جھونک دو۔ تم مجھے ایک ہی قیمت بتاؤ۔ یا میں خرید لوں گا یا پھر چلا جاؤں گا۔ کوئی مول تول نہیں!''۔ وہ یوں حیران ہوئی جیسے میں نے بلوچ سے بغیر جھگڑا کیئے آبائی زمین تقسیم کرنے کا کہا ہو۔ جیسے میں نے مرحوم جام غلام قادر سے ''یعنی کہ، جو کہ، گویا کہ'' والے ان کے تکیہ کلام کہے بغیر دو فقرے بول دینے کی فرمائش کی ہو۔ جیسے میں نے محبوبہ سے مانگے بغیر پیار نچھاور کرنے کا کہا ہو۔ جیسے بورژوائی پارٹی نے اپنے ورکر سے پیسے دیئے بغیر جلوس میں شرکت ہونے کی بات کی ہو۔ بغیر مول تول کے اسے مزہ کیا آنا تھا۔ وہ حیران و ششدر کھڑی رہی اور ہم کسی اور دکان سے کیلکو لیٹروں کے سایوں میں ہی سوٹ کیس خرید چکے تھے۔ کیلکو لیٹر قول سے، زبان سے بہت طاقتور ہے!!۔

مول تول میں یہ کوتاہ قد اور پتلی کمریا والی آٹھویں جماعت پڑھنے والی لگتی لڑکی آپ کو آٹھوں شانوں چت زمین پر دے پٹخے گی۔ اور آپ اپنی جیب کی عصمت بیچ بازار لٹوا کر بادل ناخواستہ سامان اپنے کندھے پر لٹکائے چلتے بنیں گے۔ ان کا حملہ آور ہونے کا طریقہ بہت دلچسپ ہوتا ہے۔ آپ مارکیٹ کے مین گیٹ سے ہی نظر آ جائیں تو کوئٹہ کی مارکیٹوں جتنی چھوٹی چھوٹی دکانوں میں سے بھڑوں کی صورت آٹھ دس لڑکیاں پر آپ حملہ کر دیں گی اور چینی لہجے میں لپٹے انگریزی لفظ ''ہیلو'' اس قدر تیزی سے دھراتی رہیں گی جیسے کوئی پجاری ایک حسینہ کو دیکھ کر تیزی سے بھاگتا ہوا ''رام، رام، رام، رام'' جپتا جائے۔ جب ''ہیلو'' ''و'' کے بغیر لگنے لگے گا تو آپ پہلے ہی مارکیٹ اکانومی کے دانتے کی بیان کردہ جہنم کی پست ترین تہہ میں کراہ رہے ہوں گے۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں نے ماؤ کا مذکورہ مجسمہ دیکھنے کی خواہش کی تو لڑکیوں کو اندازہ ہو گیا کہ عجائب گھر میں ایک عدد بے وقوف مارکسسٹ داخل ہو چکا ہے۔ ان ''کرگسانیوں'' نے یک دم ایک لشکر بنا لیا، اور ''اِس زمانے میں بھی خدا کا نام لینے والے اکبر'' کو دیکھنے، نوچنے کے لیے فوری حرکت میں آ گئیں۔ انہوں نے اپنی اپنی دکانوں کی پچھلی صفوں سے ماؤ کے مجسمے

نکال نکال کر کاؤنٹروں پر ڈھیر کر دیئے۔ یہ بیچاریاں دو دہائیوں سے ماؤ کے خریداروں کی شکل دیکھنے کو ترس گئی تھیں۔ اور ماؤ بے چارے کا مجسمہ کن کن حقیر چیزوں پر بنا بک رہا تھا، آپ تصور تک نہیں کر سکتے۔ اور مجھے ماؤ کے مجسمے کی شکل میں موجود ان تمام اشیاء میں سے معزز ترین چیز، وہی لائیٹر لگا۔ میں نے خرید تو لیا مگر خریدتے ہوئے میں بلوچی میں چیئر مین سے کہہ رہا تھا:'' معاف کرنا کامریڈ، آپ کے ساتھ چین میں بڑی زیادتی ہو رہی ہے''۔

میں نے یہی جذبات ترجمان کے ذریعے میزبان جنکشی یو کو پہنچائے۔ وہ شریف آدمی مشرق کے عام سچے انسانوں کی طرح ایک بار تو جھینپ گیا مگر دوسرے ہی لمحے سول سیکرٹریٹ کوئٹہ کے بے حس افسروں کی طرح خالی چہرہ لئے خلا میں گھورنے لگا۔ گویا کہہ رہا ہو :''مری ماما! سمجھا کرو، نا!''

ہم بہت ہی چھوٹی مگر ہمارے ساتھی، بالخصوص پنجابی دوست، بہت ہی موٹی خریداری کر کے لوٹے۔

3۔ڈی میلو اور سلیم اختر

ہم مارکیٹ سے باہر نکلے اور دور جا کر اندازہ ہوا کہ ہمارے دو ساتھی پیچھے رہ گئے ہیں۔ ہم رک گئے اور داور صاحب و سلیم اختر کا انتظار کرنے لگے۔ جب دیکھا تو وہ دونوں دور کھڑے ایک لڑکا لڑکی سے باتیں کر رہے ہیں۔ پانچ منٹ گزرے۔۔۔۔شاید پاکستان میں فیوڈل ازم کے خاتمے کے امکانات پر بات ہو رہی ہے۔ دس منٹ گزرے،۔۔۔۔ارے نہیں وہاں تو شاید پوسٹ سوویت عالمی منظر نامے کی نقشہ کشی ہو رہی ہو گی۔۔۔۔ پندرہ منٹ ہو گئے تو یوسفی صاحب کے صبر کا پیمانہ چھلک گیا۔ سردی ہے رات پڑ رہی ہے۔ کھانے پر بھی جانا ہے۔ لہذا قریب جا کر آوازیں دے دے کر انہیں بلا لیا۔ پتہ چلا کہ نہ تو وہ لداخ کو بانٹ رہے تھے، نہ ہی کالا باغ کو بھاشا بنا رہے تھے۔ یہ تو محض حسنِ اخلاق کا کرشمہ تھا۔ وہ لڑکا لڑکی اپنے قریب ترین دوست ملک سے آئے ہوئے مہمان ادیبوں کو مہر اور گرمجوشی سے گھر آنے کی دعوت دے رہے تھے۔ اور پندرہ منٹ تک اصرار ہی کر رہے تھے کہ بس قدم رنجہ فرما ہی دیجئے۔ ہمارے غریب خانے کے بھاگ جاگ جائیں گے۔

ہم بڑے متاثر ہوئے، مگر یوسفی صاحب بڑے قہر آلود تھے۔ پھٹ پڑے:''سلیم اختر صاحب! اگر آپ یورپ میں ہوتے اور ان کے ساتھ اتنی دیر کھڑے رہتے تو آپ اس وقت حوالات میں ہوتے۔ آپ کو پولیس پکڑ کر لے جاتی۔ جناب! وہ مہمان نواز نہ تھی جو آپ کو اسی وقت اپنا گھر دکھانا چاہتی تھی۔۔۔۔ وہ طوائف تھی''۔ سلیم اختر تو کچھ نہ بولے مگر داور صاحب کا منہ اس قدر کھل گیا کہ ریش مبارک نے عملاً ناف تک کا علاقہ سایہ فگن کر ڈالا۔ معلوم نہیں انکا یہ بدلتا حلیہ حیرت کی وجہ سے تھا، یا اپنی کم علمی پہ ''چڑیوں کے کھیت چگ جانے'' پہ غصہ کا اظہار تھا۔ وہ حیران بھی تھے۔ کچھ کچھ لجائے ہوئے اور کہیں کہیں کنجِ چشم پہ کیف آمیز للچاہٹ بھی۔ صوبہ سرحد کے غیرت و عقیدے کے مارے بند سماج سے آئے ہوئے داور صاحب اس پیرانہ سالی میں ''اکیسویں صدی'' اور ''مارکیٹ اکانومی'' میں اتار دیئے گئے تھے۔ سلیم اختر پاکیزگی آمیز بحث کر رہے تھے کہ ''نہیں نہیں، معصوم نوجوان تھے۔ ادب سے وابستگی تھی وغیرہ وغیرہ''۔ وہ یوں صفائیاں پیش کر رہے تھے جیسے کہ پاکستان میں ملّا قاضی حسین احمد کی عدالت میں ہوں۔ میں غصے میں تھا، ان نوجوانوں پر، سلیم و داور پر، چین اور اسکی قیادت پر، اور یوسفی پر تو حد سے زیادہ۔ کہ ایک سوشلسٹ ملک کے اقدار کا انہیں اندازہ ہی نہیں! بزرگانہ احترام کو ملحوظ رکھتے ہوئے ہم نے اپنی بات یوسفی صاحب تک پہنچا دی کہ ہمارے جذبات بہت مجروح ہو رہے ہیں اس لئے کہ وہ سوشلزم کے خلاف کفر بول رہے ہیں۔ یوسفی صاحب نے بات زیادہ نہ بڑھائی۔ لیڈری کے تقاضے ہیں یا ایک جاہل سے مخاطب ہو

کر'' قالوسلاما'' والی دانشمندی تھی۔

برادرم سلیم اختر مخصوص لاہوری اور وہ بھی پرانی گوالمنڈی سٹائل کے آدمی ہیں۔ کھلا ڈلا انداز۔ دل کی بات منہ پر لانے والا، ہنس مکھ، کلین شیو، پنٹ پتلون والا بزرگ۔ وہ پہلے ہی اپنی جوانی کے قصے سنا سنا کر ہمارے رال پٹکا پٹکا کر ہمیں ڈرپ کے تھیلوں کے قابل بنا چکے تھے۔ اب پھر بیجنگ کی لڑکی سارے ''جوانوں'' کو چھوڑ کر ان کا انتخاب کر چکی تھی، تو ان کو ایک نیا موضوع مل گیا اپنی مردانہ وجاہت بیان کرنے کا۔ ہم پھر مارے گئے۔ ایک اور نہ ختم ہونے والا قصہ۔ اور اس قصہ سے جان چھڑانے کی خاطر ہم نے ڈی میلو کا لکھا ہوا ایک قصہ انہیں سنایا:

''ایک شخص رات کو ٹرین کے اوپر والے برتھ میں سفر کر رہا تھا۔ اس کیلئے سونا ناممکن ہو گیا تھا اسلیے کہ نچلے برتھ سے ایک عورت مستقل ماتمی انداز میں کہے جا رہی تھی: '' پیاس لگی ہے ۔۔۔ اوہ خدایا۔ مجھے کس قدر پیاس لگی ہے ۔۔۔'' اسکی یہ ماتمی آوازیں چلتی رہیں۔ بالآخرہ وہ شخص سیڑھی سے نیچے اترا، کاریڈور میں سے چلتا ہوا پانی کا گلاس بھر کر لایا اور فریاد کرتی عورت کو دیدیا:

''خاتون، یہ لیں پانی پئیں''۔

''خدا آپ کا بھلا کرے بھائی، شکریہ''۔

وہ شخص دوبارہ اپنے برتھ پر چڑھا۔ اور اطمینان سے لیٹ گیا۔ وہ میٹھی نیند سو جانے کے قریب تھا کہ نیچے سے پھر فریادیں آئیں:

''اوہ، میں کس قدر پیاسی تھی ۔۔۔!!''

ہمارا خیال تھا کہ سلیم اختر اپنی جوانی کی مہمات مزید نہ سنائیں گے مگر انہیں تو جیسے موقع مل گیا ہو۔ انہیں ہماری نام نہاد ''جوانی'' اور نام نہاد ''پاکیزگی'' پہ ہنسی آ رہی تھی۔ انہوں نے فٹ ڈی میلو کا ایک جوابی قصہ سنایا۔ جو قابل اشاعت نہیں ہے۔

ہم واپس ہوٹل پہنچے۔ خرید ہوا سامان اپنے اپنے کمروں میں رکھا اور تیزی سے کوسٹر میں جا کر بیٹھ گئے۔ اور وہاں سے بہت ساری بھول بھلیوں میں سے ہوتے ہوئے جاوید صاحب کے گھر پہنچے۔ یہ نوجوان آدمی ہیں۔ ہنس مکھ، ملنسار۔ چینیوں کے ساتھ ان کی دوستی ایسی کہ لگے سارا سفارتخانہ وہی چلا رہے ہیں۔ اردو شاعری اتنی یاد کہ ہر نصف فقرے پر پورا شعر انڈیل دیتے ہیں۔ لاابالی، کھلنڈرے اور happy Marry go لگنے کے باوجود نوکری کرنا، اور وہ بھی وزارتِ خارجہ کی نوکری یعنی اسلام آباد کے ماحول والی نوکری کرنا خوب خوب جانتے ہیں۔ جی ہاں، اسلام آباد والی نوکری جہاں صرف اور صرف ''تعلق داری'' کام دیتی ہے۔ پتہ نہیں انگریزی میں اسے کیا کیا نام دیئے جاتے ہوں گے۔

4۔ ایک بہن کی مہمان نوازی

ان کی مہمان نواز بیگم نے مشرقی انداز میں ہمیں سلام کیا۔ خدا انہیں سلامت رکھے۔ ان کے دو بچے فوراً ہی ہم سے گھل مل گئے۔ بچوں کے بارے میں ہمیشہ سے ہمارا یہ دعویٰ رہا ہے کہ پانچ منٹ میں ہم سے شیر وشکر ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کہ وہ تو اپنے وقت پر بڑے ہوتے ہونگے مگر ہم لمحہ لگائے بغیر بچہ بن جاتے ہیں ۔۔۔ اور سچی بات یہ ہے کہ ہم بڑے بنے ہی نہیں ۔۔۔۔ اور سچی بات یہ ہے کہ بننا چاہتے بھی نہیں۔

اسامہ بڑا ہے اور حمزہ چھوٹا ۔۔۔ پنجابی خواہ کتنا ہی لبرل، روشن خیال اور ترقی پسند کیوں نہ ہو عربوں سے باہر نہیں آتا، کرتوت بے شک یورپی کرے مگر دکھاوا، لیبلنگ، Icon بازی، اصلی عربوں ہی کی کریگا، (انہیں خواہ چین ہی کیوں نہ جانا پڑے)۔ ان کا یہی دکھاوا تو بلوچوں کو مار گیا!!۔

یہاں اس دعوت میں بیجنگ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے مسٹر یانگ موجود ہیں۔ ایک اور صاحب ملے جو ریڈیو بیجنگ میں اردو پروگرام کے سربراہ ہیں۔ جی ہاں، وہی ریڈیو بیجنگ اردو پروگرام جو ہم نے کبھی نہ سنا۔ (اور سنیں بھی کیوں؟ اپنی روس دشمنی میں ریڈیو چائنا، ریڈیو پاکستان، ریڈیو طالبان اور ریڈیو زاہدان میں ٹکے کا فرق بھی نہ رہا)۔ یہ صاحب ہمارے دوست ایوب بلوچ کے شناسا نکلے۔ انہوں نے ان کو بہت سارے سلام بھی کہے مگر ہم ایک عرصہ گزر جانے کے باوجود یہ سلام ان تک نہ پہنچا پائے کہ وہ سیکرٹری گیری کو اپنے دونوں ہاتھوں، پیروں، دانتوں سے پکڑے جکڑے ہوئے ہیں۔ سیکریٹریٹ کے سیاہ خانے میں ہمارا جانا زیادہ نہیں ہوتا، روشنی اور آکسیجن میں وہ نہیں نکلتے۔ اس لئے چائنا ریڈیو والے کے سلام تا حال معلق ہی ہیں۔

انہی صاحب نے میر عبداللہ جان جمالدینی کے کتابچے ''بلوچستان میں سرداری نظام'' کا چینی ترجمہ کر رکھا ہے۔ ان کے بقول کب سے یہ کتاب تیار پڑی ہے مگر چھپتی نہیں۔ اس لئے کہ مارکیٹ اکانومی ہے۔ پبلشر بڑا سا منافع بھانپ کر ہی اسے چھاپنے کی حامی بھرے گا۔ سو یہ کتاب بن چھپے پڑی ہے، اور بھی کئی چیزیں، کئی حقائق پڑے ہیں۔ بڑی ترجیح بدل چکی ہو قارئین! تو چھوٹی چھوٹی باتوں پر کیا کڑھنا۔

جاوید نے سفارتخانہ کے اپنے دوستوں کو بھی بلا رکھا ہے، اے پی پی کے نمائندے موجود ہیں۔ ہمارا پانچ کے ٹولے والا وفد اور ہمارے ساتھ جنکشی یو اور مسٹر ہانس ہیں۔ ایک اچھی خاصی رونق لگی ہوئی ہے۔ خوب چینی بولی جا رہی ہے، خوب پنجابی بولی جا رہی ہے۔۔۔۔۔ ہمارے ہاتھ جاوید کے بچے لگے جن سے ہم ''انسانی'' زبان میں باتیں کرتے رہے۔ کبھی کبھی داور اور یوسفی یا پھر میزبانوں میں سے ایک آدھ فقرہ اردو کا آ جاتا۔ مگر جب بچے معصومیت سے سائیکل محفل کے اندر چلائیں، موڑ کاٹیں، گر جائیں، سائیکل کی گھنٹی کی تعریف کریں، اپنے دودھ کے دانت کے ٹوٹنے کو پہلی بار چوہے کی کارستانی کا سن کر حیرت میں پڑیں، اپنی پینٹ کی جیبیں ایک ایک کر کے گنوائیں _____ تو کس کم بخت کو پڑی ہے کہ کاروباری چینی سنے یا اسلام آبادی افسروں کی پوسٹنگ ٹرانسفر کی جگالی والی پنجابی بھگتے۔ بلھے شاہ اور لوہسون تو ایسی محفلوں سے کب کے غائب ہو چکے ہیں۔

بچوں کی کوئی قومیت نہیں ہوتی، رنگ، نسل، عقیدہ، زبان ...... سب سے بالاتر قوم۔ پتہ ہی نہ چلا کہ خاتونِ خانہ نے ''کھانا تیار ہے'' کا ''مادرانہ'' اعلان کر دیا۔ اردو، پنجابی اور بلوچی میں عورت کے لئے جتنی دعائیں موجود ہیں۔ وہ سب میں نے اس کو دینی چاہیں مگر سب دعاؤں میں سے ایک کو بھی ان کے شایانِ شان نہ پا کر دعاؤں کو واپس پاکستان دھتکار دیا۔ میں بولتا بھی تو کیا بولتا۔۔۔۔ ''اللہ تمہارا پردہ کرے۔ سدا سہاگن رہو، نرینہ اولاد سے گھر بھرا رہے۔'' ۔۔ فیوڈل عہد کی بکواسیات۔ جن کی چین کے نیم سوشلسٹ و نیم سرمایہ دارانہ ملک میں کوئی جگہ کوئی گنجائش نہیں۔ (بلوچ ماما۔ تمہارا ذخیرہِ الفاظ تو نئی صدی کے لئے بہت ہی ناکافی ہے!)

ہماری معزز میزبانیہ (گم کرو مذکر مونث کو) نے ہمیں ہمارے وطن کے کھانے کھلائے۔ سمجھو صدی بعد روٹی دیکھ رہے تھے، دال کھا رہے تھے، شامی کباب ہڑپ کر رہے تھے۔ اور اس کے بعد سنگت! ہم نے کڑک چائے پی۔ جی ہاں، اس میں دودھ بھی تھا، چینی بھی تھی۔ ہماری تو عیدالاضحیٰ ہو گئی۔ اس چائے کے لئے تو ترس گئے تھے ہم۔ معلوم نہیں ان کے گھر میں ملازمہ تھی یا سارا کھانا اس مہربان بہن نے خود تیار کیا تھا۔ گھریلو ملازمہ کو چینی زبان میں ''آئی'' کہتے ہیں۔ ہم بلوچ ''آئی'' ماں کو کہتے ہیں۔ (خدا کرے میں آپ کو اس فقرے کی نزاکت سمجھا پاؤں!!)۔

ایک زبردست ''بچوں کی محفل'' سجا کر، ایک ملنسار گھرانے سے مل کر اور ایک بھرپور ضیافت کھانے کے بعد ہم نے جاوید کا، انکی مہمان نوازی، اور شفیق بیگم کا شکریہ ادا کر کے، انہیں تحفے دے کر ان سے اجازت لی۔ ایک بہت ہی اچھی شام ہم نے عوامی جمہوریہ چین میں

بیجنگ کے پاکستانی گھر میں گزاری۔

واپسی پہ کوسٹر موجود نہ تھی۔انھوں نے اسے فارغ کر دیا تھا اسلیے کہ ڈرائیور کا اوور ٹائم بہت زیادہ ہو جاتا جو کہ ٹیکسیوں سے بھی بڑھ چکا ہوتا۔یہاں ڈرائیور کو بھی مکمل انسان سمجھا جاتا ہے۔یہاں کام کے اعتبار سے درجہ بندی تو ہے مگر عزت واحترام کے لحاظ سے کوئی امتیاز نہیں۔آپ اسکی کوسٹر میں داخل ہو جائیں تو وہ آپ کو ''نی ہاؤ'' کہہ کر خوش آمدید کہے گا۔اپنا کام کریگا۔برابر کے ایک انسان کی حیثیت سے وہ محض اپنی ڈیوٹی دے رہا ہوتا ہے۔باقی وہ آپ کے ساتھ ہی کھانا کھائے گا بحث میں حصہ لے گا،شاپنگ کریگا۔وہ آپ کے ساتھ میوزیم گھومے گا۔اور جب آپ اسکی کوسٹر سے اتریں گے تو وہ عزتِ نفس کے ساتھ ''زائے چی یاں''(بلوچی میں ہیر باتے اور انگریزی میں گڈ بائی) کہے گا۔ایک عام برابر کا انسان ۔ہمارے افسروں کی طرح نہیں کہ فیشن کے طور پر بول دیگا:''میرا ڈرائیور باہر ہے اسے چائے بھجوا دیجئے گا''۔

میزبانوں نے ہمارے لئے ٹیکسیاں کر لیں۔مجھے جس ٹیکسی میں بٹھایا گیا اسی میں ہمارے ترجمان بھی بیٹھ گئے۔میں اس وقت بہت خوش ہوا جب بڑی دیر کے بعد ترجمان نے بتایا کہ آپ کی پرزور اصرار پر ہم آپ کو ماؤزے تنگ کے مزار کا علاقہ دکھانے لے جا رہے ہیں۔

5۔ویران شود شہرے کہ میخانہ نہ دارد

حافظؔ

ایک چینی ضرب المثل ہے کہ ''ایک تصویر ہزار الفاظ کے برابر ہوتی ہے، مگر خود وہاں موجود ہونا ہزار تصویروں کے برابر''۔میں نے انقلابِ چین پر بلا مبالغہ لاکھوں الفاظ پڑھ رکھے تھے، ہزاروں تصاویر دیکھ رکھی تھیں۔مگر خود اسے دیکھا نہ تھا ۔آج میں اس انقلاب کے دل، چین کے ریڈ سکوائر یعنی اس چوک پر بہ نفسِ نفیس موجود تھا۔جسے ''تیاں ناں من'' سکوائر کہتے ہیں۔یہ بہت ہی زیادہ وسیع علاقہ تھا۔اس جتنا بڑا چوک میں نے سوچا ہی نہ تھا۔اتنا بڑا اور اتنا وجیہہ سکوائر کہ مری ماما کی ایک بکری تو کیا اس کے تو بکریوں کا پورا ریوڑ گم ہو گیا۔ماوند وادی سے بھی بڑا چوک۔یہ 880 میٹر شمالاً جنوباً اور 500 میٹر شرقاً غرباً ہے۔یعنی اس کا کل رقبہ چار لاکھ چالیس ہزار مربع میٹر ہے۔اس میں دس لاکھ افراد آسکتے ہیں۔بلا شبہ یہ دنیا کا سب سے بڑا سکوائر ہے ۔جس پہ پانچ ستاروں والا سرخ جھنڈا بہت بلندی پہ لہرا رہا ہوتا ہے۔عوامی ہیروؤں کی یادگار وسط میں نمایاں ہے۔گو کہ ریڈ سکوائر ماسکو بھی بہت وسیع وعریض علاقہ ہے جہاں مجھے لینن کی زیارت کا موقع بھی ملا تھا۔مگر تیاں ناں من سکوائر بہت وسیع ہے۔تقدس البتہ دونوں کا اپنا اپنا۔

یہ چوک دراصل بادشاہ کے گیٹ کے سامنے بنایا گیا تھا۔جسے تیاناں من گیٹ کہتے ہیں یعنی: بابِ امنِ آسمانی۔پانچ گیٹوں پر مشتمل اس عمارت میں وسطی بڑی محرابی گیٹ بادشاہ کے لئے ہوا کرتا تھا۔یہ وہی جگہ ہے جہاں ہر سال یکم اکتوبر کو فوجی پریڈ ہوا کرتا ہے۔1949 میں چیرمین ماؤ نے یہیں پر جاگیرداری چین کو عوامی جمہوریہ چین قرار دیا تھا، تین لاکھ افراد کے سامنے۔

چوک کے مغربی کنارے پر عظیم عوامی ہال ہے جس کو ہم نے جگ مگ کرتی روشنیوں میں دیکھا۔اور مشرقی طرف چینی انقلابی تاریخ کا میوزیم ہے۔یہاں پر عظیم لوگوں کی یادگار کھڑی ہے۔یہ ان شہیدوں کی یادگار ہے جنہوں نے چینی عوام کی انقلابی جدوجہد میں اپنی جانیں قربان کر دیں۔گرینائیٹ سے بنے 38 میٹر بلند یادگار کے چہرے پر ماؤزے تنگ کے ہاتھ کی لکھی یہ تحریر ہے: ''عوامی ہیروؤں کو دائمی ستائش''۔

پشت پر چوئن لائی کا پیغام ہے: ''عوامی ہیروؤں کو دائمی ستائش جنہوں نے پچھلی تین دھائیوں کے دوران جنگِ آزادی میں اپنی جانیں نچھاور کردیں۔ عوامی ہیروؤں کو دائمی ستائش جنہوں نے خارجی اور داخلی دشمنوں کے خلاف قومی آزادی اور عوامی حقوق اور مسرت کے لئے 1840 کے بعد سے جدوجہد میں اپنی جانیں نچھاور کردیں''۔ یہیں پر سفید سنگ مرمر کی بہت بڑی آٹھ تراشی ہوئی یادگاریں ہیں جو کہ مندرجہ ذیل انقلابی واقعات کی عکاسی کرتی ہیں:

i۔ 1840 کی جنگِ افیون میں افیون کو جلا دینا

برطانوی سامراج ایک عرصے تک بزورِ قوت بہت بڑی مقدار میں افیون چینی انسانوں پر بیچتا تھا۔ دنیا بھر میں جمہوریت اور انسانی حقوق کی علمبردار نام نہاد پارلیمنٹ نے اس کی منظوری دے رکھی تھی۔ بے شمار معصوم انسان اس لت میں پڑ گئے، ہزاروں خاندان تباہ ہوگئے اور چین کی معیشت لٹ گئی۔ اس کے خلاف ایک عوامی تحریک پھوٹ پڑی جس نے 3 جون سے لے کر 25 جون 1839 تک کے 22 دنوں کے اندر اندر گیارہ لاکھ 85 ہزار کلو گرام افیون تباہ کردی۔ یہ واقعہ چینی عوام کی دشمنی کی علامت بن گیا۔

ii۔ تائی پنگ انقلاب میں جن تیان گاؤں کا ابھار

چین کی تاریخ میں تائی پنگ انقلاب، کسانوں کی سب سے بڑی اور سب سے طویل بغاوت تھی۔ کسانوں کی یہ سامراج دشمن اور جاگیردار مخالف تحریک سب سے پہلے 1851 میں پھوٹی۔ اور دیکھتے دیکھتے چھ صوبوں تک پھیل گئی۔ انقلابیوں نے نان جنگ کو اپنا دارالحکومت بنایا تھا۔

iii۔ دوچنگ بغاوت (1911 کا انقلاب)

1911 میں مانچو بادشاہت کے خلاف فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ دس اکتوبر کی شام کو ہونان اور ہوبائی صوبوں کے گورنروں کے محلات پر دھاوا بول دیا گیا، اور بادشاہی جھنڈا اتار دیا گیا۔ انقلابی فوجوں نے دس اکتوبر 1911 کو چین میں آخری فیوڈل سلطنت کو غرقاب کر دیا۔

iv
۔4 مئی کی تحریک

جاپان کے خلاف یہ سامراج دشمن اور محبِّ وطن تحریک 4 مئی 1919 کو بیجنگ میں پھوٹ پڑی۔ یہ چینی جمہوری انقلاب کا اہم موڑ ثابت ہوئی۔ اس روز بیجنگ کے ہزاروں طالب علموں نے تیاناں من کے سامنے مظاہرہ کیا۔

v۔ 30 مئی کی تحریک

30 مئی 1925 کو شنگھائی کے طلبا اور مزدوروں کی طرف سے نکالے گئے جلوس نے ایک زبردست سامراج دشمن فضا قائم کی۔ ان کے گونجتے نعرے تھے: ''سامراج مردہ باد''۔ ''ژنغانگ کا بدلہ لو جو کہ چینی مزدوروں کا نفیس نمائندہ تھا اور جسے سامراجیوں نے گولی مار

دی تھی"۔

vi۔نان چنگ بغاوت

چیانگ کائی شیک نے 12 اپریل 1927 کو کمیونسٹوں کا قتل عام کیا۔انقلاب کو بچانے اور جدوجہد جاری رکھنے کی خاطر چینی کمیونسٹ پارٹی نے یکم اگست 1927 کو نان چنگ بغاوت میں کومنتانگ پر پہلی گولی چلائی ۔یہی وہ دن تھا جب چینی کمیونسٹ پارٹی نے انقلاب دشمن مسلح افواج کے خلاف انقلابی افواج کی آزادانہ طور پر قیادت شروع کی۔لہٰذا یکم اگست چینی پیپلز لبریشن آرمی کا یوم پیدائش ٹھہرا۔

vii۔جاپان کے خلاف جنگ مزاحمت:

چینی کمیونسٹ پارٹی نے عوامی فوج کو دشمن کے عقب میں جا کر گوریلا جنگ شروع کرنے کی کال دی۔اس گوریلا جنگ نے لوگوں کو شعور دیا اور عوام جنگ جیت گئے۔

viii۔یانگزی دریا کا کامیاب عبور

یہ پورے ملک کو آزاد کرنے کا پیش خیمہ تھا۔دس لاکھ کی تعداد میں فوج نے چیانگ کائی شیک کی حکومت ختم کرنے کے لئے 21 اپریل 1949 کو دریائے یانگسی کو زبردستی عبور کیا۔اور کومنتانگ کے دارالخلافہ نان جنگ پر قبضہ کرلیا جو کہ سارے ملک کی آزادی کا اولین

نکتہ بنا۔

....

چیرمین ماؤ میموریل ہال عوامی ہیروؤں کے مینار کے جنوب میں واقع ہے۔اس دالان میں چیرمین ماؤ کا سنگ مرمر سے تراشا گیا بیٹھا ہوا مجسمہ ہے۔اس کے پیچھے 247 میٹر سوئی کے سرے سے کی گئی پشمینہ گلکاری سے لکھا گیا ہے: "ایسا حسین ہے ہمارا وطن"۔ہم نے بلوچی کی ہجولی زبان فارسی میں یہی کچھ کہا:

خوشا شیراز ووضعِ بے مثال اش
خداوندا نگہدار از زوال اش

حافظؒ

دوسرے کمرے میں ایک بلوریں تابوت میں چیرمین ماؤ کی میت ہے۔جسم پر چینی کمیونسٹ پارٹی کا سرخ پرچم لپیٹا ہوا ہے۔۔۔ابھی مشینی طور پر چیرمین کی میت کو ایک فریزر سے دیدار کے لئے اٹھایا جاتا ہے اور رات کو دوبارہ نیچے کیا جاتا ہے۔

چین اور سوویت یونین انسانی تاریخ میں ایک نئے نظام کے علمبردار ملک رہے ہیں۔اسلئے قدرتی بات ہے کہ بہت سے نئے نئے تجربات یہاں ہوتے رہے ہیں۔بہت ساری کامیابیوں میں ایک آدھ بحث طلب اقدام بھی وہاں رہا ہوگا۔اس لئے جتنی زیادہ پوزیشنیں بدلی گئیں اتنی ہی زیادہ بحث ومباحثے ہوتے رہے۔ایک لفظ "پرسنیلیٹی کلٹ" بہت پھیلا سٹالن اور ماؤ کے دور میں۔اس کا مطلب یہ تھا کہ شخصیت پرستی بہت ہوچکی تھی۔ثقافتی انقلاب کے زمانے میں ماؤ کے فرمودات کی چھوٹی سی "ریڈ بک" کے علاوہ مجسمہ سازی، نعرے بازی اور بت پرستی بڑھتی جارہی تھی۔گوکہ ماؤ نے خود بھی اسے روکنے کی از حد کوششیں کیں مگر یہ بہرحال موجود اور جاری رہا۔ماؤ کے بعد کی قیادت اس حصار سے نکلنا چاہتی ہے۔

اس لئے ماؤ کی زیارت گاہ پر پرستش وغیرہ نہیں کی جاتی۔کوئی سجدہ،کوئی خوردہ،کوئی گھنٹیاں، اورکوئی مراد مانگی نہیں جاتی البتہ اس عظیم انسان کے عالمِ انسان پہ اتنے بڑے احسانات ہیں کہ رہتی دنیا تک ان کا احترام دلوں میں موجود رہیگا۔موجودہ قیادت ایک طرف تو شخصیت پرستی سے باہر نکلنا چاہتی ہے دوسرا وہ ''عوامی جمہوری انقلاب'' کے تاریخی تقاضوں کی برآوری کے لئے صرف اور صرف فیوڈل ازم کی تدفین ہی کو اپنا مدعا بناتے ہوئے دھڑا دھڑ سرمایہ کاری کروا رہی ہے۔اسی لئے رنگ،نعروں،نظریات،نظریاتی بحثوں،اور نظریاتی علامتوں سے کتراتی ہے۔سوشلزم روزمرہ کی گفتگو سے تقریباً تقریباً خارج کر دیا گیا ہے۔وہاں جا کر دیکھا تو بات سمجھ میں آ گئی کہ چینیوں کا طریقہ درست ہے۔مگر دنیا میں لاکھوں کروڑوں انسان ایسے ہیں جنہیں آج کے چین میں ''سب اچھا'' بالکل نہیں لگ رہا۔مشرقی یورپ کی نسبتاً ترقی یافتہ دنیا میں سوشلزم کا رنگ روپ اور طرح کا تھا۔ہم لوگوں نے تو اسے ہی دیکھا تھا اور لہٰذا اسی کا اثر لیے ہوئے تھے۔نیز برصغیر کے فیوڈل پس منظر والا ہمارا اپنا سوشلزم اچھا خاصا لفا ظی آلودہو چلا تھا۔اس لئے چین کے بارے میں ہم بہت کم جان سکے تھے۔اب جب کہ روس کا سرخ لحاف باقی نہ رہا اوراس کے ساتھ ساتھ ہندوستان و کراچی کی بلند بانگ سوشلزم کی اصلیت بھی معلوم ہوگئی۔تو چین کی سمجھ آنے لگی ہے۔ہم اپنی ہر حیرت ڈائری میں لکھتے رہے۔ تاکہ قرض کا علم دوسرے انسانوں میں بانٹ دیا جائے۔اس لئے کہ اس کا شاہین سے شترمرغ بن جانا بہت بڑے سوالیہ نشان پیدا کر چکا ہے۔

ہم ہوٹل پہنچ گئے۔

دن بھر کی سرگرمیوں کی وجہ سے تھکے ہوئے تھے۔ چین میں ''عوامی جمہوریت'' یا سرمایہ دارانہ نظام کے باریک فرق کو مزید باریک دیکھ کر ذہن میں جو الجھن پیدا ہو چلی تھی اب سلجھتی جا رہی تھی۔ ہم نے کپڑے بدلے اور بتیاں بجھا کر لیٹ گئے۔ نیند کوسوں دور تھی، سوچوں کا وسیع میدان تھا اور ہمارا انکھٹو گھوڑا۔۔ ہم اپنے دوست ملک کی بے پناہ ترقی سے بہت زیادہ متاثر تھے اور عوام کے معیار زندگی کی بلندی پہ بہت مطمئن۔۔۔۔

اتنے میں ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ یہ ہمارے وفد میں شامل ایک سینئر ادیب کا فون تھا (وفد میں تھے ہی بزرگ)۔ اس دوست کی عادت تھی کہ رات گئے تک نیچے ہوٹل کے لاؤنج میں لگے ٹیلیفون بوتھ میں کارڈ ڈال کر پاکستان بات کیا کرتے تھے۔ کیں تو ہم نے بھی کئی کالیں مگر کسی ''اور'' کی آواز سن کر بند کر دیا کرتے تھے اور واپسی پہ ''اس'' نے بھروسہ ہی نہ کیا کہ ہم نے بھی کوئی کال کی تھی۔ آج رات بھی وہ دوست پاکستان فون کر کے اپنے کمرے میں پہنچے تھے۔ انہوں نے مجھے فون کر کے بتایا کہ ''میں لاؤنج میں انتظار کر رہا تھا کہ ایک لڑکی نے مجھے آنکھ اور ہاتھ سے اشارے کئے اور کمرے میں آنے کی پیشکش کی''۔ ان کا اصرار تھا کہ میں جا کر اس بات کی خود تصدیق کروں کہ یہاں طوائفیں موجود ہیں۔ میں نے جھٹ سے تجویز پیش کی کہ بزرگوار داور صاحب یا پھر باریش اظہار صاحب میں سے کسی ایک کو بھیج دیا جائے اس لئے کہ ان کی گواہی ہر لحاظ سے معتبر ٹھہرے گی۔ دوسری بات یہ کہ میں عوامی جمہوریہ چین کے بارے میں بالکل بھی غیر جانبدار نہیں ہوں۔ اگر ایسی کوئی بات ہوئی بھی تو میں گواہی میں ڈنڈی مار دونگا۔ بزرگ نے حکم، درخواست اور دیگر بہت سارے جذبات کا آمیزہ بنا کر کہا کہ تم ابھی جاؤ گے اور گاہک بن کر جاؤ گے تا کہ تمہیں یقین آ جائے اور کل صبح دوسرے دوستوں کو بتاؤ گے کہ ''میں'' ٹھیک کہتا تھا کہ سرمایہ داری نظام، سوشلزم کے ساتھ محض مخصوص شعبوں ہی میں Converge نہیں کرے گا بلکہ یہ ایک مکمل پیکج کے ساتھ ہی آتا ہے۔ میں نے احتجاج کیا کہ ''ہمیں آپ کی بات پہ بھروسہ ہے۔ مجھے نئے سرے سے پتلون و ٹائی و کوٹ و

دسواں باب

عبرت، اے آنکھوں والو!

1۔مست ڈیرہ غازیخان میں

جراب و کنگھی سے نہ گزاریئے ۔۔۔۔'' مگر انہوں نے ہمیں اس مطالعاتی مشن پہ روانہ ہونے پر مجبور کر ہی دیا۔ چنانچہ میں دوبارہ سوٹڈ بوٹڈ ہوا اور نیچے چلا گیا۔مگر جانے سے پہلے مست توکلی سے کلا خان بن جانے کے خدشے میں داور صاحب کو جگا لیا،انہیں سمجھا بجھا کر لاؤنج میں کسی دوسری کرسی پہ بیٹھنے پہ آمادہ کیا۔ میں جا کر لاؤنج میں بیٹھا تو دیکھا کہ واقعی خرافات کی حد تک جھلمل کرتے لباس میں ملبوس ایک خاتون بیٹھی ہے جس نے غیر معمولی میک اپ کر رکھا تھا۔جونہی ہماری نظریں ملیں اس نے ٹکا کر مجھے آنکھ والا اشارہ مار دیا۔ہم ہڑ بڑا کر رہ گئے ، ہکا بکا...... ہم مادرِ وطن بلوچستان سے رجوع ہوئے کہ بلوچستان ضامن ہے امام ضامن ہے۔ بلوچستان نے یاد دلایا:

کئے رزاناں چو چاڑدھی ماہاں
گھمراں جنت چوتانہی نوذاں
چھاٹ داث خوشبو آں زروخیناں
عطر ء ہموئیں کتوریاں

ترجمہ:

وہ چودھویں کے چاند کی طرح ابھرتی چلی آتی ہے
دور دراز سے آنے والے بادلوں کی طرح غٹرغوں کرتی ہوئی
مہک بھری کستوری عطر کی
فضا میں خوشبوئیں چھڑکاتی ہوئی

میں نے ایک عدد لاحول پڑھا۔ یا خدا!! میں لیوشاؤچی کے وطن میں کیا دیکھ رہا ہوں ۔ان کسبی عورتوں کو تو ہمارے مرشدوں نے پچاس برس قبل ہی ایک معاشرتی روگ اور مجبوری جان کر شہروں سے نکال دیا تھا اور دور دراز کے قصبوں اور دیہات میں منتشر کر دیا تھا جہاں انہیں ماضی کے ذکر سے شرمندہ کرنے والا کوئی واقف کار موجود نہ تھا۔ان کی نفسیات اور زندگی بھر کی عادات کو دیکھتے ہوئے انہیں ایسے کارخانوں میں لگا دیا گیا تھا جہاں شام سے صبح تک کام ہوتا ہو اور دن میں لوگ آرام کرتے ہوں۔ پھر ان کی تعلیم کا انتظام ہوا۔ رفتہ رفتہ انہوں نے زندگی کے رفیق ڈھونڈ لئے اور یوں وہ معاشرے کی کارآمد اور صحت مند جزو بن گئیں تھیں ۔مگر آج اربنائزیشن نے اس پرانے مرض کو دوبارہ بیجنگ شہر کے نووٹیل ہوٹل میں انڈیل دیا تھا۔

اس کے اشاروں اور کنایوں کے چنگیز خانی حملے جاری تھے۔مگر اس بدبخت بے چاری کو کیا پتہ کہ وہ یہ حملے میرے جذبات میرے نظریات پر کرتی جا رہی تھی۔میں نے اس کی پیشکش کے جواب میں ''ہاں'' میں سر ہلایا تو وہ اپنے بھاری پرس اور قے آور شوخ بھاری لباس کے ساتھ اٹھ کر میرے سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئی ۔ وہ انگریزی کے واحد جملے **Good Sex** کا ورد کرتی جاتی تھی اور اپنے ایک ہاتھ سے اپنے دوسرے بازو کے عضلات کو دبائے جا رہی تھی۔ہم پانچوں پاکستانی اگلے پورے دن اس اشارے کا معمہ حل نہ کر سکے تھے۔

گوں وتی سنہڑائیں سر ء ڈیلا
(گشی) مں تئ آن و تی نہ یاں کسی

ترجمہ:

اپنی حسین وجمیل قامت کے ساتھ
کہتی ہے کہ میں تمہاری ہوں، کسی اور کی نہیں

کافور نما خوشبو کے بھبکے تھے۔ ہونٹوں پہ لیپ دیا گیا لپ سٹک دانتوں کو بھی رنگین کرتا جاتا تھا۔آنکھ سے شروع ہو کر کان تک سرمہ لگایا ہوا۔سر کے بال نفرت آمیز انداز میں سنوارے (بگاڑے) ہوئے ۔۔۔سوشلزم کے سالن میں سرمایہ داری کی مرچیں کس قدر لگتی ہیں۔ باقاعدہ مذاکرات شروع ہوئے ۔ یہاں کیلکو لیٹر تو تھا نہیں، اس شیر کی بچی نے پیشہ ورانہ انداز میں اپنے موبائل کو کیلکو لیٹر کے طور پر استعمال کرنا شروع کر دیا۔اور دو گھنٹے کے

عوض اس نے سکرین پر 500 یوآن لکھ مارے۔ میں نے شہادت کی انگلی بلند کی، یعنی ''سو یو آن دونگا''۔اس نے موبائل پر 400 لکھے۔ میری وہی ایک انگلی فضا میں بلند ہوئی۔ اب کے اس نے 300 لکھے۔ میں اڑا رہا اور بالآخر 200 یوآن لکھ کر اس نے گویا بات ختم کی۔ اس نے میرے کمرے میں چلنے کو کہا تو میں نے روح القدس کو دل میں اترتے دیکھا اور یہ سنہرے الفاظ اس کے منہ پہ دے مارے:

یار ہواں ہنت کہ جائیذ ایاراں
سو مری چیار روشی نہ پاداراں
گپتغاں کیفاں شرخمار یناں
سمل ءِ سچی آں دود یمیناں
کنچری آنی چیار شفی ذونکاں
دیرو ءِ گند ءَ عادتیں رناں
سمل ءِ عہداواں نہ بھوریناں

ترجمہ: یار تو وہی جو، ابدی یار ہوں
حسینائیں (پیشہ ور) تو چار دن بھی وفادار نہیں رہتیں
مجھے خمار آلود نشے نے مدہوش کر دیا
سمو کی دو طرفی آگ (یاد) سے سجی ہو چکا ہوں۔
رنڈیوں کی چار راتوں کی عیاشی کے لئے،
شہر کی بدعادت عورتوں کے لئے
میں سمو کے ساتھ کئے گئے عہد نہیں توڑونگا

میں نے اپنے معزز مہمان ہونے اور ہوٹل انتظامیہ کی نگاہوں میں آنے کا خدشہ جتایا۔ اس نے انگریزی میں **Hotel No problem** کہا۔ ہر لفظ کے آخر میں **y** کا اضافہ کر کے گویا تسلی دی کہ یہ تو پوری کڑی ہے، کاروبار ہے، کیا ہوٹل کیا پولیس!!! اس کا اصرار تھا کہ میں کمرہ نمبر بتاؤں وہ خود چلی آئے گی۔ میں نے بہت ڈر اور خوف کا اظہار کیا۔ اور کہا کہ اچھا، میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر جاؤنگا۔ مجھے اندازہ کرنا تھا کہ صرف ہوٹل ہی کیوں، سرمایہ داری نظام یہ دھندہ بہت متبادل طریقوں سے کرواتا ہوگا۔ وہ فوراً مان گئی مگر معاوضہ 500 یوآن اور ٹیکسی کا کرایہ میرے ذمے ڈال کر۔۔۔ اب فرار کا راستہ کیا تھا؟ تھا، جی۔ جب ''دیم درنگ پذ لشکر'' (آگے پہاڑ پیچھے لشکر) والی صورتحال ہو تب بھی تو سخی نوذ بندغ کی گھوڑی چاکر کو دشمن کے لشکر سے صاف بچا کر لے جا سکتی ہے۔ عقل، ہمیں بچانے فوراً حاضر ہو گئی اور میں نے اسے پانچ منٹ انتظار کرنے کو کہا کہ کپڑے بدل کر آتا ہوں۔ اس نے کمرہ نمبر بتانے پر اصرار کیا مگر ہم اقبال کے شاہین سے بھی زیادہ پھرتی سے اٹھے اور کمرہ نمبر والا سٹیٹ سیکرٹ بتائے بغیر ڈگ بھرتے لفٹ کی طرف لپکے، پیپلز پارٹی کے انتخابی نشان تیر کی رفتار سے لفٹ میں داخل ہوئے اور جو بھی بٹن ہاتھ آیا دبا دیا۔

قارئین! آپ تو اکیسویں صدی کے توہمات میں غلطاں ہیں۔ مگر کبھی اس طرح کی پارسائی کر کے لفٹ میں داخل ہو جائیں تو بیجنگ جیسے شہر میں بھی لفٹ کے اندر بیک گراؤنڈ موسیقی میں ''بڑا'' آدمی اپنا کلام اپنی آواز میں آپ کے لئے گنگنائے گا:

آف داں سالے ءَ شریخ بیشہ
ہر دوئیں کوراں ہاروہیر بیشہ
مارءَ شا ہ ءَ ژہ آف رواں کشتہ
جند ژہ عیواں بے میار بیشہ

ترجمہ:

پورے ایک سال تک پانی شریک رہا
دونوں سیلابی دریاؤں کا سیلاب مل چکا ہے

البتہ مجھے شاہ (حضرت علی) نے سیلاب بردگی سے کھینچ نکالا
اور میں عیب و برائی سے بچ نکلا
اور جناب عالی اس طرح:

مس وثی قولاں عومری سچیار بیثغاں
بیثغاں سچیار چو جھانی ءَ دیثغاں

ترجمہ:

میں اپنے قول میں سچا نکلا جس طرح اومری سچا نکلا تھا
سچا نکلا اور دنیا نے دیکھ لیا۔
ویسے اے اشرف المخلوقات! کیا یہ سچ نہیں ہے کہ:
ڈھور پہ ریزءَ مڑد پہ قولان ءَ اڑی
(بیلوں ہی کو رسی سے باندھ دیا جاتا ہے مگر انسان کی رسی تو قول ہے، عہد ہے، اقرار ہے)۔
ارے بھولے، تو نیکی کر تو سہی!

دماغ میں غصہ کی فلک شگاف سیٹیاں بج رہی تھیں، کچھ خبر نہیں کہ کب اور کس طرح دبک کر کمرے میں گھسا۔ دروازہ لاک کیا اور اپنے پاکستانی سینئر ساتھی کو فون کر کے ساری بپتا سناڈالی۔ جیسے محاسب سی آر اسلم ہوں۔ جیسے ڈسپلن کمیونسٹ پارٹی کی ہو۔ مگر اگلے نے تو قہقہہ لگایا "سو جایئے۔ کل سارے دوستوں کو سنا دیجئے۔ آج آپ کو بہت اچھی نیند آئے گی"۔

نیند خاک آنی تھی۔ ہم مشرق والے لوگ سوشلزم کو بھی عقیدت کے بطور برتتے ہیں۔ ہم جیسے ایمان بالغیب والوں کو ایسا ملاوٹی سوشلزم دیکھنے کو ملے تو سب کچھ اتھل پتھل ہو جاتا ہے۔۔۔ گورکی سے لے کر کرشن چندر تک، اور شولوخوف سے لے کر ترہ کی تک ساری تحریریں، سارے کیریکٹر اور ڈائی سن کارٹر کی کتاب "گناہ اور سائنس" کا ایک ایک لفظ ساری رات ہمارے مغز کے چپس پہ تلملاتے رہے۔ نیند کیا آنی تھی۔

اگر اندھیرا اگلنے لگے چراغ کی لو
ہوا چراغ بجھانے میں حق بجانب ہے

اس محترمہ سے جھوٹ بولنے اور جھوٹا وعدہ کرنے کی، اشرف المخلوقاتی معافی چاہتا ہوں۔۔۔ وہ کوئی خاص بدصورت بھی نہ تھی۔

جب چور تجوری کا دروازہ توڑنے والا تھا تو اس نے دیکھا کہ تجوری کے دروازے پر یہ لکھا تھا:

"براہ کرم ڈائنامائیٹ استعمال نہ کریں۔ یہ تجوری لاک نہیں ہے۔ صرف ہینڈل گھمایئے"

جونہی اس نے ہینڈل گھمایا، ایک ریت کی بوری اس پر گری، پورا کمرہ روشن ہوا اور سائرن کی آوازوں سے سارا پڑوس جاگ گیا۔

دانا شخص جب جیل میں اس سے ملنے گیا تو وہ شخص بہت غصے میں تھا:
"اب میں کسی اور انسان پہ دوبارہ کیا اعتبار کر سکوں گا؟"

2۔ کمپیوٹر زنانہ آواز میں

رات کو ہم نے ہوٹل انتظامیہ کو صبح چھ بجے جگانے کا کہہ دیا۔ میں نے تو اس قدر تیز رفتاری سے دکھائے گئے عجائبات کے لئے نوٹس کو اور خود اپنے ذہن سے ان کی یادوں کو اکٹھا کرنے، ترتیب دینے اور کاغذ پر منتقل کرنے میں رات کے چار بجا دیئے۔ صبح فون کی گھنٹی بجی دس پندرہ سیکنڈ کے وقفوں سے دوبار **Wake Up Call** کیلئے بجی۔ ہمیں جاگنا ہی تھا جاگ گئے۔ مگر بعد میں داور صاحب نے اپنی بزرگانہ ٹھہری ہوئی پشتو میں بتایا کہ "مجھے تو پتہ نہ

چلا کہ کون ہے۔فون پہ بولتی ہوئی لڑکی کو میں ''او کے، او کے'' ہی کہتا رہا ہوں۔لیکن پھر پتہ چلا کہ وہ تو کمپیوٹر کی آواز تھی''۔ پتہ نہیں کمپیوٹر داور صاحب جیسے انسانوں کے کن کن '' Ok Ok'' والے اتاہ اور نازک جذبات کو مسلتا رہے گا!!

اگلے دن فراغت کی صبح تھی۔اس لئے کہ اس دن ژنگ ژو کے لئے ڈھائی بجے کی پرواز تھی۔لہذا ہم نے اس صبح کو بہت اچھی جگہ استعمال کیا۔ہم کتابوں کی دکان پر گئے۔ کتابوں کی شاپنگ تو راحت بھرا کام ہوتا ہے۔دکان خواہ کتنی عامیانہ کیوں نہ ہو اس کی طرف جاتے ہوئے قدم خود بخود تیز ہو جاتے ہیں۔بڑی ظالم کشش ہوتی ہے کتاب کی دکان کی۔ہم نے ہوٹل سے کچھ ہی فاصلے پر مشہور عالم کتاب گھر۔فارن لینگویج پریس بیجنگ کا رخ کیا۔اس ادارے کی کتابیں ہم پاکستان میں پڑھتے چلے آئے تھے۔یہ تین منزلہ دکان ہے۔نیچے کے کمرے میں کتابیں ہیں، دوسری منزل والا کمرہ میوزک کی کیسٹوں کا ہے اور اسکے اوپر بچوں کی نصابی کتابیں، سکول بیگ، جیومیٹری بکس وغیرہ ہیں۔یہ کوئی بہت بڑی دکان بالکل نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی غیر معمولی ذخیرہ ہے یہاں پر۔بس ہمارے کوئٹہ کی کسی بھی بڑی ''کتابوں کی دکان'' جتنی ہے۔بین الاقوامی شہرت کی حامل اس دکان میں چینی ادب کی تاریخ پر کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔اس میں چینی کیمونسٹ پارٹی کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ماؤزے تنگ کی منتخب تصانیف اس طرح ایک کونے میں داب کر رکھی ہوئی ہیں، جیسے دکان کے ملازموں کو ان پہ شرمندگی ہو۔ادھر ہماری جہالت کا یہ عالم کہ ہم نے ماؤ، چو این لائی، مارشل چوتیہ۔لیو شاؤ چی اور لوہسون کے علاوہ چین کے کسی شخص، کسی لکھاری کا نام تک نہیں سنا تھا۔اس دکان کی سروس بھی اچھی نہیں ہے۔سو، اندھے کی لاٹھی کی طرح اندازہ کر کر کے میں نے پورے گھنٹے میں انگریزی میں محض دو کتابیں خرید لیں۔چینی لوگ اپنی کتابوں کے انگریزی ترجمے بہت دلچسپ انداز میں کرتے ہیں۔بظاہر آپ بہت موٹی کتاب خرید رہے ہیں مگر اس میں تحریر صرف آدھی کتاب پر موجود ہوگی۔یہ لوگ ایک صفحہ انگریزی ترجمہ لکھتے ہیں اور اس کے سامنے والے صفحے پر اس کا اصل چینی متن بھی چھاپ دیتے ہیں۔وہ تو اپنے نوجوانوں کو انگلش سکھانے کے لئے ایسا کرتے ہیں مگر ہمیں تو کتاب کی قیمت بھی ڈبل ادا کرنی پڑ رہی تھی اور اس کا حجم و وزن بھی ڈبل اٹھانا تھا۔اسلیے کہ ہمیں یہ کتابیں اپنے سوٹ کیس میں ڈالنی تھیں۔ ابھی پورے چین میں گھمانی تھیں اور واپس پاکستان لے جانی تھیں چین کے ''سوشلزم ودھ چائنیز خصوصیات'' کی طرح یہاں کی ''پبلشنگ بھی ودھ چائنیز خصوصیات'' کی ہے۔اور چین سے بغیر کتاب کے وطن چلے جانا بغیر جراب کے بوٹ پہننے کے مترادف بات تھی۔

ہم کتابوں کی خریداری کی پیاس نہ بجھنے کی وجہ سے جلے بھنے ہوئے تھے اور ایک بیزار نوجوان کی نابینا رہنمائی میں ''کسی'' کی فرمائش کی تعمیل میں چینی کلاسیکل موسیقی کی دو کیسٹیں لے لیں۔اور حیران کن بات یہ ہے کہ یہ بہت اچھی کیسٹیں نکلیں۔ان کی کاپی بنوا کے ہم نے دیگر دوستوں کو بھی تحفتاً دے دیں۔جنہیں سب نے پسند کیا۔کوئٹہ کے مشہور واحد چائنیز ہوٹل کو بھی ایک ایک کیسٹ بطور عطیہ دیدیا۔

3۔سجی خورے کو سجی ملتی ہے

ایغوروں کے ہوٹل میں پھر 23 ڈشوں پر مشتمل دوپہر کا کھانا کھایا۔۔سجی سمیت ۔کھانا آتا گیا۔ڈش پہ ڈش۔کوئی سبزی لگتی تھی مگر پوچھنے پر گوشت نکلتا۔کوئی لگتی تو کھمبی تھی مگر نکلتی مرغ تھی۔تفصیلات کو لات مارو، بس کھاؤ، ہر منٹ دو منٹ کے بعد ایک نئی ڈش آ جاتی تھی ۔حرام ہے، اگر ہم نے ایک ڈش بھی پہچانی ہو سوائے سجی کے۔اردو والوں کا ''شکر خورہ''، ہم نے دیکھا نہیں۔معلوم نہیں یہ شکر پسند کرنے والا عام آدمی ہے یا پھر کسی جانور کا نام؟ مگر ہم سجی خوروں کو سجی ملی۔۔لگا تار تین دن تک۔اور وہ بھی دلبر بلوچستان میں نہیں، دور دیس عوامی چین

میں۔ ''اپنے اپنے نصیب کا بات ہے ڑے!!''۔ ہم وطن میں بہت زیادہ سجی نہیں کھاتے۔ مگر یہاں پردیس میں وطن کی کشش تھی یا کوئی اور بات تھی۔ کہ یہاں تو ہم کسی پہاڑی مری قبائلی کی طرح چھری کانٹا بھول کر سجی کھانے کے آداب کے عین مطابق ہاتھوں سے توڑتے۔ سب کے لئے ٹکڑے الگ الگ کرتے اور ہاتھوں سے اسے کھاتے۔ چینی میزبانوں نے بھی جب اصل رسمِ سجی خوری دیکھی تو انہوں نے بھی یورپ کا دکھاوا چھوڑ کر، اپنے اپنے چاپ اسٹک پرے رکھ کر ہاتھوں سے سجی کھانی شروع کر دی۔ سچی بات یہ ہے کہ سجی کھاتے ہوئے جب انگلیاں چرب نہ ہو جائیں تو پھر کھانے کا لطف ہی کیا ہے۔ کھانے کی میز پر خاموشی، گردن اکڑائی، باادب باملاحظہ پن، مردہ پن کی انتہا ہے۔۔۔ مگر کھانے کے ساتھ جنگِ عظیم برپا کرنا دوسری انتہا ہے!!

ہم ڈیڑھ گھنٹے تک کھانا کھاتے رہے۔ اندازہ کیجئے ڈیڑھ گھنٹے تک کھاتے رہنا۔ ہمارے بلوچستان میں تو صدیوں پرانے رواج کے آرٹیکل نمبر NIL میں حکم ہے کہ'' کھانا اتنی تیزی سے کھانا چاہیے کہ آپ کو کوئی کھانا کھاتا ہوا نہ دیکھ پائے''۔ ہم نے غور کیا تو عقدہ کھلا کہ کھانے کے آداب ہی تو کسی ملک کے پیداواری رشتوں کا پتہ بتا دیتے ہیں۔ خانہ بدوشی کی زندگانی ہو، قبائلی جنگوں والا سماج ہو تو وہاں تو ہر کام جلد از جلد سرانجام دینا ہوتا ہے، بشمول کھانا کھانے کے۔ اور اگر خیر خیریت والا Setteled سماج ہو تو پھر کھانے کیلئے آرام سے بیٹھو، گپ شپ بھی کرتے رہو اور خوراک کا مزہ بھی لیتے رہو۔ آج کی دنیا خواہ جتنی تیز رفتار ہو، آپ کو خواہ جتنا ضروری کام درپیش ہو، کھانے کا وقفہ ہر جگہ باقاعدہ رکھا جاتا ہے۔ کانفرنسیں، سیمینار یں، اسمبلی سیشن الغرض ہر کارروائی کھانے کے وقفہ کے مطابق ترتیب دی جاتی ہے۔

ہم کھاتے رہے، ہنسی مذاق کرتے رہے۔ چینی بلوچی اور اردو کہاوتیں سنتے گئے۔

اور بالآخر ائیر پورٹ کے لئے روانہ ہو گئے۔

4۔ تلاش، تلاشی

بیجنگ ائیر پورٹ بذاتِ خود ایک شہر ہے۔ چلتے ہی جاؤ۔ حدِ نظر تک ایک ہی بلڈنگ چلی جاتی ہے۔ ہزاروں لوگ آ رہے ہیں جا رہے ہیں۔ اژدہام ہے انسانوں کا۔ میں حیران ہوا کہ لوگوں کے پاس کتنا پیسا ہے۔ اچھے لباس ہیں۔ اچھی وضع قطع ہے، یہ لوگ مہذب ہیں، حسین ہیں، اور بالخصوص حسنِ مطلق نے حسن کے ارادے سے جو مخلوق بنائی یعنی عورت، وہ تو بہت ہی جمیل بہت ہی خوبصورت ہے چین کی۔ اور عمومی خوبصورتی کے لئے روزگار، تفریح، روٹی، تخلیق اور سرگرمی کے سارے خانوں کا بھرا ہونا لازمی ہوتا ہے۔۔۔۔ چین کے سوشلزم نے یہ سارے خانے پر کر رکھے ہیں۔

ہم چلتے چلتے، گھسٹتے گھسٹتے بالآخر اندر پہنچے۔ فارمیلیٹیز گو کہ بہت زیادہ ہیں مگر پاکستان جیسی نہیں ہیں۔ یہاں پھنے خانی بالکل بھی نہیں ہے۔ اختیار کے استعمال میں خدا کی پناہ مانگنے کی حد تک تجاوز نہیں ہے۔ میزوں کے نیچے نوٹوں کا لین دین نہیں ہے۔ او۔ کے، کی ہوئی سیٹ اچانک کسی وزیر و سیکرٹری کے حوالے نہیں ہوتی۔ آپ صاف رہو۔ ان کا عملہ صاف رہتا ہے۔

ہمارے داور صاحب کے ایک صاحبزادے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ وہ میڈیکل کے فائنل ائیر میں پڑھتے ہیں۔ جبکہ دوسرا بیٹا پڑھائی میں کمزور ہونے کے سبب ہومیو پیتھی والے کسی حکیم صاحب کا نوکر ہو گیا۔ اب داور صاحب بادشاہ آدمی ہیں۔ اپنی پروفیسری، جہاندیدگی، ادبِ عالیہ کے لاکھوں الفاظ کی خواندگی پر ایوارڈیں، اور پھر پیرانہ سالی تک پہنچتے پہنچتے تجربات کے انبار کا مالک ہونے کے باوجود ہاضمے کی دوائی ڈاکٹر بیٹے سے نہیں لیتے۔ بلکہ حکیم کے ہاں ملازم بیٹے سے لیتے ہیں اور نہ صرف پاکستان میں یہی دوائی استعمال

کرتے ہیں بلکہ اپنے بیگ میں ڈالتے ہیں اور وہی بیگ چین تک اٹھاتے پھرتے ہیں۔اب اگر ائیر پورٹ پر ایک نو دس انچ لمبی سفید داڑھی رکھے ہوئے سخت سردی میں محض ایک واسکٹ شلوار قمیض پہنے، اوپر سے ایک چترالی ٹوپی اوڑھے کسی شخص کے بیگ میں سفید رنگ کے گاڑھے محلول کی شیشی ملے تو چین کے یہ پاک لوگ اسے بھلا کیا نام دیں گے۔القاعدہ کا دور دورہ ہے، دہشت زدگی ہے دنیا بھر کے ائیر پورٹوں پر۔اس پر طرہ یہ کہ دوار صاحب کے بیگ سے ایک اور شیشی بھی نکلی۔اور اس میں کوئی اور رنگ و بو کا محلول بھرا ہوا تھا۔یہ سر پر لگانے والا پشاوری تیل تھا۔چنانچہ جائز طور پر ائیر پورٹ میں کھلبلی مچ گئی۔ہمارے چینی میزبان مشکوک چیزیں دیکھ کر اس قدر گھبرا گئے کہ دور جا کر کھڑے ہو گئے۔ائیر پورٹ والے لوگ انگلش نہیں جانتے، ہمیں چینی نہیں آتی۔ایک سراسیمگی پیدا ہو گئی۔بالآخر داور صاحب کو ہاضمے کی دوائی پی کر بتانی پڑی کہ یہ تیر بہ حدف نسخہ حکیم صاحب کے ملازم نے دیا ہے اور اس شیشی کا تیل کی بوتل سے کوئی تعلق نہیں ہے۔مگر اب چینی سپاہی چاہتے تھے کہ وہ دوسری بوتل بھی پی کر دکھا دیں۔مگر یہ ممکن نہ تھا اس لئے کہ اس تیل میں زیرہ سونف، کڑوے بادام، لونگ سب کچھ ملا ہوا تھا۔تب جناب! انہوں نے اس بوتل سے ہتھیلی پر تیل ڈال کر گاؤں کے حجرے کے پاک انسان کی طرح اپنی ریش مبارک پر لگایا۔سفید اجلی داڑھی چمکنے لگی تو کنفیوشس کی قوم کو کچھ کچھ اعتبار آنے لگا۔مگر وہ اگلے دس پندرہ منٹ تک دزدیدہ نگاہوں سے داور صاحب کا پیچھا کرتے رہے کہ جو محلول انہوں نے پی ڈالا تھا کہیں خودکش زہر تو نہ تھا۔۔

سبق: کم از کم آپ بیرون ملک سفر کریں تو حکیم کی دوائی اور سرسوں کا تیل ساتھ نہ لے جائیں۔

چین میں ائیر پورٹوں پہ تلاشی کے اپنے طریقے ہیں۔یہ لوگ آپ کے سامنے پلاسٹک کی بڑی تھال رکھ دیتے ہیں۔آپ چابی، کیمرہ، موبائل فون وغیرہ اس تھال پر رکھ دیں۔اور کوٹ بھی اتار کر اس پر رکھ دیں۔وہ اس کی الگ سے چیکنگ کریں گے۔اس دوران آپ جسمانی تلاشی والی مشین سے گزریں تو وہ تھال بمع اشیاء کے آپ کو وہیں مل جائے گی۔مگر اس کے باوجود تلاشی تو تلاشی ہوتی ہے۔یہ نفسیاتی طور پر اذیت ناک عمل ہوتا ہے۔اظہار الحق نے اس ساری روحانی تکلیف دہ صورتحال بھگتتے ہوئے زور زور سے کہنا شروع کر دیا۔"جس کسی نے نائن الیون والی واردات کروائی وہ بہت بدنصیب ہے کہ اس کی وجہ سے روزانہ لاکھوں لوگ دنیا بھر کے ائیر پورٹوں، ریلوے سٹیشنوں اور بس اڈوں پر اذیت ناک تلاشیوں میں سے گزرتے ہیں"۔

بیجنگ میں سردی تو ہمارے کوئٹہ جتنی پڑ رہی تھی مگر یاروں نے اوور کوٹ ایسے موٹے اور ایسے لمبے پہن رکھے تھے کہ گویا سائبریا جا رہے ہوں۔فضا میں البتہ دھند بہت تھی۔اور اگر یہ پاکستان ہوتا، اور پی آئی اے ہوتا اور بالخصوص تربت یا گوادر ہوتا تو جہاز موسم کی خرابی کا بہانا بنا کر روانگی کب کی کینسل کر چکا ہوتا۔مگر خدا جب دیتا ہے تو کچھ دیکھ کر دیتا ہے۔لہٰذا" چائنا ساؤدرن ائیر لائن" کا بوئنگ جہاز اس گہری دھند اور بہت کثیف کہر میں بھی روانگی کے لئے تیار ہو گیا۔چین میں ہر صوبے کی، اور بعض اوقات بعض شہروں کی اپنی ائیر لائنیں ہیں۔

کیا ائیر ہوسٹسیں ہیں۔بظاہر پستہ قد اور پتلی سی ہیں مگر ان چینی لڑکیوں میں اس قدر خوبصورتی ہے کہ عقل دنگ رہ جائے۔آپ انار دانے کی چمک بھول جائیں، میں لال کی لالی بھول جاؤنگا۔گلاب کی پنکھڑی، کاغذی باریک لب، والے سارے الفاظ خدا کی قسم بے معنی ہو جاتے ہیں۔نور، عرش کا نور، پری قاف کی پری، کبوتری قلندر کے دربار کی کبوتری۔

راستے میں ان لوگوں نے نہ کچھ کھلایا نہ پلایا۔بغیر چینی والی واہیات چائے، منگ پھلی جیسی چیز کا بیس دانوں پہ مشتمل پیکٹ۔اور بس۔ان سے تو ہمارے فوکر جہاز کی سروس اچھی ہے۔ائیر ہوسٹس نکالو تو سریاب کی لوکل بس لگے ان کا جہاز۔اور جہاز خود تو بنا نہیں سکتے۔وہی جہاں سے ہم پی آئی اے والے خریدتے ہیں بالکل وہی ہیں ان کے پاس۔اور ہمارے تو چونکہ قد بڑے ہیں اور ہم چونکہ موٹے ہیں اس لئے جہاز میں سیٹیں کم رکھتے ہیں۔انہوں

نے اپنے قد اور متوازن اجسام کی مطابقت میں سیٹیں زیادہ ڈالی ہیں۔ یہ بے ذائقہ، بے رنگ
، بے بو، بے وزن، بے حجم چائے کا کپ وہ ہر چکر پر دوبارہ بھرتی جاتی تھی۔ ہم بھی ہر چکر پر جی
بھر کے اسے دیکھتے رہے۔۔۔ بہت عرصے کیلئے چلی گئی تو چائے پر لعنت بھیج کر سو گئے۔

اسی سوتے جاگتے میں ہم ژینگ ژو کے فضائی علاقے میں داخل ہو گئے۔ یہاں موسم بہت ہی ابر آلود تھا۔ علاقہ بہت سرسبز لگ رہا تھا۔ کھیت تھے، کسان تھے، زرعی آلات تھے، اندازہ ہوا کہ اچھا خاصا زرعی صوبہ ہے، ہینان۔ جہاز اترا تو صوبائی ادیبوں کے ڈپٹی چیئر مین آئے۔ اور ایک بہت ہی چھوٹی سی گڑیا جیسی خاتون آئیں۔۔۔ بہت مسکراتی خاتون، مسکراہٹ کے ساتھ ساتھ ہلکی، بہت ہلکی چھوٹی نقرئی قہقہے کی آواز بھی نکالتیں۔۔۔۔ جیسے بلبل بولے، جیسے تیتر بولے، جیسے چکور بولے، جیسے ڈیڑھ سال کا بچہ ہنسے، جیسے حسینہ ہنسے۔ جیسے محبوبہ ہنسے۔ ان کا نام ''میاؤ'' تھا اور انگریزی نام Emma۔۔۔ اگلے دو دن تک اس کے شیریں سنہرے میوزیکل چھوٹے سے بے ساختہ قہقہوں کے سائے میں ہمیں ستانا تھا اور پھر تا ابد اِس Giggle کا نایاب ثانی تلاش کرتے رہنا تھا۔ میں نے خود سے باہر جھانکا تو دیکھا کہ بوڑھے بوڑھے ہم سفر بھی اس کی ہنسی پر اونٹ کی طرح سات جگہ سے ذبح ہونے کو تیار تھے۔ ان میں سے کسی نے بھی اس کو میرے دیئے ہوئے اس لقب کی تردید نہیں کی ''The Smile Queen''۔ مونا لیزا کی تعریفیں کرنے والو! وہ کیا تھی؟ نخرے والی!! ذرا سی مسکراہٹ، کنجوس کہیں کی۔ ہماری میاؤ کی ایک زندہ ہنسی پہ تمہاری زندگی بھر کی ساکن مسکراہٹیں قربان۔ ارے سنگت ہم یہاں بھی دل کا بٹوہ گما بیٹھے۔ اور اگر آپ اسے مبالغہ سمجھ رہے ہیں تو اللہ آپ سے پوچھے، اگر میں بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا ہوں تو مجھے!!

گیارہواں باب

چینی تاریخ میں ایک اور ڈبکی

1۔چین کا پٹ فیڈر

ژینگ ژو شہر، آبادی کے لحاظ سے عوامی جمہوریہ چین کے سب سے بڑے صوبے ہینان کا دارالحکومت ہے۔اس وسطی صوبے کی آبادی نوے ملین ہے۔شہر ژینگ ژو تین ہزار برس کی تاریخ کا مالک ہے۔یہیں 7 فروری کے مزدوروں کی بغاوت کی یادگار قائم ہے۔اسی شہر، کے مضافات میں ڈینگ فینگ نامی شہر،شاؤلین ٹمپل کے لئے مشہور ہے اوراسی دیس میں Yellow River بہتی ہے(گنگا جس کے سامنے شیر خوار بچہ لگتی ہے)۔

ہماری میزبانی کا پورا چارج صوبہ ہیناں کے رائٹرز ایسوسی ایشن کے دوستوں نے سنبھال لیا تھا۔جنکشی یو بالکل فضل الٰہی چودھری کی طرح کا بے اختیار صدر(میزبان)بن گیا تھا۔وہ، یک دم وی آئی پی سے عام آدمی بن چکا تھا۔۔۔۔ترجمان ہانس سے بھی زیادہ بے قدر کہ اُسے کم ازکم ترجمانی تو آتی تھی۔جنکشی یو بولتا بہت تھا، بور کرنے کی حد تک۔مگر ہمیں اس کا زیادہ بولنا اچھا لگا۔اسلئے نہیں کہ اس کی آواز بہت مدھر تھی یا اس کی علمیت کو ہم سمجھ پا رہے تھے۔بلکہ صرف اس لئے کہ میاؤ اس کے ساتھ بولتے بولتے اپنی جھنکار والی ہنسی ہنس جاتی تھی۔ایسی میٹھی ہنسی ہم نے پورے سندھ وہند میں نہ سنی تھی۔سچی بات یہ ہے کہ کوسٹر میں سے ہماری نظریں بے شک اردگرد کے نظاروں میں منہمک ہوں،اور ہمارے ذہن بے شک شہ مرید کے دیس میں مندو کی ناقابلِ حصول دختر کے خیالات میں مگن ہوں،مگر کان جنکشی یو کی کھردری باتوں کے بیچ بیچ میں میاؤ کی میٹھی ہنسی کی طرف انٹینا بنے کھڑے تھے۔اسی لئے تو ہمارا فتویٰ ہے کہ بے شک ہمارا بقیہ جسم کہیں اور ہو،مگر ہمارے کان بن پوچھ گچھ کے بہشتی ہیں، ڈاکٹر سلیم اختر کے کان بھی!! جنکشی یو نے میزبانی کا پورٹ فولیو چھن جانے کے بعد کتنا اچھا کام سنبھال لیا تھا۔ملاّ اگر جل بھن نہ جاؤ تو اسے بھی ساتھ لے جاؤں، بہشت؟۔

یہ شہر بھی ائیر پورٹ سے بہت دور تھا۔شام کا وقت تھا، رم جھم ہو رہی تھی۔وسیع ہشت رویہ سڑک تھی، جی ہاں۔آٹھ رویہ سڑک۔اس کے آس پاس دور دور تک لہلہاتے کھیت تھے۔ایک منظّم، باضابطہ اور قائدے والا شہر۔۔۔سوشلزم کی پہچان والا شہر!۔ہم گھنٹہ بھر سڑک

کے مزے لیتے رہے، ترقی کا نظارہ کرتے رہے، متاثر ہوتے رہے۔۔۔۔اور بالآخر ''دی گریٹ وال'' نامی ایک بہت بڑے ہوٹل پہنچا دیے گئے۔

اور یہاں، ہوٹل کے کاؤنٹر پر شراب کے نشے میں دھت اولین چینی سے ہماری ملاقات ہوگئی۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا، زور زور سے باتیں کر رہا تھا۔ بالکل ہمارے پاکستانی شرابیوں کی طرح۔ دنیا بھر کے شرابی ایک ہی طرح سے دھت ہوتے ہیں۔اس شرابی نے ہمارے بارے میں جان کر بلاساختہ اور فی البدیہہ انداز میں ''باچستان باچستان'' بڑبڑانا شروع کر دیا۔۔۔مگر وہ نشے کی حالت میں بھی ''باچستان'' کا تلفظ اس احترام اور اپنائیت سے ادا کر رہا تھا کہ کسی پاگل کو بھی اس کے لہجے میں ہمارے ملک کے لئے محبت اور تکریم نظر آتی تھی۔ (ملاؤں نے ایسے اچھے دوست ملک میں بھی القاعدہ کی شاخیں کھولنی شروع کی تھیں، جماعت اسلامی نے یہاں بھی اپنی بنیاد پرستی پھیلانی شروع کی تھی!)۔

رات پڑ چکی تھی۔ باہر زبردست بارش ہو رہی تھی۔سخت سردی تھی۔کوٹ، اوورکوٹ بلا جواز نہ لگتے تھے۔ہم نے مرکزِ ثقل سے رابطے بحال رکھنے کے لئے بہت دوڑ دھوپ کی، یکے بعد دیگرے دو تین مختلف قسم کے فون کارڈ خریدے، چیک کئے، مگر سب بے کار۔۔۔۔نہ صرف ہمارا ٹائم اور پیسہ برباد ہوا، نہ صرف سخت سردی اور بارش میں ہوٹل کے آس پاس موجود سارے بوتھوں، PCO اوں کے بے سود طواف کئے، نہ صرف بوٹ کیچڑ سے لت پت ہوئے بلکہ واپسی پہ الٹا دل کی ملکہ نے یہ بھی کہا کہ جا کر فون کرنا بھی گوارا نہ کیا!۔

یہاں اس بڑے صوبے کے دارالخلافہ کے سب سے بڑے ہوٹل کے ٹی وی میں کوئی بی بی سی، کوئی سی این این، کوئی بکواس نہ تھا۔بس کل کائنات چین کی تھی۔آسمان چینیوں کا، زمین، ٹی وی، ہوٹل، آدمی، میزبان۔۔۔سب کچھ ان کا تھا۔اور وہ سب ہمارے دوست تھے۔اور دوست ملک اگر کمیونسٹ بھی ہو تو پھر تو کیا کہنے۔ایسے ملک میں مسافر کی بجائے ملکیت کا احساس ہو جاتا ہے۔سو ہم مالک تھے پورے چین کے......بس ان کی زبان ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔لہٰذا کھانا کھایا اور سو گئے۔

2۔سخی سرور کے دربار میں عشاق پہ کوئی پابندی نہیں ہے

مستؔ

یہاں جام ٹکرانے والی آواز والی ملکہ تو تھی نہیں کہ ہمیں انگریزی والا گڈ مارننگ کہہ کر جگاتی۔بس کمپیوٹر تھا، اور اس میں فیڈ شدہ ویک اپ کال تھی۔ جگانے والی لوری کو بلوچی میں ''نازینک'' کہتے ہیں۔اور دنیا کی بھدی ترین نازینک کمپیوٹر والی ہوتی ہے۔سوچیے کہ جب نیند سے آپ کو مشین جگائے تو وہ کیا جاگنا ہوا؟ دھر فٹے منہ ایسے جاگنے کا۔ چنانچہ ناشتہ کیا، تیار ہوئے۔

اب جبکہ جنکشی یو کا تختہ الٹ چکا تھا۔تو وہ ہماری طرح، بقیہ پانچ بھیڑوں پہ مشتمل ریوڑ کا محض ایک بھیڑ تھے........ چھٹی بھیڑ۔ چھ بھیڑوں کا ریوڑ۔ہم سب بھیڑ کی طرح مہذب، ضابطہ کے پابند اور احکام کے اطاعت گزار تھے۔(عوامی جمہوریہ میں حاکم بدل گیا تھا۔ہم نہ بدلے۔ہم تو ''فیوڈل'' حاکم کے باغی ہیں۔سنگت کے تو سنگت ہیں، بلکہ بہت اچھے سنگت ہیں۔ ہمارا تو فریضہ یہی لگایا ضمیر نے کہ تم ساتھیوں کے سب سے اچھے سپاہی ثابت ہو گے)۔لہٰذا ہم چھ بھیڑیں اور دو میزبان......... کل ہوئے آٹھ۔نواں مترجم ہانس۔جو نہ تو بھیڑ تھا نہ چرواہا، بس درمیان والا تھا۔چنانچہ نو آدمیوں پر مشتمل یہ قافلہ کوسٹر میں بیٹھا (ہم نے بتایا تھا ناں کہ چین میں نو کا ہندسہ بہت مقدس مانا جاتا ہے)۔ٹھیک نو بجے ہم شاؤلین ٹمپل جانے کیلئے روانہ ہوئے۔ہم اس خوبصورت اور میوزیکل نام سے بہت متاثر اور حیران ہو گئے۔اس کے بارے میں بہت دیر تک میاؤں نے کچھ نہیں بتایا۔

ہوٹل سے نکلتے ہی دیکھا کہ برف باری ہو رہی تھی۔ برفباری تو شاعری کا موسم ہوتی ہے۔فطرت کے حسن کو سو سے ضرب دینے والا موسم۔اور حسن تو پھر حسن ہے۔جو آرٹ کے برعکس میوزیم میں نہیں بلکہ ہر جگہ۔ یہاں ہر جگہ حسن موجود تھا۔ ہوا میں، زمین پر، درختوں پہ۔۔اور مفت اٹھانے کیلئے موجود۔اور ہم نے منوں ٹنوں کے حساب سے اٹھایا۔لیکن ایک بات بتا دوں کہ اس برفباری میں ہم بھلا ہنان میں کیوں ہوتے۔ہم تو کوئٹہ میں تھے۔شدت سے یاد آنے والے اپنے پہاڑوں میں جہاں گل لالہ تھرتھراتے ہیں، جہاں چرواہے بانسری بجاتے ہیں، جہاں کسان گاتے ہیں۔جہاں بزنجو بولتے ہیں۔جہاں عشاق کی داستانیں ہیں ....اور جہاں ہماری غزل الغزلات رہتی ہے۔ہم تو اپنی کار میں بیٹھ کر ہنہ جھیل، یا ہزار گنجی کی طرف جا رہے تھے، گانے بجاتے ہوئے، چٹکیاں کاٹتے ہوئے، کلفیاں کھاتے ہوئے، کوثر پیتے ہوئے، مستیاں بانٹتے ہوئے۔۔۔ یہاں۔۔۔ پہاڑوں کے پیچ وخم میں ہمارے لئے کیا رکھا تھا۔ یہاں اس خوبصورت موسم کے شایانِ شان کیا انتظامات ہیں، کچھ بھی تو نہیں۔موسموں کے ساتھ موسموں کے لوازمات نہ ہوں تو ہر موسم عاشور کا موسم ہوتا ہے۔۔۔ اور یہ عاشور کا موسم تھا۔صرف میاؤ کی بلبل والی ہنسی اسے کچھ کچھ برفباری کا سا موسم بنا دیتی تھی ۔ایسی خوبصورت برفباری میں عوامی جمہوریہ چین کے خوبصورت وسطی صوبے کے دارالحکومت میں اگر آپ ایک ٹھنڈی آہ بھریں تو سمجھیں کہ آپ ''مہادیو'' ہیں۔اور ہمارے اِس کارواں میں کم از کم ایک ''مہادیو'' تو ضرور موجود تھا۔

ژینگ ژو شہر سے جو شدید برفباری شروع ہوئی تو وہ پاکستانی موٹر وے جیسی شفاف شاہراہ پر دو گھنٹے تک کوسٹر کی رفتار سے دوڑتے رہنے کے باوجود جاری تھی۔یعنی پورا صوبہ اس کی لپیٹ میں تھا۔کیا خوبصورت سڑکیں ہیں۔اور سڑکوں کا آس پاس کس خوبصورت انداز میں سجایا ہوتا ہے۔ہم نے اس سڑک پر دو گھنٹے کی مسافت میں سمجھیں پورا چین دیکھ لیا۔ہم تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ چین اس قدر ترقی یافتہ ملک ہوگا۔یہ عملاً مغربی یورپ کے کسی بھی ملک سے زیادہ ترقی یافتہ ہے۔شاؤلین جاتے ہوئے یہ سڑک ایک پہاڑی علاقہ سے گزرتی ہے اور ہم نے دیکھا کہ جو بھی موڑ آ جاتے تو ان کی کٹائی کئے ہوئے پہاڑوں پہ فن کاروں نے کندہ کر کے آرٹ کے نادر نمونے بنا رکھے تھے۔ ماسٹر پیس۔ان تصاویر میں کچھ تاریخی ہیں، کچھ کلچرل ہیں اور کچھ ان پہاڑوں میں پائے جانیوالے پہاڑی جانوروں کی ہیں۔اپنی تاریخ سے وابستگی، اپنی ثقافت سے پیوستگی اور اپنے عوام سے بے پناہ پیار کے بنا کوئی ترقی، کوئی انسانیت ممکن نہیں ہوتی۔

بلوچستان میں ہمیں قدرت نے چھ برس سے برف دیکھنے سے محروم کر رکھا تھا تو ہنان میں سہی۔جہاں جم کے برفباری ہو رہی تھی۔اور ہم جم کے مناظر اپنی آنکھوں میں سمو رہے تھے۔میزبانوں کے پروگرام میں برفباری کی منظر نمائی تو نہیں لکھی تھی، یہ تو ہمیں بونس میں مل گئی تھی۔ہم پوتر لوگوں نے اپنے چینی کامریڈوں کو موسم کی پہلی برفباری عطا کی تھی۔ہم پھول سے گئے اور فخریہ طور پر میزبانوں سے اس کا ذکر کیا کہ: ''بلوچستان میں جب بارش اور برفباری ہو تو یہ گویا بڑی خوش قسمتی کی بات تصور ہوتی ہے۔اور جو مہمان اپنے ساتھ برسات لائے وہ بہت اچھا مہمان سمجھا جاتا ہے۔دیکھو ہم تمہارے لئے بخت اور خوش نصیبی لائے ہیں''۔میاؤ جھٹ سے بولی: ''مگر ہمارے پاس جب بھی کوئی اچھے مہمان آ جاتے ہیں تو یہ بد بخت برفباری شروع ہو جاتی ہے''۔ہم اس بے ساختہ سچے فقرے سے سٹپٹا گئے۔بالکل لاجواب ہو گئے۔ثقافتوں کا فرق، ترقی کی سطحوں کا فرق! جو لوگ اپنی تقدیریں خود بدل دیتے ہیں وہ حادثات و اتفاقات کے محتاج نہیں رہتے، وہ معجزات کو دخل در معقولات قرار دیتے ہیں۔

کوسٹر چلتی رہی، ہم دنیا و مافیہا سے بے خبر ہوتے گئے۔ہم فطرت کے خوبصورت نظاروں اور ان کی بدلتی کیفیات میں گم سم تھے۔ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے، کبھی اس کے چہرے سے برف ہٹاتے، کبھی اس کے کپڑے جھاڑتے، کبھی اسے برف کا گولہ

بنا دیتے کہ ہمیں مارے۔کبھی اپنا کوٹ اتار کر اسے اوڑھاتے، کبھی اس کے لئے گرم مفلر خریدتے، کبھی اس کے مفلر کو اپنے گلے میں بندھا دیکھ کر خود کو گدھے کی طرح کھچتے دیکھتے، کبھی اس کی بھاپ بنی سانسیں اپنے چہرے پر محسوس کرتے، کبھی مہین سینے اپنے دل میں نرمی کے گڑھے بناتے دیکھتے۔۔ہم ایک پل میں گزر جانے والے دو گھنٹہ بعد شاؤلین پہنچے۔نہ مفلر تھا، نہ ہاتھ میں کوئی ہاتھ۔۔۔بس ایک گہری آہ تھی، عمیق ترین تنہائی تھی اور آنکھوں کے گوشے گیلے تھے۔

3۔شاؤلین ٹمپل

چین کے مقدس پہاڑ پانچ ہیں۔۔۔جن میں ایک ہینان صوبے میں واقع کوہِ سونگ شان تھا۔ہم اسی مقدس کوہِ سونگ شان کے مغربی دامن میں سرو وصنوبر کے سرسبز جنگلات کی آغوش میں چھپے ہوئے شاؤلین ٹمپل جا رہے تھے جو کہ چین میں بدھ مت کی مشہور اور قدیم ترین خانقاہ ہے۔جدید چینی سماج میں مقدسی کیا ہوتی ہوگی!! بہر حال یہ تاریخی، ثقافتی اور منظر بینی کی اہم ترین جگہوں میں سے ایک ہے۔جو کہ اپنے مارشل آرٹ کی وجہ سے بھی دنیا بھر میں مشہور ہے۔

شاؤلین کا مطلب ہے:’’پہاڑ، اور درخت‘‘۔ہم سرد ترین برف باری میں اس چینی ’’کوہِ سلیمان‘‘ کی سرسبزی و مذہبی حیرت کدے میں پہنچ کر کوسٹر سے اترے۔اور کچھ دور پیدل چلے۔ برفباری ہو رہی تھی۔ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔دُھلی ہوئی فضا مدھم روشنی میں نکھری ہوئی تھی۔اور ہمارے بیچ میاؤ تھی۔اور ہم جام درک گنگناتے رہے:

زور کپشعان بدروشال
مہنا ء ُشار ءِ کھینتغا ں
ملگورء ُ زلفے مینتغاں
جان ءِ گلابی پیرھن
زربفت وکاشی گلبد ن
مینتہ سمیناں جان وتن
شہمیت وکّلی شعلواں
مس لیل وتا ریکیں شفا ں

ترجمہ:۔پورب اور پچھّم کی گھٹاؤں نے پورا زور دکھایا
اس کے سر کا دوپٹہ پرے کھسکا دیا
کاکل اور زلفوں کو بھگو دیا
اسکے گلابی پیرھن کو
جو زربفت اور کاشی کے گلبدن کا تیار شدہ ہے
اسکے تنی بدن کو بارش نے تتر بتر کر دیا
اسکے دمکتے ہوئے جسم سے شعلے سے اٹھتے دکھائی دیتے ہیں
سیاہ و تاریک راتوں میں

ہمارے بلوچستان کا سلیمان پہاڑ پر تو حضرت سلیمان کا تخت ہے جو اُن کی اڑن طشتری کا ہیلی پیڈ، یا ایرپورٹ تھا۔جبکہ یہاں چین کے اس سونگ شان پہاڑ میں چینی بدھ مت کے چان فرقے کا ہیڈ کواٹر ہے۔یہ بہت دلچسپ بات ہے کہ چین کے سارے مذاہب، فلسفے، فنون، لوک ورثہ، دیومالا اور قدیم اساطیر سب کے سب اسکی اپنی سرزمین کی پیداوار ہیں۔البتہ صرف دو تاریخی عوامل ایسے ہیں جو باہر سے چین میں آئے۔ایک تو بیسویں صدی کے اوائل میں مارکسی فکر ہے جو چین میں موثر انداز میں وارد ہو گیا۔اور دوسرا بدھ مت کا مذہب ہے جو کہ ہمارے برصغیر سے وہاں ہجرت کر گیا۔

4۔چینی دیو مالا

گائیڈ اچھا ہو تو سفر بہت اچھا رہتا ہے۔ بہت اچھا گائیڈ ملا۔ ہم نے چاہا کہ شاؤلین ٹمپل پر کوئی کتابچہ وغیرہ خریدیں۔تو اس نے اپنی موجودگی میں ''اس کی کیا ضرورت ہے؟'' والی دلیل دی۔مگر ہم نے اسے ایک کہانی سنا کر اپنے لئے کتاب خریدنے پر قائل کر دیا ۔کہانی یوں ہے:

فلاسفر نے بیرونِ ملک کا ایک تجربہ بیان کیا جب وہ اپنی خریدی ہوئی دو گائیڈ بکوں کو دیکھ رہا تھا۔اس کا گائیڈ بھی گائیڈ بکس کو غور سے دیکھ رہا تھا۔پھر اس نے ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:''یہ بہت بری گائیڈ بک ہے۔دوسری بہتر ہے''۔''کیوں؟ کیا اس میں اطلاعات زیادہ ہیں؟'' گائیڈ نے نفی میں سر ہلایا''یہ کتاب کہتی ہے کہ گائیڈ کو پانچ ڈالر دو جبکہ اُس میں لکھا ہے کہ گائیڈ کو ایک ڈالر دو''۔ہم نے مسکراتے ہوئے گائیڈ کے ساتھ شاؤلین ٹمپل کی ایک کتاب خرید لی۔اس کتاب اور گائیڈ نے جو معلومات دیں، وہ یوں ہیں:

سری لنکا میں مہاتما بدھ سے 27 ویں نسل کا ''دھرما'' نامی ایک بھکشو تھا۔اس نے ایک روز اپنے استاد سے پوچھا:''میں کہاں جاؤں جہاں مجھے بدھ مت کی روح مل سکے؟'' ۔استاد نے کہا:''تم چین جاؤ مگر تم جنوب میں نہ ٹھہرنا اس لئے کہ وہاں کا شہنشاہ بدھ مت کی اصل روح کو سمجھ نہیں سکتا''۔چنانچہ دھرما تیار ہوا، اس نے تین سال میں سمندر پار کیا اور بالآخر جنوبی چین پہنچ گیا۔شہنشاہ نے دھرما کو معزز مہمان بنایا اس لئے کہ وہ خود بھی بدھ مت کا پیرو کار تھا۔البتہ گفتگو میں وہ ایک دوسرے سے متفق نہ ہو سکے۔یہ جانتے ہوئے کہ جنوبی چین اس کیلئے اچھی جگہ نہیں ہے۔وہ وہاں سے رخصت ہوا اور شمال کی طرف روانہ ہوا۔

اسی دوران شن گوانگ نامی مشہور بھکشو وہاں بدھ مت کے بارے میں تقریر کر رہا تھا ۔مقامی لوگوں میں مشہور تھا کہ شن گوانگ کی تقریر اس قدر خوبصورت ہوا کرتی تھی کہ زمین سے سنہرے پھول نمودار ہوتے اور پتھر بھی مسرت سے سر ہلانے لگتے۔دھرما نے بھی مجمع میں سے اپنا راستہ دھکیلتے ہوئے کچھ دیر اس کی باتیں سنیں۔ وہ کبھی رضا مندی میں سر ہلاتا اور کبھی اختلاف میں۔شن گوانگ نے اسے حقارت سے دیکھا اور بدتمیزی سے پوچھا:''تم نے اپنا سر کیوں ہلایا؟''دھرما نے اسے اپنی اختلافی باتیں بتائیں اور دریائے یانگزی کی جانب شمال کو روانہ ہوا۔

سامعین میں سے لوگوں نے شن گوانگ کو بتایا کہ وہ شخص عام آدمی نہ تھا بلکہ وہ تو گرینڈ ماسٹر، دھرما تھا۔شن گوانگ پشیمان ہوا اور اپنی بداخلاقی پر شرمندہ ہو کر اس کے پیچھے جانے اور معافی مانگنے کا ارادہ کر لیا۔

اُدھر جب دھرما یانگزی دریا کے کنارے پہنچا تو دیکھا کہ دریا پر نہ تو کوئی پل ہے ،اور نہ ہی کوئی کشتی۔وہ پریشان ہوا۔اس نے وہاں ایک خاتون بیٹھی دیکھی جس نے سرکنڈوں کا بنڈل ساتھ رکھا ہوا تھا۔دھرما اس کے پاس گیا اور بہت مہذب انداز میں مدد چاہی۔''معاف کیجئے خاتون! کیا آپ مجھے دریا پار کرنے کیلئے ایک سرکنڈا دیں گی؟''

بوڑھی خاتون کو اس کا مہذب اور خوبصورت انداز تخاطب اچھا لگا۔ اس نے اطمینان میں سر ہلایا اور بنڈل میں سے ایک سرکنڈا نکال کر دھرما کو دے دیا۔دھرما نے دونوں ہاتھوں سے احتراماً سرکنڈا لیا اور خاتون کا شکریہ ادا کیا۔ پھر اس نے سرکنڈا دریا میں ڈال دیا ۔سرکنڈا ایک بڑا پھول بن گیا۔دھرما نے اس پھول پر بیٹھ کر دریا پار کی۔

جب شین گوانگ دریا کنارے پہنچا تو دیکھا کہ دھرما ایک واحد سرکنڈے پر بیٹھا دریا عبور کر رہا ہے۔اس نے بدتمیزی کے ساتھ بڑھیا سے سرکنڈوں کا پورا بنڈل چھینا، اسے دریا میں ڈال دیا اور خود اس پر چھلانگ لگا کر بیٹھ گیا۔مگر بنڈل ڈوب گیا اور شین گوانگ جیسے تیسے کر کے واپس کنارے پر چڑھ آیا اور غصہ سے خاتون سے پوچھا۔''وہ ایک سرکنڈے

پر دریا عبور کرسکتا ہے۔ جبکہ میں پورے بنڈل کے باوجود بھی ڈوبتے ڈوبتے بچا۔ تم اس قدر بے انصاف کیوں ہو؟''۔

بوڑھی خاتون نے جواب دیا: ''اس نے تو انتہائی شائستگی سے مجھ سے سرکنڈا مانگا۔ تم نے میرے سرکنڈے زبردستی چھین لئے۔ تو پھر وہی اثر کہاں سے آئیگا؟''۔ یہ کہہ کر وہ آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ شین گوانگ اپنی گستاخی پر پشیمان دریا کے کنارے کھڑا رہا۔

☆☆☆

دریا عبور کر کے دھرما شاؤلین ٹمپل پہنچا۔ یہ 527 کا سال تھا۔ اس نے پہاڑوں کے اندر سرسبز جنگل کے بیچ ٹمپل دیکھی۔ اسے یہ جگہ بدھ مت کی تعلیمات پہ غور وفکر کرنے کے لئے زبردست لگی۔ اسے چیلے مل گئے اور اس نے انہیں چان فرقے کی تعلیم دینی شروع کی۔ یوں شاؤلین ٹمپل چان فرقے کی جنم بھومی بن گئی۔

یہاں نزدیک ہی پہاڑ میں ایک قدرتی غار ہے۔ گائیڈ نے بتایا کہ دھرما نے نوسال تک اس غار میں مراقبہ کیا۔ اس نے اپنی سوچوں کو مرکوز کر کے سارے شیطان بھگا دیئے۔ جب وہ طویل مراقبوں سے جاگ جاتا تو خود کو تازہ دم کرنے کے لئے کچھ ورزشیں کرتا، کچھ کھاتا اور پھر مراقبے میں بیٹھ جاتا۔ وہ اس آڑھے ترچھے دشوار گزار غار میں نوسال تک کھڑا رہا اور عبادت یعنی فلسفیانہ مسائل پر غور کرتا رہا۔ کہتے ہیں کہ اس تنگ وتاریک غار کے آخری سرے پہ موجود چٹان پر دھرما کی شبیہہ بن گئی۔ (اس میں حیران ہونے کی کون سے بات ہے، مائتھالوجی ایسی ہی ہوتی ہے۔ دنیا بھر میں معجزات سے ہی تو مذاہب اور ثقافتیں بنتی اور چلتی ہیں)۔

☆☆☆

شنگو آنگ نے بہت دشواری کے بعد دریا عبور کی۔ وہ بھی شاؤلین ٹمپل پہنچا تا کہ دھرما سے چان مذہب سیکھ لے۔ دھرما کو اس کے سیکھنے کے جذبے کی سچائی پر شک تھا۔ اس لئے اس نے انکار کر دیا۔ مگر شین گوآنگ مایوس نہ ہوا۔ جب دھرما غار میں مراقبے کے لئے بیٹھ گیا، تو شین گوآنگ اس کے پیچھے ہاتھ جوڑے اس کا خیال رکھنے کے لئے کھڑا ہوا۔ وہ 9 سال تک کھڑا رہا۔ اب دھرما غار سے واپس ٹمپل منتقل ہوگیا۔ سردیوں کے موسم میں ایک دن دھرما ایک چبوترے پہ مراقبے میں بیٹھ گیا۔ شین گوآنگ اس کے پیچھے ہاتھ جوڑے کھڑا تھا۔ شام کو برفباری شروع ہوئی اور پوری رات تک چلتی رہی۔ شین گوانگ ہلا تک نہیں اور گھٹنوں تک برف میں دھنس گیا۔ صبح کو جب دھرما مراقبے سے جاگا اور دیکھا تو شین گوانگ سے پوچھا ''تم برف میں کیوں کھڑے رہے؟''۔ شین گوانگ نے جواب دیا'' یہ التجا کرنے کہ مجھے چان کی روح سکھا دیں''۔ کچھ دیر توقف کے بعد دھرما نے کہا ''میں بالکل نہیں سکھاؤنگا، جب تک کہ سرخ رنگ کی برفباری نہ ہو''۔ یہ سن کر شین گوانگ نے اپنی تلوار نکالی اور اپنا بایاں بازو کاٹ ڈالا۔ منجمد بازو زمین پر گرا اور خون نے برف کو رنگین بنا دیا۔ شین گوانگ نے کٹا ہوا بازو اٹھالیا اور چبوترے کے گرد گھومنے لگا اور اس کا خون برف پر قطرہ قطرہ گرتا رہا۔ خود مہاتما بدھ کو شین گوانگ کی قربانی پسند آئی اور اس نے برستے برف کو سرخ کر دیا۔ دھرما متاثر ہوا اور اسے شین گوانگ کی سچائی پہ یقین آ گیا۔ اور اس نے اسے شاگردی میں قبول کرلیا۔

سبق: بدھ مت سیکھنا آسان نہیں۔

☆☆☆

شین گوانگ کو اپنا جانشین مقرر کرنے کے بعد دھرما نے شاؤلین ٹمپل چھوڑ دیا اور کہیں اور چلا گیا جہاں وہ کئی برس بعد مر گیا۔ اسے دفن کیا گیا۔ وہ ایک اہم خلیفہ تھا اور اس کی موت بدھ مت کے لئے ایک بہت بڑا نقصان تھی۔ البتہ سونگ یون نامی ایک افسر کو اس کی موت کا پتہ نہ تھا اسلئے کہ اُس وقت وہ بہت دور ایک ملک میں سفیر تھا۔ دھرما کی موت کے دو برس بعد جب سونگ یون وہاں سے واپس لوٹا تو اُس نے راستے میں دھرما کو ننگے پیر اس طرح

جاتے ہوئے دیکھا کہ ایک جوتا اس کے ہاتھ میں تھا اور دوسرا غائب۔ سونگ یون نے پوچھا ''حضرت! آپ کہاں جا رہے ہیں''؟ دھرما نے جواب دیا ''میں مغربی جنت جا رہا ہوں''۔ اس نے مزید کہا کہ ''کسی کو نہ بتانا کہ تم نے مجھے دیکھا وگرنہ مصیبت میں گھر جاؤ گے''۔ سونگ یون نے دھرما کی باتوں کو مذاق جانا۔ واپس پہنچ کر اس نے بادشاہ کو سرکاری معاملات کی ساری رپورٹ دی۔ اور پھر اسے بتایا کہ اس نے دھرما کو مغرب کی جانب جاتے دیکھا۔ بادشاہ کو اس پر بہت غصہ آیا اس نے طیش میں آ کر کہا: ''ساری دنیا جانتی ہے کہ دھرما مر گیا ہے ۔تم مجھے بے وقوف بناتے ہو؟''۔ بادشاہ نے سونگ یون کو جیل میں ڈال دیا۔ بہت عرصہ بعد جب اس کی شنوائی ہوئی تو بادشاہ نے اس سے پوچھا کہ: ''تم نے مجھے دھوکہ کیوں دیا تھا؟ تم نے کیوں کہا تھا کہ تم نے دھرما کو دیکھا؟''۔ اس نے کہا کہ اس نے واقعی اسے دیکھا۔ وہ ننگے پیر مغرب کی طرف جا رہا تھا اور صرف ایک جوتی اس نے تھام رکھی تھی۔ ''اس نے مجھے بتایا کہ میں یہ بات کسی کو نہ بتاؤں وگرنہ مصیبت میں گھر جاؤں گا۔ میں نے مذاق سمجھا اور آپ کو ساری بات بتا دی''۔

بادشاہ نے تصدیق کیلئے قبر کھود کر دھرما کی لاش نکالنے کا حکم دیا۔ جب قبر کھودی گئی تو دھرما اس میں نہ تھا اور وہاں صرف ایک جوتا رکھا ہوا تھا۔ یوں سونگ یون کو معافی مل گئی۔

5۔ ملاّ جنرل بن گئے

کہتے ہیں کہ ''دھرما'' اپنے مراقبوں کے درمیان وقفوں میں شیر، بندر، اور بچھو کی نقل کی مشق کرتا تھا۔ انہی مشقوں نے ارتقا کرتے کرتے مارشل آرٹ کی ابتدائی صورت اختیار کر لی۔ اور اس وقت سے بھکشوؤں میں کنگفو کی مشق کرتے رہنا ایک فریضہ اور عادت بن چکا ہے۔ اپنے بھکشوؤں اور پیروکاروں کے جسموں کی ورزش اور اعصاب کی مضبوطی کے لئے، نیز اپنا دفاع آپ کرنے کے لئے مارشل آرٹ کی پریکٹس کراتا تھا۔ چنانچہ شاؤلین ٹمپل چینی بدھ مت کے چان فرقے کا ہیڈ کوارٹر تو بنا ہی، یہ مارشل آرٹس کا گڑھ بھی بن گیا۔

تانگ عہدِ سلطنت کے شروع میں شاہی فوج کے ایک جرنیل نے بغاوت کر دی۔ اور اس کے بھتیجے نے شاؤلین ٹمپل کے گرد ایک اہم دفاعی نوعیت کے علاقے پر شاہی فوجوں کو شکست دی اور شہزادے کو گرفتار کر لیا۔ چونکہ یہ محاذ جنگ شاؤلین ٹمپل سے محض 40 میل کے فاصلے پہ تھا۔ اس لئے جلد ہی یہ خبر بھکشوؤں کو پہنچی۔ انہیں عقل مند شہزادے سے بہت محبت تھی (شہزادہ ہمیشہ خوبصورت بھی ہوتا ہے اور عقلمند بھی۔ اور کلیسا کے پادری کو بھلا کب شہزادے سے محبت نہ رہی!) چنانچہ مارشل آرٹ میں یکتا تیرہ عدد بھکشو اسے چھڑانے بھیج دیئے گئے۔ اور وہ شہزادے کو چھڑا لائے۔ ظاہر ہے کچھ عرصہ بعد بادشاہ مر گیا ہوگا اور یہی شہزادہ تخت نشین ہو گیا ہوگا۔ آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ وہ پھر اظہار تشکر کے لئے بادشاہ کی حیثیت سے خود ٹمپل جلوہ افروز ہو گیا۔ ٹمپل کو ''آسمان تلے اولین ٹمپل'' قرار دیا۔ اور ان تیرہ بھکشوؤں کو جرنیل بنا دیا۔

بدھ ملاّ اور فوجی جنرل!! ہمیں پاکستانی جنرل یاد آئے۔ جو اسلحہ کو امن کا ضامن سمجھتے تھے پاکستانی سیاستدان یاد آئے۔ ہمارے ایک ہمسفر نے کہا کہ ایک دانا کے پاس ترقی پذیر ملک سے آنے والے دو ملاقاتی آئے دانا نے ان سے ان کے عوام کی معاشی حالت کے بارے میں پوچھا۔ ان میں سے ایک نے ہتک محسوس کی: ''مگر صاحب!'' اس نے کہا ''ہم مہذب ہیں۔ ہمارے پاس حتیٰ کہ ایک آدھ اسلحہ سازی کی فیکٹریاں بھی ہیں''۔

☆☆☆

یہیں ٹمپل کے کمپلیکس میں ''شہد کی بارش'' کا پلیٹ فارم موجود ہے۔ کہتے ہیں کہ

دھرمانے یہاں بیٹھ کر بدھ مت کے مقدس صحیفوں کا ترجمہ کیا۔ لارڈ اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے شہد کی بارش برسا دی۔

☆☆☆

اب چلتے چلتے میرے بزرگ دوست سی آر اسلم کی بات بھی سن لیجئے۔ ان کا کہنا ہے کہ ''بدھ مت غلامی کے سماج کا مذہب تھا''

اس تباہ کن سردی میں ہمارے ہم سفر تھر تھر کانپ رہے تھے۔ وہ لکڑی کے بنے ایسے بت بن گئے تھے جن کی صرف ٹانگیں حرکت کر رہی تھیں۔ لہذا ان کے تیئں جہنم میں جائے شاؤ لین اور بھاڑ میں جائے ٹمپل۔ بہت تلخی کے ساتھ دوستوں نے سردی اور اپنی پیرانہ سالی کا تذکرہ کیا۔ انہیں مناتے ہوئے ایک آدھ جگہ دیکھی، انہیں بہلاتے ہوئے ایک دو اور مقامات کا نظارہ کیا، انہیں ورغلاتے ہوئے کچھ اور آگے بڑھے، اپنا موڈ خراب کرنے کا دکھاوا کر کے ایک آدھ اور بلڈنگ دیکھی، انہیں واش روم میں چھوڑ کر دوڑتے چھلانگتے کچھ اور مناظر دیکھے۔ اس طرح ابھی تک ماؤزے تنگ کی کتابوں سے گوریلا گیری کے جو بھی داؤ پیچ سیکھ رہے تھے وہ سب اپنے ہم سفر دوستوں پر استعمال کرتے ہوئے میں تو اپنا چکر لگا چکا۔ ہم نے فوٹو گرافی کی۔ ننھی سی میاؤ کے ساتھ بھی، جس کو خدا نے کسی حد تک اپنے ''ہم عمر'' کے ساتھ ساتھ رہنے کی قسمت عطا نہ کی تھی بلکہ اس کی بجائے اسے اپنے دادا پردادا جتنے معمر لوگوں کی ضعیفی کا سہارا بننے کا دل دے رکھا تھا (پتہ نہیں ہمیں ہر جگہ باچا خان کی پیروکارنیاں کیوں ملتی ہیں!! مدر ٹریسائیں، برف کی سلیں، مسجد کی لکڑیاں!!) سندھ، پنجاب اور فرنٹیئر کی یہی ضعیفی دو مزید دنوں تک، جوان بلوچستان کی رقیب بن چکی تھی اور ہم میاؤ کی ''ہم عمری'' حاصل کئے بغیر ہینان سے روانہ ہوئے تھے۔ ''میاؤ'' کو بوڑھے افراد کے کسی ہاسٹل کی وارڈن مقرر کیا جانا چاہیے تھا۔

میاؤ ہمیں مارشل آرٹس دکھانے قریبی سکول لے گئی۔ یہاں سیاحوں کیلئے روزانہ مارشل آرٹس کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ ہم نے ایک گھنٹہ تک ایک نیم دائرے والے ہال میں کرتبوں بھرا خوبصورت مارشل آرٹس دیکھا۔ ''بدھا بوائیز'' کی یہ پرفارمنس بہت ہی حیرت انگیز تھی۔ بہت ہی خوبصورت، بہت چست بہت استادانہ، بہت ہم آہنگ، رونگھٹے کھڑے کرنے والی۔ ہم سب لوگ سردی وردی بھول کر ایک گھنٹہ تک اس میں کھوئے رہے۔ ہال میں جاری رواں تبصرے سے ہمیں کوئی فائدہ نہ ہوا اس لئے کہ وہ چینی زبان میں ہو رہی تھی۔ اور گو کہ خاتون ہمارے قریبی سیٹ پر سے بول رہی تھی مگر وہ ہمیں اپنی طرف متوجہ نہ کر سکی۔

سکول کے اس ہال سے باہر نکلتے ہی مارشل آرٹس سے متعلق اشیاء کی دکانیں تھیں۔ ڈنڈے، چھریاں چاقو، کلہاڑے، تلواریں۔۔۔۔ہم نے کیا کرنی تھیں یہ چیزیں۔ دو چار رومال البتہ خرید لئے۔ یہاں ہماری ہنستی مسکراتی میاؤ نے ہر رکن کے لئے ایک سرخ دھاگہ اور اس پہ پروئے جانے والا چھوٹا سا منکا خرید کر دے دیا کہ اسے گلے میں ڈالو تو ہر بلا، ہر آفت دور بھاگے گی۔ ارے یہ تو بلوچستان والا معاملہ تھا۔ ہم نے اس کا دیا ہوا تعویذ (منکا دھاگا) اپنے کوٹ کے دائیں جیب میں ڈال دیا۔ اور انتہائی پھرتی سے گوریلا کارروائی کرتے ہوئے ان سب جہاندیدوں سے نظریں بچا کر، اپنے وطن کی میاؤ کے لئے ایک دھاگا منکا خرید کر بائیں جیب میں رکھے۔

بارہواں باب

شہ مرید کی گشت گاہ سے واپسی

ہم تھکے ہارے بھی تھے، سردی کے مارے بھی تھے اور تحیراتی، طلسماتی دنیا میں ڈوبے بھی۔ کیسا ملک ہے یہ!! کتنی انتہائیں ہیں اس میں؟ دھرما سے موجودہ صدر تک، شاؤلین سے شنگھائی تک، شاؤلین غار سے پرل ٹی وی ٹاور تک، کنگفو سے سپر پاور تک ----

ہم شہ مرید کی گشت گاہ شاؤلین ٹمپل سے واپس دارالحکومت ژینگ ژو کی طرف روانہ ہوئے۔ اس شاؤلین سے جہاں چھ بڑے کنگفو سکول ہیں، سو بھکشو ہیں اور سینکڑوں انسٹرکٹر ہیں۔ جہاں بہ یک وقت دس ہزار سٹوڈنٹ ہیں۔

وہی قدرتی حسن، وہی خوبصورت مناظر، وہی قربتِ فطرت کی انتہا....... بالکل مست کے شایانِ شان سرزمین، بالکل شہ مبارک کے سردار گزیدہ لختِ جگر کے دودِ دل کا شایانِ شان آسماں۔ چین بہت خوبصورت ملک ہے۔

1۔............ ویکھدا رواں

(نصرت فتح علی کی قوالی)

بارہ بج گئے۔ اور یہ بارہ بجے والی بات سکھوں کی بجائے چینیوں پر زیادہ صادق آتی ہے۔ بارہ بجے ان کے منہ میں دریائے نہنگ جتنا پانی آتا ہے، انکی آنتیں ہمارا والاقل ہواللہ پڑھنے لگتی ہیں اور وہ بلاتر ددوتوقف روٹی نامی دشمن پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ چنانچہ ہم راستے میں ایک ہوٹل میں کھانا کھانے رک گئے۔ بہت ہی جاذبِ نظر اطراف والے اس ہوٹل کے سامنے ایک خوبصورت خاتون کا مجسمہ ایستادہ تھا۔ برف میں دوڑتے بھاگتے ہم نے اس مجسمے کی خوب تصویریں کھینچیں۔ اندر ہوٹل بھی کیا تھا پرستان تھا، پرستان۔ چینی روایتی لباس میں چوغے جیسی لمبی قمیض ہوتی ہے اور آپ کو پتہ ہے بڑے بڑے ہوٹلوں میں حسین ترین

لڑکیاں بھرتی کی جاتی ہیں۔اور نازک نازک سی گوری گوری سی، من موہنی صورتوں والی یہ چینی لڑکیاں جب لمبے لباس میں ملبوس چلتی ہیں تو دل فی البدیہہ نعرہ زن ہو جاتا ہے:

.........ویکھدا رواں

ہوٹل کی دوسری بڑی کشش اس کا گرم ہال تھا۔ہم باہر سخت سردی میں چھ سات گھنٹے تک گھومتے پھرتے رہے تھے اس لئے سردی ہڈیوں کے گودوں تک میں دھنس پھنس گئی تھی۔اب صاحبوں نے اپنی ٹوپیاں اور اوورکوٹ اتار کر انگریزی فلموں کی طرح ہینگرز پر لٹکا دیں۔اور چند ہی منٹ میں ہم مرغی بنے پاکستانی، کرسیوں پہ بہت پھیل کے بیٹھ جانے کے قابل ہو گئے۔اور لگے دیدنیں اکٹھی کرنے۔کون کتنی دیدار بازیاں کر سکا یہ تو اسکی اہلیت پر منحصر تھا۔لیکن میرا خیال ہے کہ اس معاملے میں محترم سلیم اختر لاہوری کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا۔

چونکہ یہاں مسلمانوں والا کوئی ''ایغور ہوٹل'' نہ تھا اس لئے کھانے میں بہت احتیاط کی ضرورت تھی۔ذبیحہ وغیرہ تو خیر اظہار اور داور صاحبان کا مسئلہ تھا۔ہم بلوچ نفسیات کے گرفتار لوگ محض مینڈک وغیرہ نہیں کھا سکتے تھے۔لیکن بھلا ہو جنکشی یوکا۔اس جیسا اچھا انسان ساتھ ہو تو کم از کم چوہے کھانے سے تو ہمیں محفوظ ہی رہنا تھا۔سو ہم بچ گئے۔اسلیے کہ وہ ہر ڈش کے ساتھ ساتھ رننگ کمنٹری کرتا جاتا تھا۔پتہ نہیں وہ زیادہ مہذب تھا یا ہم؟

ایک سفید فام کو آدم خور قبیلے نے گرفتار کر لیا۔اور زندہ بھوننے سے قبل اسے سردار کے پاس لے آئے۔وہ اس وقت حیرت زدہ رہ گیا جب اس نے سردار کو عمدہ ہارورڈ لہجے کی انگلش میں بات کرتے سنا۔

سفید فام نے پوچھا: ''کیا ہارورڈ میں گزارے برسوں نے تمہیں ذرہ بھر بھی تبدیل نہ کیا؟''۔

''بالکل کیا۔ان برسوں نے مجھے بہت مہذب بنا دیا۔اب جب تم بھون لئے جاؤ گے تو میں ڈنر والا لباس زیب تن کرونگا اور تمہیں کانٹے چھری سے کھا لونگا''۔

ہم نے اِس شاندار اور گرم ہوٹل میں زبردست کھانا کھایا جہاں نوجوان خوبصورت اور مہذب ویٹرسیں جادو کرتی جاتی ہیں، جادو کرتی آتی ہیں۔ان پھول چہروں کا حسن، اوپر سے علاقائی لباس۔وہ قیامت بن چکی تھیں۔روایتی لمبے لباس میں ملبوس یہ دبلی پتلی لڑکیاں گیٹ پر کھڑی ہیں، برآمدے میں آتی جاتی دل اکھاڑ جاتی ہیں۔آرڈر لینے آتی ہیں تو پاکستان کا ایک جواں اور پانچ بوڑھوں کو مار گزیدہ بے تابی دے جاتی ہیں۔کھانا لاتی ہیں تو کوئی ارمان ساتھ لے جاتی ہیں۔یہ جب چلتی ہیں تو ان کے میکسی نما لمبے کرتے۔۔۔چھوڑیے۔

ہم ژنگ ژو لوٹے۔راستہ بھر میاؤ اپنی نقرئی ہنسی سے سفر کو معطر کرتی رہیں۔اور سچی بات یہ ہے کہ اسی روز سے ہمیں چینی قہقہوں سے عشق سا ہو گیا۔۔۔چھوٹی، میوزیکل، فی البدیہہ، فطرت سے ہم آہنگ، دل کش، اور دل کُش قہقہے۔اس کے قہقہوں اور ان قہقہوں کے نزول کے وقت نظر آنے والے اس کے خوبصورت دانتوں اور چھوٹی ہوتی ہوئی اس کی آنکھوں کے لئے سمرقند بھی چین کا، بخارا بھی چین کا اور ہم تو تھے ہی چین کے۔

وہ بتاتی ہیں کہ ژینگ ژو تین ہزار برس پرانا شہر ہے، ہینان صوبے کا دارالحکومت ہے۔یہاں ٹیکسٹائل، میٹلرجی، کیمیکل، بجلی، آٹو موبیل اور تمباکو کی صنعتیں بہت ترقی یافتہ ہیں۔ژینگ ژو ایک کمرشل اور کاروباری شہر ہے۔یہ صوبہ چین کے مرکزی صوبے کا دارالحکومت ہے جو کہ معدنی دولت سے مالا مال ہے۔اس میں کوئلہ، تیل، قدرتی گیس اور ایلومونیم کے وافر ذخائر ہیں۔

میاؤ کی تقریر جاری تھی کہ ہمیں راستے میں سڑک کے کنارے ماؤ کا ایک بڑا مجسمہ نظر آیا۔جیسے عید کا چاند نظر آئے۔ہم بہت خوش ہوئے۔جیسے ہم نے کوئی انہونی دیکھی ہو۔اور ایسا تھا بھی۔چین بھر میں ہم نے ماؤ کا یہ واحد مجسمہ دیکھا۔بن سنورے، بن سنگھارے، تنہا تنہا سا مجسمہ۔ہمیں خوشی بھی ہوئی، ہمیں دکھ بھی ہوا۔

اسی طرح چلتے چلتے شہر میں ہم نے ایک کالی گاڑی دیکھی جو ایک میت لے کر جا رہی تھی ۔نہ ساتھ میں کوئی جلوس تھا۔نہ گاڑیوں کا کوئی کارواں تھا۔نہ ٹریفک رکی ہوئی تھی اور نہ گاڑیاں رک کر اسے راستہ دے رہی تھیں۔بس ایک ویگن نما گاڑی تھی جو مکمل طور پر سیاہ تھی ،اکیلی۔ایسا جنازہ تو ہم نے پہلی بار دیکھا تھا۔بھئی عزیز، دوست کہاں ہیں، اس کے رشتہ دار، محکمے والے، محلے والے سب کہاں ہیں؟؟۔معلوم ہوا یہاں ایسے ہی ہوتا ہے۔ترجمان نے بتایا کہ اکثر میتیں ''دفن'' یا ''دریابرد'' نہیں کی جاتیں بلکہ جلائی (Cremation) جاتی ہیں۔اور وہ اپنی میتوں کو ہمارے پس ماندہ ہندوؤں کی طرح بھی نہیں جلاتے کہ لکڑی لاؤ، پنڈت لاؤ، منتر........وہ تو میت کو الیکٹرک اوون میں رکھ دیتے ہیں اور ذرا سی دیر میں جلا کر راکھ کرتے ہیں۔۔ یہ راکھ بوتل میں بند کرکے ورثا ساتھ لے جاتے ہیں ۔اور اپنے گھر میں اپنے پاس رکھ لیتے ہیں۔جب تک رکھ سکتے ہوں۔

بیجنگ کی طرح یہاں بھی ہر جگہ عورتیں کام کرتی نظر آ رہی تھیں ۔ ہوٹلوں میں، دکانوں میں، سڑکوں پہ وہی کام میں مصروف تھیں۔ایک جگہ تو ہم نے روایتی پاکستانیوں کی طرح میاؤ سے پوچھ ہی لیا اور پوچھ کر نادم بھی ہوئے۔پورے دورۂ چین کا تھرڈ کلاس ترین سوال:۔۔''کیا تم لوگوں کے مرد بھی کام کرتے ہیں؟''۔

اس شریف روح نے بہت تفصیل سے ایک پورا چینی جواب مضمون بول دیا ۔اور ترجمان کی مدد سے تو یہ تقریر اور بھی طویل تھی:

''چین میں مرد شاہراہوں ، پلوں ، عمارتوں ، صنعتی مراکز ، فلائی اوورز اور کثیر المقاصد تعمیراتی کاموں جیسے زیادہ مشقت طلب کاموں میں مصروف ہیں۔اور خواتین زندگی کے بقیہ تمام شعبوں کو سنبھالی ہوئی ہیں ۔ بڑی بڑی ائیر کنڈیشنڈ بسیں، ٹیکسیاں خواتین چلاتی ہیں ۔تمام کاروباری مراکز ، سٹالوں ، گفٹ شاپس ، مارکیٹوں کی دکانوں ،اور ہوٹلوں کا سارا کام عورتیں کرتی ہیں ۔سیاحتی مراکز ، عجائب گھر ،اور سپر سٹورز لڑکیاں چلاتی ہیں ۔اس کے علاوہ کمپیوٹر، بنکاری، ٹیلی کمیونیکیشن حتیٰ کہ دفاع کے شعبوں میں بھی لڑکیوں کی تعداد بہت زیادہ ہے''۔چین میں موجود سمّو کی قوم کو مزید ترقی نصیب ہو۔

2۔علماء کی صحبت میں

شام کو ژینگ ژو کے ادیبوں کے ساتھ گول میز کانفرنس تھی ۔ وہاں ایک ہوٹل کے بڑے کمرے میں ایک بڑی گول میز کے گرد، چینی ادیبوں کی دو خواتین اور چھ مرد ہمارے روبرو موجود تھے ۔مقصد یہ تھا کہ ایک دوسرے کے تجربات سے آگاہی ہو کہ کن کن موضوعات پہ لکھا جا رہا ہے۔کہ انسانی یک جہتی، امن اور خیر کیلئے ادیب اور کیا کچھ کر سکتے ہیں۔ان میں ناول نگار تھے، شاعر تھے، اور تنقید نگار تھے۔ہمیں بالکل حیرت نہ ہوئی جب ہمیں بتایا گیا کہ چین میں دس لاکھ سے زائد شاعر ہیں۔اسلیے کہ آبادی کے تناسب سے بلوچستان میں بھی یہی حال ہے۔شاعری نثری ادب کی بہ نسبت ہر جگہ زیادہ لکھی جاتی ہے۔

چین میں مشاعرے نہیں ہوتے (بلوچستان میں بھی نہیں ہوتے تھے، سولھویں صدی کے شاعر بیورغ سے لے کر بیسویں صدی کے شاعر جوانسال تک)۔چین میں شاعر کسی مشہور ایکٹریس کو کسی ہال میں بلواتا ہے۔ٹکٹ لگواتا ہے اور وہ ایکٹریس اس کا کلام پڑھتی ہے۔

گو کہ چین میں حالیہ ادب لوگوں کی زندگی کے بارے میں ہی لکھا جا رہا ہے۔ساٹھ کی دہائی میں بھی ایسا ہی تھا۔مگر تب موضوع دیہی علاقہ ہوا کرتا تھا۔آج ربع صدی گزرنے کے بعد پیداواری قوتیں صفتی اعتبار سے تبدیل ہو چکی ہیں۔ادب بھی انہی پیداواری قوتوں کی مطابقت میں منزلیں پھلانگتا جا رہا ہے۔چنانچہ موضوع یکسر بدل چکے ہیں۔اَب تو ''ریفارم اینڈ اوپن اپ'' کی پالیسی کا بول بالا ہے جس نے ادب کی جہتوں میں بہت تبدیلیاں کی ہیں۔

جدید چین میں دو قسم کے رائٹر موجود ہیں:

(1) پیشہ ور رائٹرز۔ جنہیں سرکار تنخواہ دیتی ہے۔ ماہانہ 2000 یوآن یعنی سولہ ہزار پاکستانی روپے۔ ان کا تناسب البتہ کم ہے۔ (2) پارٹ ٹائم رائٹر۔

ادیبوں کی گول میز کانفرنس میں شامل چینی خاتون ادیبہ نوجوان تھیں، بہت ہی خوبصورت۔ ان کا چہرہ چودھویں کی چاند کی روح روشن بھی تھا اور گول بھی۔ وہ غیر ملکی مہمانوں سے ملاقات کے لئے دلکش مگر وضع دار لباس زیب تن کئے ہوئی ہیں۔ وہ بہت ہی شان، تمکنت اور اعتماد سے باتیں کر رہی تھیں۔ مگر وہ محض حسن کی گڑیا نہ تھیں۔۔۔ ان کے حسن اور اعتماد میں ان کی خوبصورت تحریروں کا رنگ موجود تھا۔ انہی اچھی تحریروں نے تو انہیں ''لوہسون انعام'' سے نوازا تھا۔ اس کا حسین گول چہرہ زندہ باد، اسکی خوبصورت مخروطی انگلیاں زندہ باد، اس کا خوبصورت تخلیقی ذہن زندہ باد، اس کو بے پناہ اعتماد بخشنے والا اس کا سوشلزم زندہ باد۔

چین کے ادب میں چن بادشاہت یعنی 221 ق م سے لے کر جنگِ افیون تک کا جو لٹریچر ہے وہ کلاسیکل ادب کہلاتا ہے۔ چین کی کلاسیکی شاعری کے موضوعات میں امن سے بے پناہ محبت اور جنگ سے سخت نفرت سرِ فہرست ہیں۔ اسکے بعد، مادرِ وطن کے مظاہر و مناظر سے بے انتہا رغبت ہے، انسانی رشتوں کی گہری محبتوں کا والہانہ اظہار اور اس میں وارفتگی کی کیفیت بیان ہوا ہے۔ اسکے علاوہ سماجی اور معاشرتی حالات، خوشحالی اور بدحالی کا ذکر اور سماجی معاملات کے ہر پہلو کی تصویر کشی موجود ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے قدیم چین میں پر امن ادوار بھی رہے ہیں جن میں شاندار تہذیبوں نے جنم لیا ہے۔ اور شدید خانہ جنگی کے زمانے بھی آئے جہاں تباہی اور ماتم کا دور دورہ رہا ہے۔ اس لئے امن کے ترانے اور جنگ سے بیزاری کے نوحے چینی شاعری کا بہت بڑا حصہ تشکیل دیتے ہیں۔ چینیوں نے ہر عہد میں اپنی بہترین تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کیا اور علوم وفنون میں قابلِ فخر ایجادات و اختراعات کر کے انہوں نے معاشرے کو خوبصورت بنایا۔ وہ ظلم کیخلاف لڑے۔ انہوں نے انصاف کی خاطر قربانیاں دیں۔ امن کے زریں عہد کے لئے چینی شاعروں نے ہمیشہ تمنا کی ہے۔ جنگی سرداروں، جاگیرداروں، راجوں ،مہاراجوں، اور بادشاہوں کے خلاف دو ہزار سال قبل مسیح سے لے کر جدید زمانوں تک ہر عہد کے شاعر اپنے جذبات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ ایسی نظموں میں نوحے اور بین کا سا انداز ہے۔ بادشاہ کی مرضی کے آگے بے چارگی کا اظہار اس طرح ہے کہ شاعر کے دل کی نفرت واشگاف طور پر ظاہر ہو جاتی ہے۔

قدیم دور کے شاعروں میں کنفیوشس کا نام سرفہرست آتا ہے۔ وہ کنفیوشسی فلسفے کا بانی تھا۔ وہ اپنے وقت کا عالم، ادیب، موسیقار اور حکمران طبقوں کا پٹھو سیاستدان تھا۔ اور ادھر ادھر گھوم کر بادشاہ پرستی کا پرچار کرتا رہتا تھا۔ کنفیوشس عمل کی بجائے استغراق میں نیکی ڈھونڈتا ہے۔ اس کا یہ فلسفہ جنوب مشرقی ایشیاء میں بالعموم، اور چین میں بالخصوص استحصالی حکمرانوں کے بہت کام آتا رہا۔ (دنیا کے ہر فلسفہ کو حکمرانوں کے کام آتا رہا ہے یا حکمران نے اسے اپنے فائدے کا بنایا ہے)۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ مشہورِ عالم کتاب ''نغماتِ کنفیوشس'' کے نام سے تین سو کے قریب جو لوک گیت یکجا ہوئے تھے وہ اس کی اپنی تخلیق نہیں ہیں۔ اس نے اِن گیتوں کی دھنیں بنائیں اور وہ سارنگی پر انہیں ہر ہر جگہ پر گایا کرتا تھا۔ بادشاہ پرستی ان سارے نغمات میں نمایاں ہے۔ ان نغمات میں عوامی لوک گیت، کمتر اہمیت کے روزمرہ زندگی کے معاملات، اہم قومی سیاسی باتیں اور شاہی خاندان کے مرحومین کی روحوں کے لئے تیار کی گئی مذہبی شاعری شامل ہے۔

چینی فیوڈل حکمران صدیوں تک اسکی تعلیمات کو ایک مکتبِ فکر کے بطور استعمال کرتے رہے۔ اسکی تعلیمات مشرقی اور جنوبی ایشیا میں دور دور تک پھیل گئیں جہاں آج بھی اسکے اثرات محسوس کئے جاسکتے ہیں۔ چین میں البتہ سرکاری سرپرستی سے عوامی انقلاب اسے محروم کر چکی ہے۔ لیکن چینی عوام کی روزمرہ زندگی میں اسکے آثار اب بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔

کنفیوشس کے علاوہ چو یو آن ، لی پو اور طوفو بہت مشہور شاعر ہو گزرے ہیں ۔ جنہوں نے فطرت کے حسن اور مناظر کی رنگینی کو بہت خوبصورتی سے بیان کیا ہے ۔ انسان دوستی ان شاعروں میں مشترک خصوصیت تھی ۔ ان کی اصناف البتہ ہمارے منطقے کی شاعری سے بہت مختلف رہی ہیں ۔ ان کی شاعری نثری لگتی ہے ۔ پتہ نہیں چلتا کہ یہ جواب مضمون ہے یا شاعری ۔ اور جب ترجمان بتاتا کہ وہ نثر نہیں شاعری پڑھ رہا ہے تو ہم احمقوں کی طرح سر دھننے لگتے ۔ سینما کے اندر بے وقوف کی طرح دوبار ہنسنا ۔

چین کا جدید ادب بہت پہلو دار ہے ۔ انقلاب کے ایک سکرات والے عمل سے گزرنا بذاتِ خود ایک قوم کیلئے بہت بڑا اسبق ہوتا ہے ۔ پھر یہ انقلاب اپنی ارتقا کے سفر میں بے شمار صدموں ، جھٹکوں ، فتوحات ، پسپائیوں اور تجربات سے گزرا ہے ۔ چنانچہ آج کا چینی ادیب محض وطن کے موجود لینڈ سکیپ ہی سے محبت نہیں کرتا بلکہ وہ اس کو کھرپے ، کدال ، ٹریکٹر' مشینوں اور کمپیوٹروں کی مدد سے بدلتا بھی دکھا رہا ہے ۔ چٹیل میدان سرسبز و شاداب کھیتوں میں بدل جاتے ہیں اور خطرناک پہاڑی گھاٹیاں ریلوے لائنوں اور پلوں سے ڈھک جاتی ہیں ۔ پھر پیداواری قوتوں کو فرسودہ کسان کے بجائے ایک صنعتی معاشرہ کے قیام کی تیز ترین تگ ودو بذاتِ خود چینی ادیب کا ایک انوکھا اور پیچیدہ مورچہ بن چکا ہے ۔ چنانچہ اپنی اس پیداواری محنت اور ایک عظیم اجتماع سے مل کر مسلسل انقلاب برپا کرتے رہنے کے عمل سے محبت جدید چینی شاعری کا ایک نمایاں وصف ہے ۔

چین کے جدید عہد کے شاعروں میں لوہسون کا نام سرفہرست آتا ہے جس کا ذکر ہم پہلے کر چکے ہیں ۔ دوسرا نمبر صوبہ سی چوان کے ''جودے'' (1886.....1976) کا آتا ہے جو اوائل عمر ہی میں ڈاکٹر سن یات سن کی تحریک میں شامل ہوئے تھے ۔ اور بھرپور جوانی میں مارکسزم کی صداقت کے قائل ہو کر 1922 میں چینی کمیونسٹ پارٹی کی برلن شاخ کے رکن بن گئے ۔ ان کی پارٹی رکنیت خود چو این لائی نے کروائی تھی ۔ جودے ، زندگی بھر مارکسزم کو سینے سے لگائے رہے ۔ انقلاب کے بعد اعلیٰ ریاستی و پارٹی عہدوں پہ فائز رہے مگر سادگی وہی مزدوروں والی رکھی ۔ ان کی شاعری عوامی ہے ، انقلابی ہے ۔ مزدوروں کسانوں کی ہے ، سوشلزم کی ہے ۔ جودے چونکہ مزدوروں کی سیاسی جدوجہد کے مختلف مراحل اور اسکی کامیابیوں ناکامیوں میں دل وجان سے خود حصہ دار تھے اس لئے ان کی شاعری بھی انہی کی طرفداری کرتی ہے ۔ یہاں انکی ایک نمائندہ نظم نقل کرتا ہوں :

دور سے نظارہ

وقت گزرتا جارہا ہے اور
دکھی لوگ
اپنے پیارے مرحوم رہنما کے لئے ترستے ہیں (1)
سرخ پرچم جاچکا ہے
ملک بدر ہو چکا ہے
کریہہ کوے چکر لگا رہے ہیں
بیمار درخت کی کشش میں آ کر (2)
جنگی بطخوں کی طرح تیز اڑان میں
ابھی تک کومنتانگ کے حملے کا ملبہ پڑا ہے (3)
اپنے شمالی شینسی کے بھائیوں پر فخر کرتا ہوں
جنہوں نے ان مشکل وقتوں میں سب مشکلات پر قابو پالیا تھا

کسان بڑی گرمجوشی سے میرا استقبال کرتے ہیں

ایک پرانے دوست کی حیثیت میں
میں ان کے ساتھ مل کر کھجور اور پیٹھا کھاتا ہوں
کمیون میں اپنے اس برس کے کام کی بات کرتے ہوئے
وہ
''آگے کی طرف ایک زبردست جست''
لگانے
کے کس قدر مشتاق نظر آتے ہیں

(1) یعنی سوویت لوگ لینن کو ترستے ہیں۔
(2) سرمایہ داری کے فریب میں
(3) کومنتانگ کا 1947 کا ینان پر حملہ

جدید دور کے چینی شعراء میں ایک اور بڑا نام تونگ پی وو (1886.....1976) کا ہے۔ یہ بڑے انسان نوعمری ہی میں سن یات سن کی تحریک میں شامل ہو گئے۔ 1911 کے انقلاب کی جدوجہد میں حصہ لیا اور اسی جدوجہد کے دوران مارکسزم کی روشنی تک جا پہنچے۔ انہوں نے 1921 میں چینی کیمونسٹ پارٹی کی تاسیسی کانگریس میں حصہ لیا۔ وہ 1934 کے لانگ مارچ میں شامل تھے۔

انقلاب کے بعد عوامی جمہوریہ کے نائب صدر کے عہدے تک جا پہنچے۔ تونگ وو پانچ بار سنٹرل کمیٹی کے رکن منتخب ہوئے۔ یہ منفرد اور صاحبِ طرز شاعر مظاہر فطرت کو ٹھوس سائنسی فکر اور انقلابی جذبے کے ساتھ ملا کر شاعری کرتا تھا۔ بہت خوبصورت شاعری کا ایک نمونہ یوں ہے:

اپنی 90 ویں سالگرہ پر

نوے سال
پل میں گزر گئے ہوں جیسے
ایک دکھ بھری زندگی میں
بہت کم کامیابیوں کا مجھے افسوس ہے
پانچ سلطنتوں کی غیر عادلانہ
حکمرانی
کو میں نے دیکھا ہے (1)
آج ہم بتدریج
تعمیر کر رہے ہیں
ایک نیا نظام
خارج کو ہی بدل دینا کافی نہیں
تبدیلیاں دل کے اندر بھی برپا ہونی چاہئیں

پہاڑوں اور دریاؤں کو درست کرنے
کی خاطر
ہم مل جل کر کام کرتے ہیں
مارکس اور لینن کے راستے پر چلتے ہوئے
ہم ہمیشہ کامیاب ہونگے
مجھے پکا یقین ہے ہم

اپنی منزل کو
ضرور پالیں گے۔

(1) چنگ خاندان، چینی جمہوریہ کے اولین ایام، یوآن سی کی حکومت، جنگی سرداروں کا عہد ،اور چیانگ کائی شیک کا دور۔

کوموروجدید شاعری کے سرخیل ہیں چین میں ۔وہ بقیہ چینی شاعروں کی بہ نسبت جلد سمجھ میں آنے والے شاعر ہیں ۔ان کی شاعری کا اسلوب چین کے دیگر تمام انقلابی شاعروں کی طرح سہل اور عام فہم ہے ۔ بنیاد سائنسی سوچ ہے اور اس کے ساتھ انقلابی رومانیت کی رنگینی شامل ہے ۔ 1927 میں کمیونسٹ پارٹی کے رکن بن گئے تھے ۔انقلاب کے بعد متعدد سیاسی ثقافتی ،سائنسی اور بین الاقوامی نوعیت کے فرائض انجام دیتے رہے۔ان کی خوبصورت شاعری کا ایک نمونہ دیکھئے:

امن کی فاختہ کا گیت

ہر جگہ، چاہے کوئی بھی ملک ہو
میری طرح کی فاختائیں ہیں
سو میں ہر سرزمین کی زبان سمجھ سکتی ہوں
میں آسمانوں میں اونچی اڑ جاؤنگی
کسی گدھ، کسی عقاب اور کسی امریکی جہاز کا خدشہ کئے بغیر

اور ان چند دنوں میں
میں پیکنگ کے ہوٹل میں اڑ کر گئی ہوں، جہاں
ایوانِ اجلاس میں وہ مندوب اب ایک بے کنار سمندر بن گئے
جو ایشیائی اور بحرالکاہلی علاقوں کے
بیس سے زیادہ ممالک سے آئے ہوئے
ایک عظیم بیضوی میز کے گرد بیٹھے ہیں

میں آکر ایک سبز رنگ کے وسیع غالیچے کے درمیان میں بیٹھتی ہوں
جو ایوان کے آخری سرے پر لٹکا ہوا ہے
میرے نیچے ہر سمت پھول رکھے ہوئے ہیں
لمبے کھجور کے درخت شان بڑھانے کے لئے لائے گئے ہیں
ہر وفد کے سامنے ننھے پرچم سجے ہیں
جو یوں کھڑے ہیں جیسے، بہت سے پھول بہار دے رہے ہوں

ایسی پر امن تصویر
ایک پر آہنگ نظم کی طرح
کوئی بھی اسلحہ بڑھانا نہیں چاہتا، نہ اعلانِ جنگ کرنا چاہتا ہے
سب پر امن بقائے باہمی چاہتے ہیں
بغیر ناکہ بندی کے اور تجارت کی ممانعت کے
تجارت کا آزادانہ بہاؤ!
کوئی بھی جارحیت یا غلامی نہیں چاہتا
سب زندگی چاہتے ہیں نہ کہ موت

میں چین کے وفد کی پروقار تقریر سنتی ہوں
پھر سوویت یونین کی اختتامی تقریر

اور وہ اعلان جو آسٹریلیا کے وفد نے پڑھا
اور پاکستان کو قرارداد پڑھتے ہوئے سنتی ہوں!

سنجیدہ ملاقاتوں کے چار دن، ہم آہنگی میں
آزادی میں، جاپانی اور کوریائی وفود شانہ بشانہ
امریکی اور سوویت وفود ہاتھ میں ہاتھ ڈالے
برہان کی روشنی میں تضادات پگھل گئے
اور کامل اتفاق کے لئے
مشترکہ رضامندی پیدا ہوگئی

تو اے امن کے محافظو! آپ کو الوداع!
میں برلن کو پرواز کر رہی ہوں
اور اس خواب تک کے لئے میں الوداع ہی کہوں گی
اور پھر واپس آجاؤنگی
اور ہم بے تکلفی سے باتیں کریں گے
تب موسم خوشگوار ہو جائیگا
اور سب فصلیں پک جائیں گی
تو ہم اس وقت جمع ہو جائیں گے
امن، امن، امن کی
عظیم فصل کے درمیان!

تیرہواں باب

کلچر، ایگریکلچر

1۔مُرگ ءَ چُوری

اگلی صبح ہم شہر کے میوزیم چلے گئے ۔البتہ اس میوزیم میں ہمیں بیجنگ کی Forbidden City سے الٹ تھیوری نظر آئی ۔وہاں مرد کی علامت شیر تھا اور عورت کو شیرنی کی صورت دی گئی تھی ۔جبکہ یہاں اژدھا (ڈریگن) مرد کی علامت ہے اور پرندہ عورت کی ۔ہمیں یہ بات جس نے بتائی وہ کرایہ پر حاصل کی گئی ایک گائیڈ تھی ۔ وہ خود ایک ننھی پرندہ تھی ۔(میرے چچا سحراب خان اپنی محبوبہ کو'' مرگ ءَ چوری'' یعنی پرندے کا چوزہ کہا کرتے تھے)۔ ہماری یہ''مُرگ ءَ چُوری'' فقرہ بولتے بولتے بات کے آخری حرف کو لمبا کر جاتی ، جیسے کسی سوچ میں پڑ گئی ہو،اور ایسا کرتے ہوئے آنکھوں کو نیم وا کرنے کی حد تک بند کرتی جاتی ۔۔۔اور اسطرح وہ اپنا فقرہ پورا کرتی ۔ یہ اس کی عادت تھی ۔بات کرتے ہوئے ہر دوسرے تیسرے فقرے پر کسی بات کی دم لمبا کرتی اور آنکھیں سکیڑتی جاتی ۔اب ایسی حالت میں کون کم بخت کچھ سن سکتا تھا ، کچھ سمجھ سکتا تھا یا کچھ اور دیکھ سکتا تھا۔بس وہ بولنے لگتی اور ہم لمبی'' آں'' سننے اور اس کی دونوں آنکھیں کونج کی لینڈنگ کی طرح خراماں خراماں بند کرنے کا انتظار کرتے ۔ ہماری آنکھیں ، ہمارے کان ، ہمارا دماغ ، ہمارا دل ، ہمارے ہوش ، ہمارے حواس سب انہی نیم بند آنکھوں میں جم کر رہ گئے ۔خوبصورت گورا بدن ،اوپر سے نیلا کوٹ اور نیلی سکرٹ ،اور نیلے کوٹ پر چھوٹا سا تازہ پھول ....۔''نیلا پرندہ!''۔ہم سے رہا نہ گیا،اور ہم نے اپنے دوسرے ساتھیوں کی عقابی نگاہوں کو میوزیم کے ایک مجسمے پہ ٹانگ کر، انتہائی پھرتی ،راز داری اور دل کی گہرائی سے اسے کہہ ہی دیا:''تم نیلے پروں کے ساتھ ایک نیلا پرندہ لگ رہی ہو۔اور میں فیصلہ نہیں کر پا رہا کہ میوزیم دیکھوں یا تمہاری موسیقی بھری آواز سنتے سنتے تمہاری نیم وا آنکھوں میں دفن ہو جاؤں ۔تمہارا یہ طویل'' آں'' تو کچھ دیکھنے دیتی ہی نہیں!''

وہ مسکرا دی،تھینک یو بولا اور اپنے فریضے کی ادائیگی میں لگ گئی۔مگر اس کے بعد وہ

بولتے بولتے جب ''آں'' کہتی ہوئی حسبِ عادت آنکھیں سکیڑنے لگتی تو اسے میری بات یاد آجاتی۔تب اس کے خیالات درہم اور برہم ہوجاتے، وہ جھینپ سی جاتی۔اور اس کا سُر ٹوٹنے لگتا۔

اور میں یا تو نیچے دیکھنے لگتا یا ادھر ادھر تکنے لگتا۔دل کرتا تھا کہ اس حسینہ کی موسیقیت بھری ادائیگی کو ڈسٹرب کرنے کے جرم میں خود کو رکھ کے ایک تھپڑ رسید کردوں۔کاش وہ حسبِ سابق بولتے بولتے آنکھیں سکیڑتی جائے اور ہم افلاک کو فراموش کرتے چلے جائیں۔

2۔شاہ محمد

سچا واقعہ ہے کہ میرے ایک بزرگ شاہ محمد تھے جو کُل پیداوار کے چوتھائی حصے پر میرے والد کی زمین کاشت کرتے تھے۔ایک روز جب شام کو میرے والد کھیت پہ گئے تو دیکھتے ہیں کہ دن بھر کا ہل تو چلایا ہوا ہے مگر وہاں دو آدمیوں کے لڑنے کے نشانات ہیں، چیزیں تتر بتر پڑی ہیں، اور، سر اور داڑھی کے بال پڑے ہوئے ہیں جو کہ شاہ محمد کے لگتے ہیں۔وہ بہت فکر مند ہوئے اور غصہ بھی، کہ میرے بزرگ کو کس نے پیٹا ہے۔تیز تیز گاؤں آئے، سیدھا شاہ محمد کے گھر پہنچے اور پوچھا:''بتاؤ تم سے کس نے لڑائی کی، کس نے تمہیں پیٹا ہے، کس کی جرات ہوئی کہ اس نے تمہاری داڑھی نوچی ہے؟''۔

شاہ محمد نے بڑے اطمینان سے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''شاہ محمد نے''۔

''کیا مطلب؟'' والد نے پوچھا۔

''ہوا یہ کہ میرا اور شاہ محمد کا تنازعہ ہوگیا۔میں نے کہا کہ حاجی محمد مراد (میرے والد) کی بزگری چھوڑ دونگا۔کام بہت ہے'' مگر شاہ محمد کا کہنا تھا ''خبردار، یہ بزگری کبھی نہ چھوڑنا۔یہ مالک بہت اچھا ہے، خیال رکھتا ہے، بچوں کی طرح رکھتا ہے''۔میں نے کہا ''ہرگز نہیں۔میں اب ایک دن بھی اس کھیت پہ کام نہیں کروں گا''۔اس بات پہ میری اور شاہ محمد کی ہاتھا پائی ہوگئی اور چونکہ ''میں'' بھی ''میں'' تھا اور شاہ محمد بھی ''میں'' تھا۔لہٰذا داڑھی اور سر کے بال تو میرے ہی گرنے تھے''۔

خیال آیا کہ وہی والا شاہ محمد بن جاؤں۔

3۔ایں مئے کہنہ جوان است و جواں خواہد بود

علاّمہ اقبال

یہ میوزیم 1998 میں بنا۔ہر میوزیم کی طرح یہ بھی اعلیٰ پیمانے پر کلچر، سفر، تفریح اور ٹورازم کی خدمت کررہا ہے۔یہ میوزیم بھی تاریخ کا آئینہ، علم کا سمندر، اور ثقافتی مظاہر کی جنت نکلا۔

ہم چونکہ مجرم تھے، ہم نے خاتون گائیڈ کی نغمگی توڑی تھی۔میوز کی پجارن کا سُر پریشاں کرنے کا گندم کا دانہ کھا کر ہم اب کیا کرتے۔میوزیم ہی دیکھتے۔لہٰذا ہم چپکے سے اپنے گروہ سے نکلے اور ٹورسٹوں کے کسی اور گروہ میں شامل ہوگئے۔اور اس طرح بغیر تبصرہ کیئے کسی اور ''مرگ ءِ چُوری'' کی قیادت میں ہم نے میوزیم دیکھنا شروع کردیا۔

ہمیں میوزیم کو عجائب گھر کہنا کچھ اچھا نہیں لگتا۔یہاں اس میوزیم میں ہم نے تیسری صدی کی ایک بڑی قینچی دیکھی جسے بلوچی میں ہرّل کہتے ہیں۔اس پر ہماری نظریں گویا اٹک کے رہ گئیں۔ہم بلوچ، ہرل سے اپنی بھیڑوں کا پشم کاٹتے ہیں۔ارے چینی لوگ تیسری صدی میں اسے استعمال کرتے تھے اور ہم، ہمارا بلوچستان آج اکیسویں صدی میں بھی اسے ہی استعمال کرتا ہے۔۔۔پورے اٹھارہ سو برس کا فاصلہ ہے میرے ماوند اور میاؤ کے دیس کے

درمیان۔اوراس فاصلے کو پاٹنے میں غیرت، روایت، بلوچیت، عقیدہ، سردار، اور سردار کے باڈی گارڈز جیسے سلیمان پہاڑ حائل ہیں۔کتنا سخت مورچہ ہے بلوچ کا!!۔

اس قدیم میوزیم کے ایک حصے میں ایک خصوصی ہال بنا دیا گیا ہے۔ وہاں ہمیں چین کی قدیم دور کی موسیقی Live سنوائی گئی۔ان قدیم آلات کو بجانے والی خواتین اُسی زمانے کا لباس اور زیورات پہنے ہوئے تھیں۔بالکل شاہی دربار والا لباس اور ماحول بنا دیا گیا تھا۔یہ دراصل قدیم موسیقی کے کلچر کے جوہر کو کھود نکالنے کے مترادف بات تھی، قدیم موسیقی کے ثمرات کو دوبارہ زندہ کرنے کی بات تھی اور موسیقی کے ذریعے تہذیبی ورثے کی حفاظت کرنا مقصود تھی۔قدیم موسیقی کا یہ پرلطف ذائقہ اس میوزیم میں ہر صبح اور سہ پہر کو میسر کیا جاتا ہے۔یہاں ہڈی کی بانسری بجائی جاتی ہے۔ پتھر سے بنا الغوزہ نما آلہ بھی ہے جس میں دو کی بجائے بارہ پائپ ہوتے ہیں جو سوراخ کے ذریعے ایک دوسرے سے ملائے گئے ہیں۔اسی طرح بکری کے بچے کے گلے میں بندھی چھوٹی گھنٹی سے لیکر ہاتھی کے گلے میں باندھی بہت بڑی گھنٹی کے حجم تک کی کانسی کی بنی 26 گھنٹیاں قطار میں ٹنگی ہوتی ہیں۔جن پر لوہے کے بڑے ڈنڈوں کے سروں سے ضرب لگا لگا کر خوبصورت موسیقی پیدا کی جاتی ہے۔قدیم بادشاہوں کے دربار کی موسیقی۔اسی طرح مچھلی کی شکل کا بنا پتھر کا موسیقی کا آلہ ہے۔مختلف سائزوں میں ٹنگے ہوئے ان پتھروں پر سٹروک لگا کر بہت خوبصورت موسیقی کشید کی جاتی ہے۔یونان کی قدیم موسیقی کی تاریخ 9 ہزار برس قبل کی بتائی جاتی ہے۔اور موسیقی کے یہ سارے آلات کھدائی کے دوران ملے۔آج انکی نمائشی تقریبات کا مطلب اسلاف کی ارواح کی آواز سننے کے مترادف ہے۔ہمیں بتایا گیا کہ دھنوں میں دیوتاؤں اور انسانوں کے بیچ ربط، اچھی فصل کی دعا، مہمان نوازی کی ترغیب، محبوبہ کی تعریف، پرندوں کے گیت، پھولوں کی توصیف، قدیم داستانیں، اور وصل کے نغمے شامل ہیں۔ہم نے یہاں ستار نما انسٹرومنٹ سنا۔حسن کے ہاتھ ہوں، موسیقی کا زبردست آلہ ہو، موسیقیت بھری فضا ہو، موسیقی سننے والا دل ہو.......... لگتا تھا سُر ان کی انگلیوں کی پوروں سے قطرہ قطرہ ٹپک رہے تھے اور ہم اپنے پیاسے دل کے کٹورے بھر بھر کے روح کے مشکیزے میں انڈیلتے جا رہے تھے۔

اور ان کلاسیکل آلاتِ موسیقی بجانے والیوں نے اسی زمانے کے حوروں جیسے لباس پہن رکھے تھے۔(ملاّ کم بخت فرشتوں کے ناموں میں سے چار چھ کا نام تو بتا سکتا ہے مگر حوروں میں سے ایک کا نام بھی نہیں جانتا)۔۔۔چلو، قدیم چینی شاعر لی پو کی شاعری سنتے ہیں:

ین اور چاؤ کے لڑکے میرے لیے گانے بجاتے رہے
پیاری لڑکیوں نے تاروں والے شاندار باجے اٹھائے
ان کے رنگ بھرے رخسار چندھیا دینے والے سورجوں کی طرح چمکتے ہیں
رقاصاؤں کی آستینیں یوں باہر کو لہراتی تھیں جیسے پھوٹتی شاخیں ہوں
میں ایک خوبصورت لڑکی کے پاس اس کے لیے شراب لے کر گیا
اور اسے کہا کہ میرے لیے میری پسند کا گیت گائے
پھر ستار بجنے لگے
پھر مڑتی ہوتی، دور، اور دور
دُھن زمین کی جانب گرنے لگی

میں آپ کو سچ بتا رہا ہوں کہ یہ گڑیاں حوروں کی ملکہ کے حسن سے بھی دس لاکھ گنا زیادہ خوبصورت تھیں۔۔۔ایسی گڑیاں جنہیں چھونا بھی حسن کے دیوتا کی گستاخی تھی۔بس دیکھتے رہ جائیے، بس سنتے رہ جائیے اور بس، لفظ ''خوبصورتی'' کے معانی جانتے رہیے۔ہم تالیاں پیٹ سکتے تھے پیٹتے رہے، تصویریں کھینچ سکتے تھے کھینچتے رہے، ہم نے اپنا گلہ بٹھا دیا واہ واہ کر کر کے، ہاتھ سرخ کر دیئے تالیاں بجا کر، گردن کے پٹھے چڑھا دیئے سر ہلاتے ہلاتے اور پوری ریل خرچ کر ڈالی تصویریں بناتے بناتے۔۔۔مگر پھر بھی دل کا ایک کونا تک ٹھنڈا نہ

ہوا۔ ہم پہنچ چکے تھے وہاں جہاں ابدال پہنچا کرتے ہیں۔ ہم اِس حسن گاہ میں بھی وہی دو آنکھیں ڈھونڈ رہے تھے جو اس پوری دنیا میں ہمیں سب سے عزیز ہیں۔ اور اِدھر وہ گلوکارائیں تھیں کہ جو جام درک کے بقول:

یکے ہمشیں مس تی اے گشاں

(ایک نظم تو یہی ہے جو میں نے سنا ڈالی، اب ایک اور سناتا ہوں)

قلات کا شہر ہو، نصیر خان نوری کا دربار ہو، جام درک کی آہ وفغاں بھری شاعری ہو اور۔۔۔ ایسی فنکارہ ایں ہوں۔ اگر ایسا ہو تو پشتو کا غنی خان بہشت تو کب کا ملاّ کی توند پر پٹخ چکا ہو۔

اس نیم تاریک موسیقی بھرے ہال میں میری پہلو والی سیٹ پر بیٹھی میاؤ دلچسپ طریقے سے موسیقی سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔ اس نے پرس سے سنگھار کا سامان نکالا۔ موسیقی کی لے کا ساتھ دیتے ہوئے بہت موسیقیت سے پہلے ہونٹوں پہ لپ سٹک تازہ کیا، پھر ردھم میں آئینہ دیکھا، پھر آنکھوں کا سنگھار کیا، عطر لگائی، اپنے ابروؤں کی کمان کا جائزہ لیا، اپنی مژگانِ زہر آب کو اور مہلک بنایا۔ الغرض وہ پورا عرصہ موسیقی کی سنگت میں اپنی آرائش کی دیکھ بحال کرتی رہی۔ شہ مرید کی مقدس روح ہال میں منتقل ہو چکی تھی۔ اور شہ مرید نے سبی کے ایک کمرے میں ہانی کے ساتھ زبردستی بند کئے جانے پر جو واسطے اسے دیئے تھے، وہی ہم میاؤ کو دینے لگے:

ھانو گلیں ھانو گلیں

کوفغ سراں سہرامہ خاں

ترجمہ:

پھول جیسی ہانی، پھول جیسی ہانی

اپنے بازو ڈھانپ دو

میرا شہ مرید اپنی تیس سالہ تپسیا تو ایسے ہی کسی ویران ٹمپل میں کر کے اس آزمائش کی گھڑی میں مجھ پہ مکمل طور پر حاوی ہو چکا تھا۔

گو کہ پندرہ منٹ والا میوزک شو چٹکی بجاتے گزر گیا۔ مگر ہم ہزار شمسی سالوں کی مسافتیں طے کر چکے تھے۔ ہم ٹائم اور سپیس دونوں کو ورطہِ حیرت میں ڈبو کر خود بھی فطرت کے سامنے تماشا بن چکے تھے۔ ماہ بدنوں کی جھرمٹ، موسیقی کا جادو، نیم تاریک متوازن فضا۔۔۔ ختم ہوا تو ہم نے اس سب سے آزادی پائی۔۔۔ مگر کہاں؟۔۔۔ دل کا ایک ٹکڑا کاٹ کے وہیں رکھ آئے۔۔۔ پیرو ہارو کی قسم۔

4۔ نیچی لڑ گماں کاری نہ باڑ شوئے کپتغیں چی آں

ہماری اگلی نظارہ گاہ چینی تہذیب کی جائے پیدائش یعنی **Yellow River** تھا ۔ چین کا دوسرا بڑا دریا، دریائے زرد۔ یہ نام اسے اپنے گدلے پانی کی وجہ سے ملا۔

دوستوں نے بتایا کہ چونکہ ''**Yellow River**'' یہاں، ان کے شہر اور صوبے میں بہتا ہے اسلئے وہ فخر سے اپنے علاقے کو ''**House of Yellow River**'' پکارتے ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ یہ دریا چینی تہذیب کی جائے پیدائش ہے، قدیم ترین چینی الفاظ یہیں دریافت ہوئے ہیں۔ اور شاہی چین کی ابتدا اسی دریا کے کناروں پہ ہوئی تھی۔

یہ دریا مغربی چین میں کوئنگھائی صوبہ کے بلند پہاڑوں سے نکلتا ہے۔ وہاں سے یہ مشرق کی طرف بل کھاتا جاتا ہے اور نو صوبوں، جی ہاں 9 صوبوں میں سے گزرتا ہوا صوبہ ہینان آتا ہے اور وہاں سے ہوتے ہوئے ''بوہائی'' سمندر میں گر جاتا ہے۔ آپ جب بھی چینی لوگوں سے لفظ ''دریا'' سنیں تو سمجھ لیں کہ وہ دراصل اسی کا نام لے رہے ہیں۔ اس کی لمبائی

تین ہزار چار سو چھ میل ہے۔(ییجی محض 290 میل لمبا ہے)۔

توکلی مست نے دریائے ییجی کی اُن تباہ کاریوں کو شدت سے محسوس کیا تھا جو وہ سیلاب کے موسم اپنے کناروں پہ آباد انسانوں پہ مسلط کرتا ہے۔ مست کے ہاتھ اور کیا تھا، سوائے ارمان کے، سوائے خواہش کے، سوائے دعا کے۔ چنانچہ وہ انسان دوست دانشوریوں دعا مانگتا ہے:

مست نے دریا ئے ییجی کے کنارے آباد قبائل کو دعا دی تھی
ییجی خواہ کتنے بڑے سیلاب لائے تمہاری چیزوں کو بہا کر نہیں لے جائے گا

انہی سیلابوں کی تباہ کاریوں کے باعث دریائے زرد ''چین کا دکھ'' بھی کہلاتا ہے۔ دریاؤں کے کناروں پر آباد لوگوں کو دریا اور اس کی طیش بھری مہربانیوں کا پتہ ہے۔ ہم خود چاکر کور کے دھانے رہتے ہیں۔ ہم بار بار اونٹوں پہ سفر کی وجہ سے دریائے ییجی کی کرم نوازیاں بھی جانتے ہیں، ہمیں مست توکلی کی سندھ و ہندیاتروں پہ مشتمل شاعری نے بھی دریاؤں کے بارے میں بہت ایجوکیٹ کر رکھا ہے۔ اور آج ہم اندرونِ شہر کی گلیوں میں سے گزرتے ہوئے بالآخر اس مہان دریا کے کنارے پہنچے جسے دریائے زرد کہتے ہیں۔ اور جسے ''چین کا دکھ'' کہتے ہیں۔ اسلیے کہ ریکارڈ کے مطابق اس دریا نے گذشتہ 4000 برس کے دوران 26 بار اپنا راستہ بدلا ہے۔ شمالی چین کا میدان ہموار ہے، اسلئے لوگوں نے دریا کو قابو کرنے کیلئے پشتے اور پھر مزید پشتے تعمیر کیے۔ برسوں کے سفر میں دریا نے اپنی تہہ میں بہت مٹی بچھا دی ہے جس سے دریا کی تہہ بلند ہوگئی۔ اس لئے انقلاب سے قبل تک یہ دریا بار بار سیلابی زمانے میں اپنے کناروں کو پھاڑ ڈالتا اور ہر بار اپنا رخ بدل ڈالتا۔ چنانچہ دریا کے میدانی علاقوں کے رہنے والوں پہ نا قابلِ بیان مصیبتیں ٹوٹتی تھیں۔ یہ مصیبتیں فیوڈل سرداروں کے ظلم وتشدد کے علاوہ ہوتیں۔ انقلاب کے بعد اس دریا پر کئی بڑے بڑے ڈیم تعمیر کئے گئے۔ اب، سیلاب کو کنٹرول کرنے اور مٹی جمع ہو جانے پر مکمل طور پر قابو پالیا گیا ہے۔ اس منہ زور دریا کو کانٹوں بھرے لگام ڈال کر آبپاشی کیلئے پالتو بنا دیا گیا۔ اب یہ بہت شرافت سے بجلی پیدا کرتا ہے۔

بلاشبہ انقلاب درویشوں، صوفیوں اور ولیوں کے ارمانوں کی تکمیل کرتا ہے

5۔چین کی اوہام پرستی

ژینگ ژواسی دریائے زرد کے کنارے واقع ہے۔ اس مقام کو ''ٹورازم زون'' قرار دیا گیا ہے۔ ہم نے قریب جا کر دیکھا، واقعی یہ ریت سے بھرا دریا ہے۔ ہمارے گائیڈ بتاتے ہیں کہ اگر اس سے ایک گلاس پانی لو تو اس میں سے آدھا گلاس ریت نکلے گی۔ یہ دریا زرخیز مٹی کی بڑی مقدار کی وجہ سے دنیا بھر میں اول نمبر پر ہے۔

دریا کے نظارے کے دوران چھوٹی قد کے دو کوہانوں والے اونٹ، کجاوہ سجائے ہماری سواری کے منتظر تھے۔ دل للچایا کہ شہ مرید کی سواری پہ بیٹھ کر اس کی سنّت یہاں دور دیس میں دوہرا لوں۔ مگر ہم نے اتنے بڑے ادیبوں کے درمیان اپنے اندر کے چھوٹے بچے کو سختی سے دبا دیا۔ ایسا کر کے ہم ایک دن میں بڑے ادیب تو کیا خاک بنتے، مگر ایک بلوچ کا گلا گھونٹ بیٹھے۔ اونٹ، بگ، بگ جت، کارواں، گھنٹیاں، پنوں، گوہر جتنی۔۔۔!! قارئین، کبھی بھی اپنے اندر کے بچے کو نہ مارنا۔

اس دریا کی بدولت صوبہ ہینان چین میں زراعت کے لحاظ سے دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ یہاں گندم، کپاس، تمباکو، منگ پھلی اور مکئی کی زبردست پیداوار ہوتی ہے۔ یہاں گھریلو جانور بھی چین بھر میں زیادہ سب سے زیادہ ہیں۔

دریا کنارے ہمیں Unicorn نامی جانور کا، لوہے کا بنا ایک بہت بڑا مجسمہ نصب نظر آیا۔ یہ کالے رنگ کا ایک عظیم الجثہ مجسمہ ہے۔ اس جانور کی تصویر ہم بہت دیکھا کرتے ہیں اس لئے کہ یہ دوائیوں کی بہت بڑی ملٹی نیشنل کمپنی ''ویلکم'' کا نشان ہے۔ مگر یہ معلوم نہ تھا کہ اصل میں یہ کیا ہے۔ Unicorn یعنی یک سینگھا ایسا بڑا دیومالائی جانور تھا

جس کا سر، گردن اور جسم گھوڑے کا تھا، پچھلی ٹانگیں بارہ سنگھے کی تھیں اور دم شیر کی اور مخروطی لمبا سینگ اسکی پیشانی میں سے نکلا ہوتا۔ یہ بہت بڑا جانور ڈائنوسار کی مانند ارتقا کے قانون کی پاسداری نہ کرنے کے باعث اپنا وجود ختم کرابیٹھا۔**Survival of the Fittest** کا تماشا دیکھیے کہ **Unicorn** اور ڈائنوسار تو زندہ نہ رہ سکے البتہ چوہا، مینڈک اور چیونٹی زندہ رہے!!۔

Unicorn شاہی درباروں میں قوت و طاقت کا مظہر بنا رہا اور بادشاہ نے اسے خود سے مشابہ بنایا۔ یہاں میاؤ بتا رہی تھیں کہ یہ بہت بڑا بت دریا کنارے اس لئے رکھا ہوا ہے کہ یہ اپنی کرامت کے ذریعے سیلاب کی صورت میں لوگوں کو تکالیف سے بچانے کی ضمانت دیتا ہے۔(شرک کرنے والے زراعت پیشہ لوگ!)۔انسان کبھی کبھی بہت ہی چھوٹا، بہت ہی حقیر، اور بہت ہی غیر اہم بن جاتا ہے، خواہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں کتنا ہی ترقی یافتہ ہو۔ انسان ابھی تک اتنا غیر اہم اور اتنا کمزور ہے، اپنی تقدیر کا خود مالک بننے میں اس قدر نا اہل ہے کہ ہم اکثر تاریکی سے مدد لینے پر مجبور ہو جاتے ہیں، اور نامعلوم دنیا سے مدد مانگتے ہیں۔ حالانکہ چین میں **94** فیصد آبادی کسی مذہب کو سرے سے مانتی نہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی میں یہ ملک دنیا کے ترقی یافتہ ترین ممالک میں سے ایک ہے مگر پھر بھی انہیں دریائے زرد کے سیلاب سے ایک معمولی **Unicorn** کا مجسمہ بچائے گا!! حیرت ہے۔

6۔وطن کشمیر

ہم **Yellow River** کے نظاروں کو اپنی یادداشت کی ہارڈ ڈسک میں خوب محفوظ کر کے دوپہر کا کھانا کھانے لوٹے۔ وہی خوبصورت سڑکیں، وہی نظم و ضبط والی قوم۔ مزہ آتا ہے دیکھ کر۔ اس بار ہم رہائشی فلیٹوں پہ مشتمل عام انسانوں کے علاقے سے گزرے جہاں ہمیں زندگی، اپنے بھرپور انداز میں نظر آئی۔ یہاں گلیاں نسبتاً کم فراخ ہیں، سڑک پر گڑھے بھی موجود ہیں، اور لوگ کچھ کچھ انفارمل بھی نظر آئے۔ پگوڈے اور پگوڈوں پر خوش بختی لانے والے جانوروں کے چھوٹے چھوٹے مجسموں (بتوں) کی قطاریں تھیں۔ محنت کش لوگوں کے محلّوں کی اپنی دنیا ہوتی ہے۔ عورتیں ہر طرح کا کام کر رہی تھیں۔ حتیٰ کہ ایک شیر کی بچی تو مسافروں سے بھری بہت بڑی کوچ بس چلا رہی تھی۔

یہاں ہمیں جا بجا تربوز بکتے نظر آئے۔ یہ لوگ تربوز بہت عجیب طرح سے بیچتے ہیں۔ تربوزوں بھرا پورا ٹرک کسی ایک جگہ کھڑا کرتے ہیں اور ایک کٹا ہوا لال لال تربوز ان تربوزوں کے انبار کے اندر نمایاں کر کے رکھ دیتے ہیں۔ لوگ تربوز بڑی رغبت سے خرید کر وہیں کھاتے ہیں یا سائیکل پر رکھ کر ساتھ لے جاتے ہیں۔ دلچسپ ہے کہ یہ نومبر کا آخر ہے، سردیاں زوروں پر ہیں اور تربوز عام ہیں۔ ہم نے یہ نہ پوچھا کہ آیا بیجنگ میں ملنے والا تربوز وہیں کا ہوتا ہے یا وہ بھی **700** کلومیٹر دور یہاں ژنگ ژو سے جاتا ہے۔

دوستوں نے پھر ایک بہت ہی اچھے ہوٹل میں زبردست ظہرانہ (بارہ بجا آنہ) کھلایا۔ میں نے ایک جیغ (بلوچی کشیدہ کاری کا ایک نمونہ) اپنی میزبان میاؤ کو تحفتاً دی۔ میں اس کی حیرت اب بھی محسوس کر سکتا ہوں، میں اس کی بے پایاں مسرت کو اب بھی ناپ سکتا ہوں اور اس کے پہننے کا طریقہ سننے کا انداز، اب بھی میرے ذہن میں عکس بند ہے۔ انسان کتنے پاک ہوتے ہیں، کتنے سادہ اور کتنے پرخلوص ہوتے ہیں۔ انسان زندہ باد۔ اور پھر جس انسان کا نام میاؤ تھا اور جب وہ ہنستی تھی تو مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے ڈائننگ ہال زیادہ روشن ہو جاتا۔ ایسی میاؤ تو بالخصوص زندہ باد۔

کھانے کے بعد وہ لوگ ہمیں عام بازار گھمانے لے گئے۔ اس لئے کہ ہمارے پاس ایرپورٹ جانے سے کچھ وقت فالتو بچا تھا۔ بازار کیا تھا لگتا تھا ہم اپنے مستنگ آ گئے ہوں۔ وہی ہماری آپ کی جانی پہچانی دکانیں، وہی سٹورز، وہی انسان اور وہی انسانی ضروریات۔ انڈے وہی، ٹماٹر وہی، نمک وہی۔ یہ تو سبی کا چاکر روڈ تھا، یہ تو ڈیرہ غازیخان کا ٹریفک چوک تھا، میرا بلوچستان کہاں کہاں یاد آ جاتا ہے۔ ہمیں چین میں یاد آیا اور محترم اکبر بارکزئی نے دمشق میں بلوچستان کو یاد کیا۔

دمشق ءِ شہر مثل اے جنّتا ایں
بلے قربان پہ خضدار باثاں
وتی گزّو کہیر وشنگرانی
اگاں فکرا مہ باں ''فی النار'' باثاں

ترجمہ:

دمشق کا شہر مثلِ جنت ہے
مگر میں تو خضدار کے قربان جاؤں
اپنے گز کہیر اور شنگر نامی درختوں کو
اگر یاد نہ کروں تو خدا کرے ''فی النار'' ہو جاؤں

شراب کی دکانیں البتہ پاکستان میں نہیں ہیں کہ ضیاءالحق کی بدروح، دانت نکالے ہر بازار کے سرے پر ابھی تک شعلے پھنکار رہی ہے۔

7۔ ماہر کس ڈولے پنڈ وخوں

اللہ بخش بزدار

بازار میں ہم نے ایک شخص کو ردی، کاغذ اور چھلکے چنتے دیکھا۔ ہمیں سخت حیرت ہوئی۔ پھر یہیں چلتے چلتے ہمیں مختلف اوقات اور مختلف جگہوں پر تین بھکاری ملے۔ ایک مرد اور دو عورتیں۔ ان کے مانگنے کا انداز بہت ہی پیشہ ورانہ تھا۔ اور ہم حیران تھے کہ 40 برس تک بھیک نہ مانگ کر اچانک اس قوم کے افراد کو اس طرز کا بھیک مانگنا سکھایا کس نے۔ وہ با قاعدہ اپنے جسمانی نقائص کی نمائش کر رہے تھے، ان کے ہاتھ میں کٹورا ہوتا ہے۔ وہ اپنے گندے پھٹے پرانے لباس میں آپ کے سامنے آ کر باقاعدہ دوزانو ہو کر بیٹھ جاتا ہے اور بہت ہی قابل ترس بن کر چینی زبان میں کچھ بڑ بڑاتا رہتا ہے۔ کتنی بڑی قوم کی کتنی بڑی زبان کی کتنی بڑی توہین ہے یہ۔ چین میں تو لوگ آخرت، قیامت، جنت، دوزخ اور جزا و سزا پہ عقیدہ نہیں رکھتے۔ پھر پتہ نہیں وہ بھکاری کیا بولتے ہونگے؟ کیسے خیرات دینے والے کا دل نرم کرتے ہونگے!۔

عورت کے ساتھ ایک بچی بھی تھی۔ ننگے پیر، پھٹے کپڑے، بال بکھرے، اَن دھویا منہ۔ عورت نے بچی کو آگے دھکیلا۔ اور وہ ہم سے چپک گئی۔ کوٹ کا دامن جھٹکوں سے نیچے کھینچتی ہوئی وہ معصوم کچھ بولتی جاتی تھی، رٹے رٹائے الفاظ تھے۔ ہم چونکہ ایک اور اہم مسئلے پر میزبانوں سے الجھ پڑے تھے اس لئے یہ پوچھ ہی نہ سکے کہ بھکارن کیا کہہ کر مانگ رہی ہے۔

ہمارے لئے تشویش ناک بات عوامی جمہوریہ چین میں بھکاری کا موجود ہونا تھا۔ بھکاری دو ہوں خواہ سو، چین اور بھکاری؟ میزبان اچھے خاصے جھینپ گئے۔ اور اپنی خفت مٹانے کے لئے الٹا ہم سے پوچھنے لگے کہ:

''کیا پاکستان میں بھی بھکاری ہیں؟''

ہم نے کہا:

''امریکہ میں بھی ہیں، سعودی عرب میں بھی، ہندوستان میں بھی، روس میں بھی۔

اور صرف بھکاری ہی نہیں بلکہ جیب کترے بھی ہیں، چور، ہیرو ئنچی، بدعنوان، دھوکے باز، خود غرض، جواری، جسم فروش، جرائم پیشہ، سمگلر، بلیک مارکیٹنگ والے، الیکشن میں دھاندلی کرنے والے۔۔۔ سب موجود ہیں۔ آپ کو اس سے مطلب؟ شریف آدمی! یہ سارے معاشرے قائم ہی لوٹ، استحصال اور منافع خوری پر ہیں۔ ہر شخص دوسرے کی جیب پر نظریں جمائے اسکی پونجی ہتھیانا چاہتا ہے۔ یہ اس لئے ہے کہ ان معاشروں میں طبقاتی نظام قائم ہے اور یہ ساری برائیاں طبقاتی اور سرمایہ دارانہ نظام کے بنیادی اجزا ہیں۔ اور اُس طبقاتی نظام کو ختم کرنے کی تو کوشش ہو رہی ہے وہاں۔ اُس پوری دنیا میں جدوجہد ہی بھکاری بنانے والے نظام کے خلاف ہو رہی ہے۔ بات یہ ہے کہ سوویت یونین میں بھکاری نہیں تھے، کیوبا میں نہیں ہیں، عوامی جمہوریہ کوریا میں نہیں ہیں۔۔۔ عوامی جمہوریہ چین میں بھی نہیں تھے۔ مگر اب آپ کے ملک میں، سوشلزم کے ملک میں بھکاری دیکھ کر رنج اور حیرت ہو رہی ہے‘‘۔

وہ بے چارہ ادیب اپنی حب الوطنی میں کیا کہتا؟۔ بس، اتنا ہی بولا: ’’مگر یہ تو Inevitable (ناگزیر) ہے!!‘‘۔

میں نے بھی اسی بے بسی میں کہا۔۔۔ ’’ہاں، Inevitable‘‘ ہے۔

8۔تھیوری آف ریلے ٹے وی ٹی

ژنگ ژو میں یہ ہمارے آخری گھنٹے تھے۔ پرواز میں ابھی کچھ گھنٹے تھے۔ لہٰذا ہم تفریحاً بازار گھومتے رہے، پھر اچانک میاؤ کی گہری مہمان نوازی ایک بار پھر جاگی۔ ہماری وہ نازک سی دوست جلد ہی ساتھ کی ایک دکان میں گھس گئی اور اسی تیزی سے ہم سب کے لئے ایک ایک قیمتی شوپیس خرید لائی۔ دوستی کا جذبہ انسان کا سب سے مقدس جذبہ ہے۔ احترام کا جذبہ سب سے اشرف جذبہ ہے۔ میں دوستی کے اس تحفے کو حفاظت سے اپنے وطن لایا اور اسے ممکن طور پر بہت عرصے تک بڑی حفاظت سے رکھوں گا۔

یاروں سے مل بیٹھنے کی ساعتیں کبھی بھی غیر معینہ نہیں ہوتیں۔ ملنا بچھڑنے ہی کا تو پیش لفظ ہوتا ہے۔ چنانچہ ہم کوسٹر میں سوار اپنے اچھے میزبانوں کے ساتھ الوداعی اور حسرت بھری باتوں میں مگن، پل بھر نہ لگا کہ ایئر پورٹ پہنچے۔ (پتہ نہیں اپنائیت کی عمیق ترین سطح پر جا کر جدائی کی رفتار میزائل جیسی تیز کیوں ہو جاتی ہے!)۔ البرٹ آئن سٹائن نے بہت آسان کر کے اپنی تھیوری آف ریلے ٹے وٹی یوں بیان کی:

’’اگر آپ ایک گرم سٹوو پر بیٹھے ہیں۔ تو آپ کو لگے گا کہ وقت بہت سست رفتاری سے چل رہا ہے۔ ایک منٹ آپ کو گھنٹہ لگے گا۔ اس لئے کہ آپ ایک گرم سٹوو پر بیٹھے ہیں۔ آپ کی حالت، وقت سے متعلق آپ کے تصور کو تبدیل کر رہی ہے۔

’’لیکن اگر آپ اپنی محبوبہ کے ساتھ بیٹھے ہیں تو گھنٹے گزر جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ محض چند سیکنڈ ہی گزر گئے‘‘۔(1)

ہم وقت کی عدم سکوت والی ابدی خصلت کو کوستے ہوئے آخری بار دوستوں سے گلے ملے۔ ہر شخص کا دل بھر آیا تھا۔ ہر آنکھ چھلکنے کی سرحد پہ تھی۔ ہم بس روئے نہیں۔۔۔ لیکن اگر کوئی نرم بات کہہ جاتا تو ہم پانچوں پاکستانی، اور چینی چاند چہرے باجماعت رو پڑتے۔ گہرے یاروں سے بچھڑتے وقت کوئی درندہ صفت ہی اس کے برعکس سوچ سکتا ہے۔

ہم ’’شنگھائی ایئر‘‘ نامی کمپنی کے چینی جہاز کے ذریعے ’’بیاباں گردشہ مرید‘‘ کے ٹمپلوں، اور جوانسال کے کھیتوں دریاؤں کی سرزمین سے مشینوں کمپیوٹروں اور سکائی سکریپر عمارتوں کے دیس، شنگھائی کے لئے روانہ ہو گئے۔

یہاں تحمّل کے مہلب پر کائنات بہت حسین ہے۔ اور، حسن توازن کا نام ہے۔ ہمارے اردگرد روزمرہ موجودات انفرادی بھی اور جمعی بھی اس کی گواہی دیتی نظر آتی ہیں۔۔۔

لیکن اگر حسن کے لاکھوں ذائقوں کو مجتمع دیکھنا ہو، توازن کا حتمی توازن دیکھنا ہو، ہارمنی کی ہارمونیم دیکھنی ہو، تو وہ آپ کو فطرت کی حسین ترین تخلیق یعنی عورت میں نظر آئے گی۔ عورت حسن، نزاکت، جاذبیت، اور شیدائیت کا مرکز ہے۔ مگر سرمایہ داری نظام میں طاقت وقوت کے حتمی مرکز یعنی پیسہ نے، کائنات کی اس متبرک اور حسین ترین وجود یعنی عورتوں میں سے بھی حسین ترین عورتوں کو یا تو سیٹھوں افسروں کی سیکرٹری بنا رکھا ہے یا ہوٹلوں، اداروں کی ری سپشن اسٹ بنا ڈالا ہے۔ اور یا پھر ہوائی کمپنیوں میں سے یہاں ''شنگھائی ائیر'' کے اس جہاز پر ائیر ہوسٹس کی صورت دے رکھی ہے۔ سو ہم ایک گھنٹہ تک اس مرکوز و مجتمع و مرتکز و مخمور و مسحور، اڑتے، یلغار کرتے، تھرکتے، پھیلاؤ پاتے، مکمل گرفت میں لیتے نسوانی حسن کو ''ایکسکیوزمی'' اور ''کافی؟ ٹی؟'' کی مسحور کن آوازوں میں بے حرمت ہوتے دیکھ دیکھ کر کڑھتے رہے۔

حوالہ جات

1۔ Osho : The Fullness of Emptiness 2004. صفحہ 163

چودھواں باب

مہر گڑھ کا تسلسل

1۔ شنگھائی ہی چین کا ماضی ہے

شنگھائی کا نام سن 960 سے چلا آ رہا ہے جب یہ محض مچھیروں کی ایک بستی ہوا کرتی تھی۔ چھ سو برس بعد 1554 میں شہر کے گرد ایک سات میٹر اونچی فصیل اور ایک بند تعمیر کی گئی تا کہ اسے جاپانی قزاقوں کے حملوں سے بچایا جا سکے۔ 1842 میں برطانوی فوجوں نے ان بے دفاع فصیلوں پر یلغار کر دی اور یوں ایک لحاظ سے شنگھائی کی قسمت جاگی۔ پہلی جنگِ افیون (1842-1840) کے بعد شنگھائی برطانوی علاقہ، امریکی علاقہ، فرانسیسی علاقہ، اور جاپانی علاقہ کے نام سے بانٹ دیا گیا۔ 1930 کی دھائی میں شنگھائی لکھ پتیوں، عظیم الشان گھروں، شاندار ریستورانوں اور عیاش ہوٹلوں سے بھر گیا۔ سارے کا سارا پیسہ غیر ملکیوں کا تھا۔ طاقتور غیر ملکی مالیاتی ادارے بشمول ہانگ کانگ اور شنگھائی بنکنگ کارپوریشن، شنگھائی میں قائم تھے۔ جنہیں برطانوی Honkers اور Shankers کہتے تھے۔ اسی 1920 اور 1930 کی دھائیوں میں شنگھائی غیر ملکی آقاؤں کے ہاتھوں تذلیل کے گڑھے میں پڑا ہوا تھا۔ چاروں طرف عیاشی تھی، گناہ تھا۔ افیون کے اڈے تھے، جوا کھیلنے کے ہال، مدھم روشنی والے چکلے......... اور یہ سب شان و شوکت، یہ گناہ و جرم چینی مزدوروں کی پیٹھ اور بازوؤں کے دم قدم سے ہو رہا تھا۔ شنگھائی کچی آبادیوں، ملاحوں، قلیوں، رکشہ ڈرائیوروں، اپاہج بھکاریوں، کم سن رنڈیوں، بیماری زدہ نوزائیدوں، ہڑتال کنندوں اور دانشوروں کا شہر تھا۔ اسے مشرق کا پیرس، چین کی طوائف اور مشرق کی ملکہ کہا جاتا رہا ہے۔

بلاشبہ شنگھائی ہی چین ہے۔ اسلئے کہ چینی ادیبوں کی اولین تنظیم یہاں بنی۔ چینی کمیونسٹ پارٹی یہیں بنی۔ لوہسون کی قبر یہاں، سن یات سین کا گھر یہاں، شہنشاہیت کا حشر نشر یہاں، فیوڈل ازم کی قبر یہاں۔ 1925 میں شنگھائی ہی میں 30 مئی کی تحریک شروع ہوئی جو کہ قومی سطح کی انقلابی ابھار کی شروعات تھی۔ یہی تحریک شمالی وار لارڈز کے خلاف انقلابی جنگ کی بنیاد رکھنے والی تحریک ثابت ہوئی۔ ان جنگی سرداروں کے خلاف کمیونسٹ پارٹی نے یہ نعرہ دیا تھا۔۔۔ ''سامراج کی مخالفت کرو، جنگی سرداروں کی مخالفت کرو۔ الغرض عوامی جدوجہد کا ہر نشاں ہر علامت یہیں پر ہے۔ یہیں تو نجاتِ آدم کا میدانِ

جنگ سجا ہے۔ یہیں نظریات کی جنگ لڑی گئی، اور آج بھی لڑی جا رہی ہے۔

2۔ شنگھائی ہی چین کا مستقبل ہے

شنگھائی ائیر پورٹ کے بارے میں ہم آپ کو کچھ زیادہ نہیں بتا پائیں گے۔ میں اور آپ جس جاگیرداری سماج میں رہتے ہیں وہاں پر سوائے مونچھوں کی لمبائی کے، گردن کی اکڑ کے، قتل کے اعداد و شمار کے کچھ اور تصور نہیں ہوتا۔ ہمارا آپ کا سماج شنگھائی ائیر پورٹ کی تفصیلات سننے کا بھی متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لئے جب بھی حالات اجازت دیں جا کر دیکھیے کہ سرمایہ داری اور سوشلزم کا نکتۂ اتصال کیا کیا حیرتیں پیدا کرتا ہے۔ بس میں ایک بات سناتا ہوں اور اندازہ آپ خود کیجئے۔ جس ائیر پورٹ پر ہر تین منٹ بعد (جی ہاں، عملاً ہر تین منٹ بعد) ایک ہوائی جہاز اترنے یا اڑنے کے لئے رینگنے لگے تو آپ اس کو کتنا بڑا ائیر پورٹ کہیں گے؟ اور اس شہر کو کتنا بڑا شہر کہیں گے؟۔

یہاں بھی ہمارا استقبال اسی گرمجوشی سے ہوا۔ اور ہم پھر کوسٹر کے ذریعے شہر کی جانب رواں ہوئے۔

شنگھائی اصل میں زبر لگا کر بولا جاتا ہے۔ یہ چین کا سب سے بڑا صنعتی اور تجارتی شہر ہے۔ دریائے یانگزی کے دھانے پر آباد چین کی نہ صرف سب سے بڑی بندرگاہ ہے، بلکہ اس کا مالیاتی مرکز بھی ہے۔ یہ جدید طرز کا بہت بڑا شہر ہے جس نے ایک کروڑ انسانوں کو اپنے دامن میں پناہ دے رکھا ہے۔ اس شہر کے علاوہ چین میں تین اور شہر ہیں جن پہ حکمرانی مرکزی حکومت کی ہے۔ اور وہ ہیں بیجنگ، تیان جن اور چونگ ہنگ۔

گوادر بندرگاہ کی طرح شنگھائی ڈیپ سی پورٹ کی توسیع کا پہلا مرحلہ بھی 2005 میں مکمل ہو گیا جس میں 15 میٹر طویل برتھوں کی تعمیر مکمل ہو گئی۔ اس کے کنارے سمندر بھی ہے، اور دریا بھی اس کا کنارہ بناتا ہے۔ دریائے ''ہوآنگ پو'' اس شہر کے بیچ سے گزرتا ہے جو کہ تاریخی مقامات اور قدرتی مناظر سے بھرا ہوا ہے۔ شنگھائی عہدِ جدید کی عظمتوں کا نشان ہے۔ یہ نازک اندام جدید میٹروپولس ہے جو زمینی، سمندری اور ہوائی آمدورفت کے نیٹ ورک میں وابستہ و پیوستہ ہے۔ یہاں کی ٹورسٹ انڈسٹری دنیا کی سب سے ترقی یافتہ انڈسٹری ہے۔ اگر بیجنگ میں سفارتخانے ہیں تو یہاں سارے صنعتی ممالک کے کونسل خانے ہیں۔ یہاں پاکستان کا کونسل خانہ بھی ہے۔

ہم اپنی خصوصی کوسٹر میں سوار شہر کی جانب رواں دواں ہیں۔ بلوچی زبان میں ہم عام بڑے شہر کو بندر کہتے ہیں۔ شنگھائی کے لئے لفظ کیا ہو، میں نے بہت پوچھا۔ مگر بلوچ جب لاجواب ہو جائے تو کہہ دے گا ''ملّی (چھوڑ دو)'' یا ''بلائے سئی ایں'' (بلا جانے) یا مخصوص ہنسی میں کہے گا ''تہ تہ پوتی آں پٹئے'' (تم تو بال کی کھال اتارتے ہو)۔ آیئے بال کی کھال اتارنا بند کر دیتے ہیں اور اردو میں سوچتے ہیں: ماوند گاؤں ہے، سبی قصبہ ہے، کوئٹہ شہر ہے، کراچی؟؟؟ ہے اور شنگھائی تو تین بار؟؟؟ ہے۔

شنگھائی شہر نہیں ہے یہ تو ذہن کے حدود سے بلند، امکانات کی سرحدوں سے اونچا اور انسانی اندازوں سے بہت پرے انسانی آبادی کا بلند ترین نمونہ ہے۔ سینکڑوں آسمان چھوتی عمارتیں ہیں، سینکڑوں فلائی اوورز ہیں اور صنعتیں تو لاتعداد ہیں۔ اس کی جیسی کشادہ سڑکیں دنیا میں کہیں اور نہیں ہونگی۔ ترقی کے لحاظ سے یہ دنیا کا اولین شہر ہے۔ امریکہ، یورپ اور ایشیاء کے کسی بھی شہر سے زیادہ ترقی یافتہ۔ جی ہاں، شنگھائی دنیا کا سب سے ترقی یافتہ شہر ہے۔

ہماری کوسٹر جس ہموار سڑک پہ فل سپیڈ کے ساتھ پونے گھنٹے تک دوڑتی رہی وہ ایک فلائی اوور تھا۔ سوچ کی سرحدیں محدود ہو جاتی ہیں، انسان کی عظمت کا قائل ہو جاتے ہیں آپ۔

راستے میں اس قدر کرینیں میں نے کام کرتے دیکھیں جتنی میں نے زندگی بھر نہ دیکھی تھیں۔اور پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ کرینیں دن رات کام کر رہی تھیں۔اس قدر تیز رفتار ترقی کرنے والے دو ہی تو شہر ہیں دنیا میں۔ایک شنگھائی اور دوسرا بیجنگ۔

سامان ایک بہت اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں رکھا۔جس کا نام ہے Equatorial Shanghai۔ڈکشنری میں اس کے مطلب ہیں۔''خطِ استوا سے متعلق''۔ یہ ہوٹل اپنی نفاست اور ذوقِ کمال میں ثانی نہیں رکھتا۔وہی کارڈ ڈالنے والے تالے تھے۔کمروں کی وہی وسعت تھی۔شہر کی جانب کھلتی پوری دیوار شیشے کی تھی اور اس میں ایک شہرِ پُر بہار کے آثار بلند ہو تے چلے جاتے تھے۔کھڑکی سے ہمیں نہ گلیاں نظر آتی تھیں اور نہ بازار، اس لیے کہ وہ تو بہت نیچے رہ گئے تھے۔تیسویں منزل سے تو اگلی عمارت ہی کی تیسویں منزل نظر آسکتی تھی۔

آس پاس عمارتوں کی روشنی کے سبب کمرہ تاریک ہوتا ہی نہ تھا۔ہم اس ہوٹل کے بارے میں مزید کچھ نہیں کہتے۔صرف اتنا بتادیتے ہیں کہ ہم میں سے ہر شخص کو علیحدہ کمرہ دیا گیا اور ہر کمرے کا ایک دن کا کرایہ 220 ڈالر کا تھا، جی ہاں، ایک دن کے تیرہ ہزار دوسو روپے۔ہم کتنے بڑے مہمان تھے یہاں۔وہ کتنے بڑے میزبان تھے وہاں۔ادب زندہ باد۔ قلم زندہ باد۔

پندرہ منٹ آرام کرنے کے بعد ہم پھر اپنی چھوٹی بس میں تھے۔ہم پر تکلف کھانا کھانے اور اس کے بعد شہر کا رات کا نظارہ کرنے نکلے۔''شنگھائی بائی نائیٹ!'' بہت حسین، بہت دلکش.........چھوڑیے، یہ مناظر میرے بیان سے باہر ہیں۔لہٰذا مختصر یہ کہ واپس آکر سو گئے۔

شنگھائی کیپٹلزم کے مرض کا بھی شکار ہے۔اس لئے کچھ قدریں ہم میں مشترک ہیں ۔مثلاً ہوٹل کی لانڈری سے پوچھا کہ ایک شرٹ دھلوانا ہے، کتنا پیسہ لگے گا۔جواب آیا 40 یو آن (320) روپے۔ایک شرٹ کی دھلائی کے 320 روپے!!۔آپ ہوتے تو کیا کرتے؟ بالکل ٹھیک، میں نے بھی وہی کیا۔بلوچی گزارہ کر لیا۔اسی شرٹ پر دن گزارا اور اگلے روز عام بازار سے اس دھلائی والے پیسوں سے بہت کم قیمت پر ایک نئی شرٹ (اور وہ بھی دس آدمیوں کی مشترکہ پسند کردہ) خرید لی۔ایک بات البتہ ضروری ہے کہ آپ وہاں شرٹ صرف گردن کی ناپ پہ بالکل نہ خریدیں۔بلکہ گردن والا ناپ بھی بتادیں اور ساتھ میں بازو کا بھی۔اس لئے کہ جو شرٹ میں نے خریدی اس کی گردن والا معاملہ تو ٹھیک نکلا مگر آستین چھوٹی نکلی۔چینی اور ویت نامی لوگ لمبے نہیں ہوتے۔

یہاں باقی شہروں کی طرح ہمیں مرغ کی اذان کے وقت اٹھنا نہیں پڑا۔انہوں نے ہمیں صبح آٹھ بجے کی بجائے نو بجے ہوٹل سے باہر آنے کا کہا۔وگرنہ ہمیں تو جنکشی یو کی ہیڈ ماسٹری نے ان پورے نو دس دنوں میں ٹکنالوجی کے ڈنڈے سے ہانک ہانک کر صبح سات بجے ناشتے کی میز پر بھرتی کروا رکھا تھا، وہ بھی ٹائی لگا کے۔یعنی ہم اس پورے سفر میں ہر روز صبح چھ بجے جگائے گئے تھے۔خوشی خوشی تو ہم ہر صبح پانچ بجے جاگا کرتے ہیں مگر زبردستی تو اچھی نہیں ہوتی نا!!۔گراں خواب چینیوں کو دیکھو، دوسروں کو جگاتے پھرتے ہیں۔تقدیر نے جب جگا دیا تو کیا کیا رنگ دکھائے ان افیونیوں نے۔ ماؤ کا انقلاب، ڈینگ سیاؤ پنگ کا ریفام اینڈ اوپن نیس، ایک ملک دو نظام، اور اب پھر سوشلزم و کیپٹل ازم کا Convergence۔اور پھر نتیجے میں بے پناہ ترقی۔مذکورہ ہر ایک واقعہ پہ ساری دنیا ہڑبڑا کر جاگتی رہی ہے۔مگر آج ہم پانچ پاکستانی ہڑبڑا کر جاگنے اور جھٹ پٹ تیار ہونے کی بجائے پاکستانی سٹائل پہ خراماں خراماں اٹھے۔

میں نے کمرے میں موجود الیکٹرک کیٹل سے اپنے لئے بیڈ ٹی کے بطور کڑک کافی بنا کر نوش فرمائی، نہایا دھویا، اور ٹائی ڈال کر مقررہ وقت سے آدھ گھنٹہ قبل ہوٹل کی لابی میں آن موجود ہوا۔آج شنگھائی میوزیم دیکھنے کا پروگرام تھا۔

3۔شنگھائی میوزیم

شنگھائی میوزیم کا بیرون اور اس کا صدر دروازہ ہی بہت خوبصورت ڈیزائن میں تعمیر کئے گئے تھے۔ہمیں اتنا اچھا لگا کہ کئی تصویریں ہم نے یہاں بنا ڈالیں۔اس عجائب گھر کی چار منزلیں ہیں۔خودکار سیڑھی آپ کو لے کر چلتی ہے۔اگر آپ بلند ترین منزل پہ کھڑے ہو کر نیچے دیکھنے لگیں تو خودکار سیڑھی چلتے دیکھ کر بھی آپ پورا دن گزار سکتے ہیں۔بالکل اسی طرح جیسے کہ ہمارے دیہاتی کوئٹہ آ کر جناح روڈ کے منان چوک پہ کھڑے ہو کر متحیر انداز میں ٹریفک دیکھ دیکھ کر ٹائم پاس کرتے ہیں۔

4۔آدم و آلہ

ہماری گہری خواہش اور پکا یقین تھا کہ ژنگ ژو کے میوزیم کی طرح یہاں بھی ہمیں بطور گائیڈ کوئی ، پروں والی ''دوشیزہ'' ملے گی (ہائے شاہ محمدِ مشرق زدہ۔اڑے ترقی یافتہ معاشروں میں دوشیزہ، شیر خوار بچی کے علاوہ کوئی نہ ملے گی!) دراصل اس میوزیم میں ہماری آنکھوں کے لئے گناہ کرنے کی منصوبہ بندی تھی ہی نہیں، لہٰذا بچ گئے۔یہاں ہمیں ''احساسِ مروت کو کچلنے'' والے آلات کے حوالے کر دیا گیا۔آلات ہوتے کیا ہیں؟ آلات کام کی اہلیت میں سہولت دینے والے اوزار ہوتے ہیں۔اور یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ کام کی اہلیت صرف اور صرف انسان کی ہے۔کام وہ ہے جو جبلت کی بجائے شعوری ارادہ کے ساتھ کیا جائے۔اس طرح گدھے، بیل، کمپیوٹر اپنی تمام تر مشقت و پیداواریت کے باوجود کام کی اہلیت نہیں رکھتے۔یہ اہلیت اشرف المخلوقات ہی کی وصف ہے۔اور اس اہلیت کو تقویت دینے والی جاندار اور بے جان اشیاء کو آلات کہتے ہیں۔چنانچہ یہاں ہمارا گائیڈ، انسان کی بجائے ایک آلہ تھا۔ہم نے پہلی بار آلہ کے اس سائنسی تعریف کو مسترد کرتے ہوئے یہ اضافہ بھی کیا کہ آلات کم از کم شنگھائی میوزیم میں سیاحوں کے دشمن ہوتے ہیں۔جو نیلے پروں والیوں کی جگہ لیتے ہیں۔

ہمیں ٹکٹ کے ساتھ ہی یہ آلہ دیا گیا۔یہ گردن سے لٹکانے والا آلہ تھا۔خوبصورت چمکتا، دیدہ زیب پلاسٹکی گائیڈ ۔۔۔بہشت میں ملنے والی حوروں اور شراب کی بوتلوں جیسا گائیڈ۔اس کارڈلیس فون کی طرح کے بنے ہوئے آلے میں صفر سے لے کر نو تک ڈائل کرنے والے بٹن موجود ہیں۔ایک بٹن کینسل یا کلیر کرنے والا ہے۔ایک آواز کو کم یا زیادہ کرنے والا والیم والا بٹن ہے۔اسی طرح ایک بٹن فارورڈ کرنے کا اور دوسرا ریوائنڈ کرنے والا ہے۔ایک بجانے (**play**) کا ہے اور ایک **pause** کا۔

ہوتا یہ ہے کہ یہاں نوادرات پہ کوڈ نمبر دیئے گئے ہیں۔چنانچہ اس میوزیم میں رکھا جو بھی آئٹم آپ کو اچھا/دلچسپ/عجیب لگے اور آپ اس کے بارے میں تفصیلات جاننا چاہتے ہوں تو اس آئٹم پہ جو نمبر چسپاں ہو آپ اپنے آلے پہ وہی نمبر ڈائل کر کے **play** کا بٹن دبا کر اپنے کان سے لگا دیں۔وہ آلہ فون کی طرح آپ کے کان میں اس آئٹم کا مذکر مونث، آگا پیچھا نسل، خاندان سب کچھ بیان کرتا جائیگا۔اگر آپ اس تفصیلی بیانیہ کو بکواس اور غیر ضروری سمجھ کر آگے والا بیان سننا چاہتے ہیں تو آپ فارورڈ کا بٹن دبا کر آگے کی تفصیلات سنتے جایئے۔اور اگر کوئی بات بہت پسند آئی ہو تو ریوائنڈ کر کے تفصیل دوبارہ سنئے۔(واہ ڑے سرکار واہ!)

5۔سب کچھ سمّو کا

اس میوزیم میں سات گیلریاں ہیں؟ کانسی گیلری، سکلپچر گیلری، سیرامک گیلری، سکّوں کی گیلری، قومیتوں کی گیلری، جیڈ گیلری اور فرنیچر گیلری۔ چار منزلہ عمارت میں آپ جس گیلری میں دلچسپی رکھتے ہیں اس میں چلے جائیں اور اپنی آنکھوں اور آلے کے ذریعے علم کے خزانے سمیٹتے جائیں۔

ہم نے فرنیچر گیلری، مجسموں والی گیلری، سکّوں کی گیلری اور قومی اقلیتی گیلری دیکھنے کی ٹھان لی۔

قدیم چینی مجسموں کی گیلری پہلی منزل پہ ہے جہاں قدیم ترین چینی ثقافت کے درخشاں نمونے موجود ہیں۔ کانسی سے بنے شاہکار برتن، مٹکے، شراب کے جام۔۔۔اور پھر ایک تحائف خریدنے کی دکان۔ یہاں پہ ایک ریسٹورنٹ ہے اور ساتھ ہی کتابوں کی ایک دکان۔

فرنیچر گیلری چوتھی منزل پر ہے۔ جہاں منگ اور قنگ خاندانوں کے عہد کا خوبصورت فرنیچر رکھا ہے۔ اظہار صاحب ہر میز اور سنگھار میز کے سامنے بت بن کر کھڑے ہو جاتے۔ اور ہمیں انہیں آگے سرکا دینے میں بھٹوئی اسلامی سوشلزم، ضیاء الحقی کوڑے، نواز شریفی بریف کیس اور مشرفی روشن خیالی کا ہر ہر نسخہ استعمال کرنا پڑا۔ اسی منزل پہ چینی جیڈ کے نمونے بھی تھے۔ یہ سخت، سبز اور نیلے رنگ کا قیمتی پتھر ہے جو چینی مجسمہ سازوں کا محبوب ترین پتھر ہے۔ وہ ہزاروں برسوں سے اسے تراش کر عجائبات تخلیق کرتے آئے ہیں۔ جیڈ گیلری میں تین ہزار برس پرانی کاریگری بھی تھی جو ابھی تک پر بہار تھی۔۔۔اور پانچسو برس پرانے نمونے بھی۔ ان پر سے نظر کہیں اور جاتی نہ تھی۔۔۔ دل کرتا تھا کہ سارا کچھ لے جاؤں اور ایک انسان کے قدموں میں گرادوں۔۔۔مگر نہیں۔ اس سب کو یہیں رہنا چاہیے تاکہ میرے جتنے لاکھوں انسان یہی آرزو کرتے رہیں اور پھر اسی فیصلے پہ پہنچتے رہیں کہ۔۔۔اس سب کو یہیں رہنا چاہیے۔

قومی اقلیتوں کی گیلری چوتھی منزل پر ہے۔ ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ چین 56 نسلوں پہ مشتمل ملک ہے۔ اور یہ ساری مختلف نسلی تہذیبیں مکمل بقا اور پیوستگی باہم کے پراسیس میں خوبصورت چینی عظیم کلچر سامنے لاتی جاتی ہیں۔ وہ آبادی یا اپنے علاقے کے رقبے سے قطع نظر برابری کی حیثیت میں ریاستی امور چلانے میں حصہ لیتی ہیں۔ ہر اقلیتی قومیت نیشنل پیپلز کانگریس میں نمائندگی رکھتی ہے۔ جو کہ عوامی جمہوریہ چین کے ریاستی اقتدار کا بلند ترین ادارہ ہے۔ جبکہ ہم صرف چار چھ ہیں مگر عرصے سے، اور ابھی تک ایک دوسرے کی جڑیں کاٹنے میں لگے ہیں۔

مجھے منچوریائی ثقافت نے اپنی طرف کھینچ لیا۔ ان کے لباس ہماری طرح شکار اور لڑائی کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرتے ہیں۔ ہم نے یہاں تبت کے ایک قبائلی کا مجسمہ دیکھا۔ وہ ہمیں بہت اچھا لگا کہ اس نے بھی بلوچ کی طرح ''شش ہتھیار'' پہن رکھے تھے۔ میں نے اس کے ساتھ کھڑے ہو کر تصویر کھچوائی (اللہ جانتا ہے کہ مجھے بالاچ بننے کا قطعاً شوق نہیں ہے۔ نہ ہی میں 'آئیڈیل' بلوچ عہد کی دوبارہ آمد چاہتا ہوں۔ بس اپنی ثقافتی تاریخ سے گہری محبت ہے اور میں اسے اکیڈمک، جمالیاتی اسباب اور اپنی وابستگی کے طور پر فخریہ عزیز رکھتا اور بیان کرتا ہوں)۔

پھر ہم نے تارا تبّتی قومیت کا ایک مجسمہ دیکھا۔ یہ چینی بدھ مت کی تبّتی شاخ کا مجسمہ تھا۔ یہ ایک دیوی تھی جس کی سات آنکھیں ہیں۔ میں نے اس گیلری میں گاؤشان قومیت کی ایک کشتی دیکھی جس پر رنگین پینٹ اور کندہ کردہ ڈیزائن تھی۔ یہ خوبصورت کشتی تائیوان صوبے کے لوگوں کی بنائی ہوئی ہے۔ اڑے سیدھی بات ہے یار۔ مجھے اپنا بلوچ ساحل یاد آیا۔۔۔اور ٹوٹ کر یاد آیا۔

ہم نے اس میوزیم میں کچھ عجیب باتیں نوٹ کیں۔ اس میوزیم کی دیکھ بحال کرنے والی نفری بہت بڑی ہے اور عورتوں مردوں پر مشتمل سینکڑوں لوگ ہر گھنٹہ میوزیم کی

مکمل صفائی کرتے ہیں۔حتیٰ کہ ایک پلاسٹک کے چھوٹے سے درخت کی صفائی کرتے ایک عورت نظر آئی جو بھگوئے ہوئے کپڑے کے ساتھ اس کے ایک ایک پتے کی صفائی کر رہی تھی۔۔۔جس ملک میں انسان تو انسان ایک پلاسٹک کے پتے کی اس قدر خبرداری کے ساتھ دیکھ بحال کی جاتی ہو اس قوم کو شیطان اعظم یعنی امریکہ کیا شکست دے سکے گا۔اُس نے کمیونسٹ چین کے بارے میں کچھ نہ کچھ تو ضرور سوچا ہوگا اور برا ہی سوچا ہوگا.....اور اگر نہیں سوچا ہوگا تو لعنت ہے اس کی شیطانیت پر۔تب تو اس سے بڑا اور خاندانی شیطان تو ہمارا ضیاء الحق تھا جس نے اپنے چالیس چوروں کے ساتھ اپنے شمالی پڑوسی کے گھر میں ہر خیر کو شر میں بدل ڈالا تھا۔ ہمارے ملاّؤں نے ملاّنی بے نظیر اور ملا نصیر اللہ بابر کی معیت میں وہ وہ چانٹر کیہ پن کیے کہ دنیا بھر کے میکاولی ششدر و دنگ رہ گئے تھے۔اور یہ لومڑی پن اس منطقی انجام کو پہنچا جہاں ہڈی ہڈی جدا ہو کر، عضلہ عضلہ زندہ جل کر، بہاولپور کی سرزمین میں فیوڈلوں کی گناہگار راکھ سے مل گیا۔۔۔اور اگر امریکہ چین کے خلاف کوئی منصوبہ رکھتا ہے تو چین اس کے لئے جاگ بھی رہا ہے یا نہیں؟، اور اگر جاگ رہا ہے تو وہ اس کا کیا توڑ کرے گا؟، ہم سب اس کی طرفداری میں اس توڑ کو دیکھیں گے۔

میری عینک گم ہو چکی تھی اور اس سے مجھے سخت دقت ہو رہی تھی۔میں نے اسے تکیہِ کلام ہی بنا ڈالا۔ہمارے میزبان اس ترقی یافتہ شہر شنگھائی کی جس بھی بڑی چیز کی تعریف کرتے تو میں آخر میں فقرہ جوڑ دیتا ''مگر یہاں عینک نہیں ملتی''۔ان کا ''موشن'' ٹوٹ جاتا اور وہ مسکرانے پر مجبور ہو جاتے۔اور پھر تو وہ خود ہی کسی میوزیم، شاہراہ یا عمارت کی تعریف کرتے کرتے آخر میں میری طرف دیکھتے اور کہتے '' آپ کی عینک اس میوزیم میں نہیں ملتی، ہم ضرور خریدیں گے''۔ ہمارے اس بار بار کے عینک کے تذکرے کو یوسفی صاحب نے یوں چٹخارے بخشے:

'' بھئی ہم غور سے دیکھ رہے ہیں۔آپ کے مطالعہِ حسن میں کوئی فرق تو آیا نہیں۔ پھر کاہے کو عینک یاد کر رہے ہیں؟''۔یا پھر '' ڈاکٹر صاحب، آپ سیب رنگ رخسار تک بھی رہیے تو خسارے میں نہ رہیں، اب اس پہ موجود تل دیکھنے کی سکت بھی کہاں۔۔۔''

6۔ پرل ٹی وی ٹاور

ہم شنگھائی میوزیم دیکھنے کے بعد ایک اور عجوبہ دیکھنے گئے۔یہ ایشیاء کا بلند ترین ٹی وی ٹاور ہے۔اسے ''اورینٹل پرل ٹی وی ٹاور'' کا نام دیا گیا ہے۔آسمان کو چھوتا ہوا یہ ٹاور 468 میٹر (1245 فٹ) بلند ہے۔یہ دنیا کا تیسرا بلند ٹاور ہے۔(بچوں کی معلومات کے لئے بقیہ دو کے نام بھی لکھ دیتا ہوں، بڑے بے شک یہ دو فقرے نہ پڑھیں: ٹورنٹو ٹاور، کینیڈا دنیا کا سب سے اونچا ٹاور ہے۔اس کی اونچائی 553 میٹر ہے، دوسرا بلند ٹاور مرحوم سوویت یونین نے بنایا تھا، ماسکو ٹی وی ٹاور جو کہ 533 میٹر بلند ہے۔یعنی دنیا کے تین بلند ترین ٹاورز میں سے دو سوشلزم کے ہیں، ایک سرمایہ داری کا)۔اورینٹل پرل ٹی وی ٹاور کی تعمیر 1991 میں شروع ہوگئی تھی اور 1993 میں مکمل ہوگئی۔ٹاور گیارہ گیندوں سے بنا ہوا ہے۔ سب سے نچلا 118 میٹر کی بلندی پر بنا ہوا ہے اور سب سے اونچا والا 295 میٹر پر۔ایسا لگتا ہے جیسے پلیٹ پہ گرتے ہوئے بڑے اور چھوٹے موتی ہوں۔

ہم پانچوں اصحاب اس کے دامن پہنچے اور نیچے کھڑے اس کی چوٹی کی طرف دیکھنے لگے۔سر پہ اگر پگڑی ہو تو وہ تو خیر گر ہی جائیگی مگر یہاں تو اتنی اونچائی تھی کہ دیکھتے ہوئے سر پیچھے کندھوں سے جا کر مل جاتا تھا۔ہم 1974 میں کراچی کا حبیب بینک پلازہ دیکھ رہے تھے تو وہاں اس زمانے میں ایک لطیفہ مشہور تھا: دو دیہاتی پلازہ دیکھ رہے تھے کہ ایک کراچی والا تیز طرار نوجوان آیا اور کہا ''تم جانتے نہیں کہ اس پلازہ کو دیکھنے کے پیسے لگتے ہیں، ہر منزل کا ایک روپیہ۔نکالو پیسے۔دونوں میں سے عقلمند نے جواب دیا '' مگر ہم تو ابھی ساتواں منزل ہی

دیکھ رہے تھے، یہ لو سات روپے''۔ وہ کراچی والا پیسے لے کر رفو چکر ہو گیا تو عقلمند نے دوسرے ساتھی کو کہا: دیکھا کیسے بے وقوف بنایا اس کو۔ ہم نے پوری بلڈنگ دیکھ لی مگر اسے پیسے دیئے صرف سات منزلوں کے''۔

پچھلی رات کو ہم ٹاور دور سے دیکھ چکے تھے جس کے ارد گرد رنگا رنگ روشنیوں کا استعمال کیا گیا تھا۔ رات کو یہ عمارت ایک ایسی دراز قد حسینہ لگتی ہے جس نے موسم بہار میں دشتِ کولپور کے گل لالہ کے دھنک رنگوں والا لباس پہن رکھا ہو۔ اس کے رنگ اوپر سے نیچے تک ایک نہیں، سلسلہ وار قوسِ قزح کے جلوے دکھا رہے ہوتے ہیں۔ ایک بہت بڑا لائٹ سسٹم ٹاور کے رنگ بدلتا رہتا ہے۔ کمپیوٹروں سے آٹو میٹک طور پر کنٹرول کیئے ہوئے یہ لیمپ، ٹاور کے پورے جسم کو ہزاروں بدلتے رنگ عطا کرتے ہیں۔ لگتا ہے کہ آنگ پو دریا پہ کوئی سپیس شپ اتر رہا ہو۔

اس ٹاور کا وزن ایک لاکھ بیس ہزار ٹن ہے۔ (پیرس کے ایفل ٹاور کا وزن محض سات ہزار ٹن ہے)۔

ٹاور کی چوٹی پر لگا ہوا انٹینا ٹیلی کمیونیکیشن اور ڈیٹا ٹرانسفر کے کثیر مقاصد کو پورا کرتا ہے۔ یہ دس ایف ایم ریڈیو چینلز اور نو ٹی وی چینلز کی ٹرانسمیشن کا کام نہایت عمدگی سے کر رہا ہے۔ اس ٹاور سے شنگھائی کے پورے علاقے میں ریڈیو اور ٹی وی نشریات صاف اور واضح ہو جاتی ہیں۔

ہم چین اور اس کے سوشلزم کی تعریفیں کرتے ہوئے اور پاکستان میں موجود فیوڈل ازم کو بددعائیں دیتے ہوئے آگے بڑھے۔

میں نے چینی خواتین کا بے پناہ حسن دیکھ کر مست کے شعر کی تشریح کی کہ ''سجی کی ڈش اس طرح پکتی ہے کہ گوشت کو سیخ میں پرو کر زمین پہ گاڑتے ہیں اور دونوں طرف ڈیڑھ دو فٹ کے فاصلے پر لکڑیوں کا ڈھیر لگا کر شعلے بناتے رہتے ہیں۔ تین گھنٹے کی مسلسل ہلکی تپش اور حدت سے گوشت پک جاتا ہے۔ یہاں ہم ران ہیں اور حسن شعلے۔ اور اس دو طرفہ ہلکی آنچ والی آگ نے تو کباب بنا ڈالا ہے ہمیں''۔ چینی، دوست بہت متحیر ہوئے اور سلیم اختر نے کہا: ''یار بلوچی ادب تو واقعی بہت امیر ہے''۔

میزبان نے ٹکٹیں لیں اور ہم میوزیم سے متعلق اشیاء فروشوں اور کیمرہ مینوں کی ٹھاٹھیں مارتی لہروں کا سامنا کرتے اور ہجوم کو دھکیلتے ہوئے راستہ بنا کر مشکل سے آگے بڑھتے گئے۔

طویل لائن اور بے پناہ ہجوم سے نمٹنے کے لئے چینیوں نے دلچسپ ایجاد کیا ہے۔ انہوں نے سلاخوں زنجیروں کے ذریعے اس طرح وہ بل در بل والی لائنیں بنا دیں کہ بہت بڑا ہجوم قطار میں بھی رہے اور یہ قطار بہت دور دور تک پھیلی ہوئی بھی نہ ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ ہمارے پیٹ کے اندر ہماری طویل آنت بل در بل رکھی ہوئی ہے۔ نہ دھکم پیل کی ضرورت نہ ہاؤ ہو کی نوبت۔

ہم بالآخر لفٹ میں داخل ہو گئے۔

یہ ٹاور بہت بلند و بالا ہے (نہ ''بلند'' فٹ بیٹھتا ہے یہاں، اور نہ ''بالا'')۔ پرل ٹاور کی بلندی بیان کرنے کے لئے کوئی اور لفظ ایجاد کرنا ہوگا۔ میں نے غور سے دیکھا تھا۔۔۔۔ اس کی چوٹی تک کرگس کا پردادا بھی نہیں پہنچ سکتا تھا، کونج بھی بس بلوچستان میں ہی بلندی کا رعب جھاڑ سکتا ہے۔

ہم عمارت پر چڑھنے لگے۔ شاید پھر دونوں لفظ غلط ہیں۔ ''عمارت'' تو یہ نہ تھی۔ اور پھر ہم چڑھ تھوڑی رہے تھے؟ بھئی ہم تو کھڑے تھے۔ آپ ایک قدم بھی نہ اٹھائیں تو چڑھنا کیسا؟ لفٹ تھی جی۔ اب میں اپنے ''ابو بچ مری'' کو کیا بتاؤں کہ لفٹ کیا ہوتی ہے۔ سرکار کم بخت، ایک دانہ لفٹ ہی میرے علاقے میں بنا دے تو بہت سی توہمات دور ہو جائیں۔ اس ٹاور میں چھ لفٹیں لگی ہیں۔ رفتار 4 میٹر فی سیکنڈ ہے۔ لفٹ کی کوچوانی کوہِ قاف کی ایک پری

کے ہاتھ میں تھی۔ پہلے تو قاف گاف کے وجود کا پتہ کرنا پڑے گا۔ اور اگر قاف کا وجود ہے بھی تو میں آپ کو حلفیہ کہہ سکتا ہوں کہ وہاں کی پری، چین کی گڑیا سے زیادہ حسین نہیں۔ مجھے پروفیسر داور خان کی سفید داڑھی کی قسم (اور بلوچوں میں یہ قسم بہت وزنی ہوتی ہے)۔

وہ پری میٹھی میٹھی آواز میں ٹاور کے بارے میں بتارہی تھی اور ہم پیر و جواں پردیسی پنج تن، پرندوں کی طرح گردنیں لمبی کرکے آنکھیں ٹکائے اسے سن رہے تھے۔ سمجھ مٹی بھی نہیں آرہی تھی، اس لئے کہ وہ چینی بول رہی تھی۔ او جی چھڈو، ساڈا کی؟ جو زبان چاہے بولے۔ ہمیں تو سننا تھا، دیکھنا تھا۔ خدا کی توصیف کرنی تھی۔ (حالانکہ 96 فیصد چینی بے خدا ہوتے ہیں) اچانک اس کھلونے نے کہا "لیڈیز اینڈ جنٹلمین!" میں نے بہت دیانتداری کے ساتھ اپنی پوری جنٹلمینی لپیٹ کر کوہِ ماران کی جانب اچھال دیا۔ صرف میں ہی کیوں؟ پتر پنجاب نے بھی یہی کیا، خوشحال خٹک والے نے بھی، یوسفی کی آنکھوں کی باچھیں بھی کھل گئی تھیں اور اسلام آباد والا بیوروکریٹ بھی اس لمحے کو اسلام، اسلام آباد، لیس سر نو سر، سب کچھ بھول چکا تھا۔ اے حسن! تمہارے سامنے کیا جنٹلمینی، کیا ارسٹوکریسی، کیا اکڑ خانی؟ کائنات بھر کا بدبخت ہی ہوگا جو تیرے سامنے دوزانو نہ ہوگا۔ ابلیس کا ساتھی ہوگا جو تمہارے سامنے چون و چرا کرے گا ۔۔۔ تمہاری تو تعظیم کی جائے، تمہاری تو بلائیں لی جائیں۔

ہم بہت عرصہ بعد بڑے امتحان سے گزر رہے تھے۔ بہ یک وقت قدرت کے سخی ترین مناظر تھے، بہ یک وقت انسانی عقل کو دنگ کردینے والی ترقی کے عجائبات تھے اور بہ یک وقت انسانی اعضا کا توازن، ان کے رنگ و ظہور کا بے نظیر ہارمنی تھا۔۔۔ ہم کیا کیا دیکھتے، ہم کیا کیا سنتے۔۔۔ عوامی جمہوریہ! ہم تمہاری تینوں چیزوں کی قدر کرتے ہیں۔ ہم تمہارے اس فلسفے کی عزت کرتے ہیں جس نے پیٹ کی آگ بجھا کر انجمنِ انسانیت کے چینی شاخ کو جسم و دماغ و روح کے حسن کی آبیاری کرتے رہنے کا موقع عطا کیا۔ اور یہ چینی شاخ ہماری انسانی آبادی کا چوتھائی حصہ تشکیل دیتی ہے۔ جی ہاں۔ انسانی آبادی کا ایک چوتھائی حصہ فطرت کے ساتھ بے مثال ہم آہنگی میں ترقی کے مزے لوٹ رہا ہے۔ شنگھائی کا ٹی وی ٹاور پوری انسانیت کی میراث ہے۔ چین نے تو محض اس مشترکہ ورثے کی تعمیر کردی، اسے قائم رکھا اور اس کی حفاظت کی۔ انسانی ورثے کا محافظ چین۔۔۔ زندہ باد۔

لفٹ ہمیں دوسرے بال تک لے گئی۔ آگے "اُس" کے بھی پر جلتے ہیں۔ ہم اس ٹاور پر سے چاروں طرف شہر کا نظارہ کر رہے تھے (مگر گول دائرہ تو چاروں اطراف کا نہیں ہوتا !!) یہاں سولہ سو افراد کی گنجائش ہے۔ باہر دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ پوراشی شان، جزیرہ چانگ منگ اور یانگسی دریا بہت دور سے واضح نظر آرہے تھے۔ اوپر والے گول دائرے میں ریوالونگ ریسٹورنٹ، ڈسکو ہال، پیانو بار اور بارہ کمرے ہیں۔ ایسا لگے جیسے آپ کسی خلائی جہاز میں ہوں۔ ہم اس سارے منظرنامے کے بارے میں تفصیل بیان نہیں کرسکتے۔ بس یہ کہہ سکتے ہیں کہ انسان عظیم ہے۔ اس کا کوئی ثانی، کوئی نظیر، کوئی مقابل نہیں۔ کائنات کی ہر چیز اس کے سامنے موم ہو جانے اور اسکی فرمائش کے مطابق ڈھل جانے کے لئے اس کے اشارے کی منتظر ہے۔

ہمیں یہاں اتنی اونچائی پر اپنے پشتون ساتھی سے حسد ہونے لگا (اس کا مطلب ہے جغرافیائی بلندی پستی سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ ذہنیت پست نہیں ہونی چاہے۔ دوسرا یہ بھی پتہ چلا کہ انسانی جذبات کے لئے آس پاس دوسرے انسانوں کی موجودگی ضروری ہوتی ہے)۔ اب سین پارٹ یہ ہے کہ داور صاحب کا سرخ سپید چہرہ ہے، اس پر چمکتی سفید لمبی داڑھی ہے، مونچھیں تقریباً صاف کی ہوئیں ہیں، سر پہ چترالی ٹوپی ہے۔ وہ قمیض شلوار میں ملبوس ہیں اور سخت سردی میں بھی ایک سویٹر اور ایک واسکٹ پہنے ہوئے ہیں۔ اور ان کے مقابلے میں ہم؟۔۔۔۔ ہم سوٹڈ بوٹڈ ہیں، چست ہیں چوبند ہیں، ہنس مکھ ہیں، وغیرہ وغیرہ ہیں۔۔۔۔ اور نام نہاد جوانی بھی ہے۔ مگر نیک بخت حسینائیں ہیں کہ ہمیں گھاس تک نہیں ڈالتیں۔ وہ داور صاحب کی طویل ریش مبارک پہ فریفتہ، لپٹ جھپٹ کر غولوں میں آتی ہیں اور ان کے

ساتھ کھڑی ہو کر تصویریں کھچواتی ہیں۔ میں دل میں اب تک کے اُن تمام نائیوں کو دل کی گہرائیوں سے صلواتیں سنانے لگا جو میرا شیو کرتے رہے ہیں۔ میں نے ٹریٹ بلیڈ سے لے کر ملٹی نیشنل Gillet کے تمام شیئر ہولڈرز کو بھی بدترین انداز میں کوسا۔ بلکہ میں نے تو اس بڑے انسان کو بھی نہیں بخشا جس نے سب سے پہلے استرا ایجاد کیا تھا۔ کاش ہماری داڑھی ہوتی، گھنی اور اچھی گاڑھی ہوتی۔ ہمارے سر کے بال بھی گھٹنوں گھٹنوں لمبے ہوتے، 20 میٹر کی پگڑی ہوتی، سرمہ اور سلائی ہوتی، عطر لگا پنبہ کان میں اڑسا ہوتا، داڑھی چھلا بنائی ہوتی، تو آج ہم بھی اپنے لئے ان خوبروؤں کے دل میں فوٹو کھچوانے کی مچلتی خواہش ان کی آنکھوں میں دیکھتے، ہمارا بھی دل داور صاحب کے بوڑھے دل کی طرح ہچکولے کھا رہا ہوتا۔ اور ہم بھی انہی کی طرح احساسِ تفاخر کے ساتھ اپنے ساتھیوں سے ممتاز بنتے۔ گولی مارئیے کوٹ کو، آگ لگائیے پتلون کو اور گدھے کا دم چین بنائیے ٹائی کو۔۔۔ جب دنیا کے سب سے ترقی یافتہ شہر شنگھائی کے سب سے اونچے مینار پر بھی ان کی قدر نہیں تو سبی، نلینٹ اور کوٹ قیصرانی میں کیا خاک عزت ہوگی۔ ارے چینیو! تم دوبارہ مجھے چین بلا کے تو دیکھو۔

ہمارا یہ پشتون بزرگ مکمل طور پر ایک ماڈل میں بدل چکا تھا۔ بس ان کی یہ تصویر کسی شراب کمپنی نے نہیں خریدی یا مشہور مردانہ طاقت کے دیسی دواخانے والے نے حاصل نہ کی۔ جہاں جوانمردی عطا کرنے والا مردہ سانپ، سانڈے، بچھو اور جڑی بوٹیاں ملنے والی دکان کے اوپر بورڈ پر داور صاحب کا دمکتا چہرہ مسکرا رہا ہوتا۔

ان کی باچھیں کھلنے کی حالت دیدنی تھیں۔ یہ پروفیسر زندگی میں کئی مہمات سر کر چکے ہونگے۔ مگر بھگوان جانتا ہے کہ اس نے لڑکیوں کے ساتھ اور وہ بھی سکرٹ والی لڑکیوں کے ساتھ فوٹو کھچوانے کا خواب بھی نہ دیکھا ہوگا۔ ہمارے یہ پروفیسر گھڑ دوڑ میں فاتح گھڑ سوار کی طرح ہماری طرف دیکھتے جاتے اور فوٹو کھچواتے جاتے۔ اظہار الحق میرا مذاق اڑاتے رہے اور یوسفی صاحب نے بھی بہت جگر تراش ایک دو جملے میری جوانی پر پھینکے۔ دل کرتا تھا ابھی ابھی ان لڑکیوں کے باپ کو بتادوں تا کہ وہ کم بخت خود کچھ نہیں کرتے تو مجھے اجازت دیں کہ نامحرموں کے ساتھ ان کی بہو بیٹیوں کی اس التفات پر ان کو گجرانوالہ کے اُس ملّا کے حوالے کر دوں جس نے میر تھن ریس جیسی بے غیرتی کے خلاف پوری قوم اور حکومت پاکستان کے غیرت مند باپ کا کردار ادا کیا تھا۔ یہ شخص اگلے دو دن تک میرا منہ چڑاتا رہا۔ اچھا، داور صاحب کبھی تو موقع دو گے بدلہ لینے کا۔ اور اگر آپ بھی فرشتوں کی آنکھوں سے بچتے بچاتے بہشت میں آن دھمکے تو وہیں سارے بہشتیوں کے سامنے دائمی زندگانی میں دائمی طور پر اس تصویر کشی کی گناہِ بےلذت کا بدلہ نہ لیا تو میرا نام سلیم اختر رکھ لینا۔

اس بلند ترین عمارت پہ تحفے تحائف خریدنے کا باقاعدہ بازار لگا ہوا تھا۔ ہم نے بھی کوشش کی کہ آگے بڑھیں اور بہت پیاروں کے لئے بہت پیاری چیزیں خریدیں۔ مگر ہم کچھ نہ خرید سکے۔ یہاں اشیاء کی قیمتیں مینار کی بلندی کی مناسبت میں بلند تھیں۔ بلوچی میں کہتے ہیں ''گوشت مہنگا ہے، تو صبر تو سستا ہے''۔ ہم نے ساٹھ یوآن 480 روپے کی ایک کتاب خریدی جو چین کے بارے میں عمومی معلومات پر مشتمل تھی۔ ارے ماما! ''بولو جی تم کیا کیا خریدو گے''۔۔۔ والے خطے میں تم جا کر کتاب پر ہی ٹھہرے!! نادیدہ۔ شمیم آفریدی قصہ کرتے ہیں کہ ان کے قبائل غربت میں اور اپنے پہاڑوں میں دنیا بھر سے کٹے ہوئے صرف دو چیزوں کو جانتے ہیں۔ ایک شلغم اور ایک مولی۔ محفل میں ایک قبائلی سے پوچھا گیا کہ

''اگر تم بہشت جاؤ (اور یہ بہشت دوزخ ہی ہمارے ہر مضمون کا انجام کیوں ہوتے ہیں!!) تو وہاں خدا سے کیا مانگو گے''۔

اس نے جواب دیا ''شلغم اور مولی''۔ ساتھ والے سے پوچھا گیا ''اور تم۔۔۔؟''

''میرے لئے بچا ہی کیا ہے، سب سے اچھی چیزیں تو یہ لے گیا ہے!''۔

سو پیارو۔ ہم نے دنیا کی مارکیٹوں میں سے سب سے بڑے مارکیٹ شنگھائی، کے سب سے بلند ٹاور کے بازار سے صرف ایک کتاب خریدی۔

ہم نے نظاروں کے ساتھ خوب آنکھ مچولیاں بھی کیں ۔۔۔انسانوں کے ساتھ مچولیاں نہ ان مقدس میزبانوں کے شایانِ شان تھیں اور نہ ہماری (وقتی طور پر) ذہنی بلند سطح کے ساتھ جچتی تھیں۔ہم نظاروں کے ساتھ جذب ہو چکے تھے،ہم لا ینفک ہو چکے تھے۔انسانی ترقی ،فطرت کے ساتھ ہم آہنگ ہو کر ،ہمیں مکمل طور پر اپنا اٹوٹ انگ بنا چکی ۔۔۔مکمل ہپناٹائزڈ۔۔۔اور ہمارا ہنستا،مسکراتا مگر سخت ڈسپلن والا میزبان جنکشی یو ہماری حالت پہ محظوظ ہوتا ہوا،ہمیں بازو سے پکڑے لفٹ کی طرف دھکیل رہا تھا۔جنکشی یو تمہارے دوستانہ انداز کے قربان۔

ہم نیچے اتر رہے تھے۔اونٹ والی چڑھائی ،اترائی اور کیچڑ والا ضرب المثل جائے بھاڑ میں ۔۔۔یہاں تو اترائی بھی بے پناہ لطف دے رہی تھی ،(چڑھائی کا ذکر تو ہم پہلے کر چکے ہیں ۔) اونٹ بے چارہ ۔اسے آپ منوں وزن لاد کر میولیار پہاڑ سے چڑھاتے اتارتے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ اترائی چڑھائی دونوں کو کوسے گا۔مگر اسے ذرا شنگھائی کے 468 میٹر اونچے پرل ٹی وی ٹاور پر لفٹ میں لفٹ والی کے ساتھ لے جائیں لے آئیں،حرام ہے کہ اگر وہ اترائی چڑھائی کے خلاف زبان بھی کھولے ۔ بالخصوص جب اس کی مہار خونخوار مونچھوں اور دو گز لمبے موٹے گرز جیسے ڈانگ اٹھائے ساربان کی بجائے دنیا کی نازک ترین، خوش لباس ترین،خوش گفتار ترین،چینی گڑیا کے ہاتھ میں ہو۔

پندرھواں باب

ترقی، مزید ترقی، مزید۔۔۔۔

1۔ہم لٹ گئے بیچ بزار

ہمارا خیال تھا کہ نیچے ٹاور کے دامن پہ اتر کر باقی کاموں میں لگ جائیں گے۔مگر یہاں پر تو ایک اور دنیا آباد تھی۔جی ہاں، اسی ٹاور کے اندر، اس کی بیخ کے بیچ میں ایک اور شہر نما عجائب گھر قائم تھا جس میں چینی (شنگھائی) کی Urbanization (مدنیت) کی تاریخ دکھائی گئی تھی۔اس کا نام تھا ''شنگھائی اربن ہسٹری گیلری''۔ہم نے اب تک ماسکو میں پینو راما سنٹر دیکھ رکھا تھا جس میں منظر دیکھتے ہوئے آپ ہو بہو اسے اصل سمجھنے لگتے ہیں، اب ہمارے اسلام آباد والے لوک ورثہ میں بھی یہ انتظام موجود ہے۔مگر یہاں شنگھائی میں؟۔۔۔۔ ارے یہ تو بالکل لگتا ہے کہ اصلی بات ہے۔اگر مرغیاں دکھائی جا رہی ہیں تو باقاعدہ ان کی آوازیں آ رہی ہوتی ہیں۔اگر آپ لوہار کی دکان کے سامنے کھڑے ہیں تو اس کا مزدور جو دھونکنی چلا رہا ہے اور اس کے سرخ انگارے اسے دھونکنی کی مناسبت سے اس طرح مختلف شیڈز دکھا رہے ہیں جس طرح کہ اصلی آگ وانگارے و دھونکنی ہوں۔لوہا کوٹنے والے کی وہی مخصوص آوازیں آ رہی ہیں۔افیون عہد کا ایک منظر نامہ ہے جہاں سندھی فیوڈلوں جیسے دو چینی فیوڈل افیون پی رہے تھے۔اور طوائف پیر دبا رہی ہے۔لعنت ہو فیوڈل ازم پر۔

چل چل کر پاؤں شل کر دینے والے اس میوزیم کا نام یاروں نے بڑی کسر نفسی سے ''شنگھائی اربن ہسٹری گیلری'' رکھا ہے۔ہم اس نام سے متفق نہیں ہیں۔مگر ہمارا تو ایک ووٹ ہے (اور وہ بھی چین کے الیکشن کمیشن میں درج نہیں ہے) جب کہ چین کی آبادی ڈیڑھ ارب ہے۔سو اکثریت کو اقلیت پر بالا دستی ہے۔مگر کیوں؟ ہمیں اپنے بڑے بھائی میرو خان کی بات یاد آئی۔وہ بھی دنیا بھر کے عوام الناس کی طرح بش اور کیری کے الیکشن میں بہر صورت بش کی شکست دیکھنا چاہتے تھے۔رزلٹ نکلا، کچھ کنفیوژن ہوئی اور بالآخر مخالف نے ہار مان لی۔میں نے بھائی کو بتایا کہ بش جیت گیا۔انہوں نے کہا کہ میں نہیں مانتا۔میں نے کہا ''خود کیری نے اپنی شکست تسلیم کر لی''۔بھائی نے کہا ''وہ کرتا پھرے، میں اس کی شکست تسلیم نہیں کرتا''۔لیکن چینی دوستو! اس کے نام کے ساتھ جو ہمارا آپ کا جھگڑا ہے،

رہے گا مگر اس کی حفاظت اسی طرح جاری رکھو۔ کہ یہ جتنا تمہارا ہے اتنا ہی میرا ہے۔ پوری انسانیت کا ہے۔

ہم تہہ خانے کے اس ''شہر'' سے نکلے مگر دھوکہ کھانے کو نکلے، Cheat ہونے کو نکلے اور ایک بار نہیں دو بار۔ ہوا یوں کہ اس بڑے ٹاور کے ساتھ تصویر تو کھچوانی ضروری تھی۔ اور ہمیں معلوم ہے کہ اتنے اونچے ٹاور کے ساتھ ہم اپنی تصویر نہیں کھینچ پائیں گے۔ لہٰذا سوچا کہ باہر سینکڑوں کی تعداد میں گلے پڑتے ہوئے پیشہ ور فوٹو گرافروں کے رم میں سے کسی ایک سے اجرت پر تصویر کھچوالیں۔ سو جونہی باہر آئے تو ایک بدتمیز ہجوم میں گھر گئے۔ جب آپ منافع منافع پیٹتے رہیں گے اور اپنے عوام کو گلا کاٹنے والے مقابلے کی بدروح کے حوالے کریں گے تو عوام کا عزتِ نفس تو رہن رہنے جائے گا ہی۔ اور یہاں اس گھڑی ''پرل ٹی وی ٹاور'' کے دامن میں صورت حال سرمایہ داری نظام والے ممالک سے بھی بدتر تھی۔ جعلی نقلی تھرڈ کلاس گھڑیوں پہ رولیکس کا لیبل لگائے مرد وزن انہیں بیچنے کے لئے سیاحوں سے باقاعدہ ہاتھا پائی کر رہے تھے۔ کوئی اس ٹاور کے ماڈل بیچ رہا ہے تو کوئی اپنی عصمت فروخت کرنے اپنے شکار کی تاڑ میں لگی تھی۔ ٹاور کا ایک ماڈل تیس یوآن کی بجائے مول تول کر کے دس یوآن میں خریدا تو یوسفی صاحب نے بھی خریدنے کی فرمائش کر دی۔ دونوں کے پیسے میں نے دیئے۔ تو اس ''کافرنی'' نے ہمیں جعلی پچاس یوآن (350 روپے) کا نوٹ پکڑا دیا۔۔۔ اور یوں چاکرِ اعظم کی اولاد بیچ شنگھائی دن دھاڑے ایک زنانی سے دھوکہ کھا گیا۔ ہم یہ نوٹ صحیح سلامت بطور نشانی گھر لائے اور اپنے بچوں کو دیا۔ (شنگھائی شہر کے میئر صاحب کو ہمارے پچاس یوآن سود اور بمع جرمانہ ہمیں واپس کر دینے چاہئیں)۔ یا پھر اس قرض کے عوض کاٹ لینے چاہئیں جو اس دوست ملک سے میں علمی صورت لے چکا ہوں۔ اس میں رعایت یوں نہیں ہوسکتی کہ بلوچی میں کہتے ہیں کہ اگر آپ سے کوئی پوچھے کہ آپ لوگ کتنے بھائی ہو؟ تو اگر آپ دو بھائی ہوں تو کہہ دیں ہم تین بھائی ہیں۔ اور اس تیسرے بھائی کا نام ہے حساب کتاب۔ سو، چین کے دوستو، ہم آپ کے گہرے دوست ہیں مگر ہمارے آپ کے ساتھ تیسرا پکا دوست بھی ہے ''دو براث سیمی حساب''۔

دھوکہ نمبر 2: مشتاق احمد یوسفی نہ صرف تجربہ کار شخص ہیں بلکہ جہاں دیدہ بھی ہیں۔ نیز مشہور بلکہ معروف بینکر بھی۔ فوٹو گرافی کا مول تول کا کام انہوں نے اپنے ذمے لے لیا۔ کہ انہیں زندگی بھر مالی معاشی معاملات میں جتے رہنے پہ بہت زعم تھا۔ چنانچہ محترم نے تلفظ اور گرامر کی غلطیوں سے پاک شیکسپیئر والی انگریزی میں مذاکرات فرمائے۔ اور مذاکرات بھی کس سے؟ اس چینی خاتون سے جو انگریزی کے الف بے سے بھی نابلند تھی۔ ایک فقرے کو دس دس بار دھرایا اور آسان کر کر کے دہرایا اور بالآخر اشاروں کیلکو لیٹروں کی مدد سے دس یوآن فی تصویر کے حساب سے سودا طے کر لیا۔ طے یہ ہوا کہ ایک انفرادی تصویر ہر شخص کی لی جائے گی اور ایک گروپ فوٹو سب کا۔ تب وہ سودا طے کرنے والی ''کاؤ گرل'' خاتون ہمیں بھاگ ناڑی بیل کی طرح ہانک ہانک کر تیزی سے ایک مرد فوٹو گرافر کے حوالے کر گئی۔ اس مرد منحوس کے چہرے پر ایسی چمک آ گئی جیسے 1948 میں خان قلات کے محل سے بلوچستان کا جھنڈا اتارنے پر میجر کو ہوا تھا۔ اس نے چینی انگریزی اشاروی زبانوں کی جھرمٹ میں ہمیں کھڑا کر دیا۔ ایک پوز یوں لیا، ایک پوز ووں لیا۔ ہم یوری گگارین کی طرح مسرور، دل میں بہت مطمئن کہ پیشہ ور فوٹو گرافر کتنا مشاق ہے کہ مبادا ایک پوز اچھا نہ آئے تو دوسرا بہتر ہوگا۔ تصویر کشی مکمل ہوگئی تو ہمارے میزبان کی طرف سے وقت کی پابندی کی اٹھکیلیوں والی تصویر کشی شروع ہوگئی: ''چلیے دیر ہو رہی ہے۔۔۔ سارا شیڈول خراب ہو رہا ہے۔۔۔ وغیرہ وغیرہ''۔ ادھر فوٹو دھل کر صاف ہونے میں کچھ وقت لگ رہا تھا۔ میزبانوں کے چہروں پہ ناگواری آ رہی تھی۔ ہم اخلاق یافتہ لوگ بہت متاسف ہو رہے تھے۔ اس افراتفری اور ذہنی کھچاؤ کی بے کیفی میں وہ ایڈم سمتھ کی اولاد تصویریں لایا۔ ایک ایک کی

بجائے دو دو لے آیا اور یوں ہر شخص سے ڈبل پیسے کا مطالبہ کرنے لگا۔ ہم بولنے لگے تو یوسفی صاحب نے ہمارے دیہاتی یا گوار پن کو بے نتیجہ سمجھ کو خود لنگوٹ کس لئے اور ران پیٹتے ہوئے میدانِ جھگڑا میں کود پڑے۔ حالانکہ ہم بھی انگریزی لباس میں تھے اور انگریزی زبان کے ہتھیار سے لیس تھے۔۔۔اور یہاں یہی دو چیزیں ہی رائج تھیں۔ مگر مجھے لگا کہ میرا غصہ اس پیمانے پر پہنچا نہ تھا جتنا کہ یوسفی صاحب کا تھا۔ وہ تو لگتا تھا کہ صرف فوٹو گرافروں پہ ناراض نہ تھے بلکہ ان کی آڑ میں ساری دنیا کو اپنے معمر و لاغر پھیپھڑوں سے صور پھینک کر بھسم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ چونکہ سفر میں ہی ایک مختصر وقت کا ان کا ساتھ رہا تھا اس لئے ابھی معلوم نہ تھا کہ اس بپھرے دریائے نیچی کو رام کیونکر کیا جائے۔۔۔''Cheat کر رہے ہو، دھوکہ ہے، رانگ تھنگ، اَن فیر ۔۔۔'' وغیرہ وغیرہ۔ مگر تارا مسیح ٹس سے مس نہ ہوا، جھانسی کی رانی کے کان میں جونک بھی نہ رینگی۔ ہندو مسلمان نہ بنا، فتح پور کا سنار شہ مرید ہو بھی کیسے سکتا تھا؟ ہمیں دگنی قیمت دینا پڑی۔

ادھر میزبانوں کی ناراض نظریں، اور ان کا بدکا ہوا انداز بہت شائستگی سے جھڑکیاں دیے جا رہا تھا کہ ہم نے ان کے توسط کے بغیر گلی والوں سے ''ڈیل'' ہی کیوں کیا تھا؟ ارے دوستو! سرمایہ داری تو ہوتا ہی ڈیل والا نظام ہے۔ یہاں لیڈر ڈیلر ہے، ڈیلر سرخرو ہے۔ اچھے ساتھیو! مارتے بھی ہو اور ہاتھ بھی اپنا پکڑتے ہوئے کہ دکھ رہا ہے، ہمارے گال کا تو احساس ہی نہیں۔ اس لئے ہمیں سوختہ ہونا بھی چاہیے تھا، تھے بھی۔ خود پہ، یوسفی پہ، 50 یو آن کے جعلی نوٹ پہ، تصویر بازی میں فراڈ پہ۔ ارے پورے سرمایہ داری نظام پہ۔ مگر ہم شکایت بھی نہیں کر سکتے تھے کہ ہمارے میزبان دراصل ''کوچرا'' ہو رہے تھے اور ایسے ہی دکھاوے میں ہمارے دیر کرنے یا لوگوں سے ڈائریکٹ سودا مکانے پہ ناراض ناراض دکھلا رہے تھے۔ شرمساری کے چہرے میں اور غصہ کے تاثر میں بہت فرق ہوتا ہے۔ لیکن چلو جو بھی ہو چہرہ تو ناراض والا بنا رکھا تھا۔ اب دوست کا روٹھا چہرہ کہاں اچھا لگتا ہے۔ یار کا چہرہ مسکراتا ہی اچھا ہی لگتا ہے۔ سوا سے منانا ہی ضروری ٹھہرتا ہے۔ اس کی فرمائشیں اس کے نخرے اٹھانے پڑتے ہیں۔ سو، ہم اپنے ساتھ کیے گئے دونوں فراڈز کو بھلا کر میزبانوں کو لطیفے سنانے لگے۔ ''بقلم خود'' کا البتہ مگر مسئلہ یہ تھا کہ لطیفے سارے بلوچستانی تھے کوہستانی، قبائلی قسم کے۔ مگر سامعین تھے شنگھائی، بیجنگ، کراچی، لاہور کے۔ ''اینہا چہ می دانند آبِ زم زم چیست؟'' مگر یار نے بہر حال لبھ ہی جانا ہوتا ہے، لبھ ہی گئے۔

2۔ حساس ترین بحث

جنکشی یو کا موڈ جب اچھا ہو جائے تو وہ خوب بولتا ہے۔ اس نے ہمیں بہت ہی دلچسپ باتیں بتائیں۔ پہلے پہلے تو اس نے مجھ کمیونسٹ کا دل رکھنے، نیز اپنے سوشلزم والے ایمان کے تازہ کرنے کو سوشلزم کی بہت زیادہ تعریفیں کیں۔ میں نے اسے یہ قصہ سنایا:

''جاگ جایئے سر''۔ نرس نے سوتے ہوئے مریض کو ہلا ہلا کر کہا۔

''کیا بات ہے؟ خیر تو ہے؟'' ہڑ بڑا کر اٹھتے ہوئے مریض نے کہا۔

''ہاں، خیر ہے۔ میں آپ کو آپ کی خواب آور گولی کھلانا بھول گئی تھی''۔

جنکشی یو جھینپ گیا۔ ہم نے اپنی گہری دلچسپی والا موضوع چھیڑ دیا۔ ''چین کی ریفارم اور کھلے پن کی پالیسی''۔ ہانس نے بھی بحث میں حصہ لیا۔ سب سے پہلے تو یہ جاننا ضروری تھا کہ آج کل عوامی جمہوریہ چین کی کنجی ہے کس کے پاس؟۔ سرمایہ کے پاس؟، کمیونسٹ پارٹی کے پاس؟ پارلیمنٹ کے پاس؟۔ ہانس اور جنکشی یو دونوں نے یک زبان ہو کر کہا ''کمیونسٹ پارٹی کے پاس''۔ واضح نظر آتا تھا کہ دونوں کا تعلق پارٹی سے ہے۔ مجھے اندازہ تھا کہ آج کی دنیا کو سمجھنے کے لئے چین کو سمجھنا ضروری ہے اور چین کو سمجھنے کے لئے چین

کی کمیونسٹ پارٹی کو سمجھنا ضروری ہے۔

''کمیونسٹ پارٹی آف چائنا (CPC) کی ممبریت 70 ملین ہے'' مطلب یہ ہوا کہ چین کی کمیونسٹ پارٹی دنیا کی سب سے بڑی سیاسی پارٹی ہے۔ بھلا اور کس سیاسی پارٹی کے پاس اتنے سارے ممبر ہو سکتے ہیں۔ اور یہ عام ممبر نہیں ہوتے۔ جس پارٹی پہ تاریخ نے دنیا کی چوتھائی آبادی کو ترقی کے آسمان پر پہنچانے کی ذمہ داری ڈال دی ہو اس پارٹی کے ممبر عام ممبر تو نہیں ہو سکتے۔ اس پارٹی کے ممبر رفتار و کوالٹی کے اعتبار سے ترقی یافتہ ترین ملک کے ہر اول ہیں۔ گویا وہ اس عہد اور اس زمانے کے آگے چل رہے ہیں۔ ان کی اپنی کوالٹی کس قدر عمدہ اور اعلیٰ ہوگی!!! ایڈوانس ترین تربیت چاہیے ہوتی ہے انہیں۔

دنیا کی دیگر کمیونسٹ پارٹیوں کی طرح چینی پارٹی کا بھی سب سے بڑا ادارہ نیشنل کانگریس ہے جو ہر پانچ برس بعد منعقد ہوتی ہے۔ کانگریس تین کام کرتی ہے (1) پارٹی آئین میں ترامیم کی منظوری دینا (2) 300 افراد پر مشتمل سنٹرل کمیٹی چننا۔ یہی سنٹرل کمیٹی پھر پولٹ بیورو کو منتخب کرتی ہے۔ (3) کانگریس اگلے برسوں کیلئے پارٹی پالیسیوں اور وژن کا اعلان کرتی ہے۔

نومبر 2002 میں جو نیشنل کانگریس منعقد ہوئی تھی۔ وہ سولہویں کانگریس کے نام سے مشہور ہے۔ جسمیں اعلان کیا گیا کہ چین، کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں بدستور عوامی جمہوریت ہی رہے گی۔ پارٹی میں سیکریٹری جنرل کا عہدہ اہم ترین عہدہ ہے۔

چین میں اس وقت 9 سیاسی پارٹیاں ہیں۔ یہ پارٹیاں کمیونسٹ پارٹی کی قیادت میں ایک متحدہ محاذ قائم کی ہوئی ہیں۔۔۔۔ کثیر جماعتی تعاون۔ اقتدار کمیونسٹ پارٹی کا اور جمہوری پارٹیاں ریاستی امور میں بھرپور شرکت کرتی ہیں۔ اس طرح چینی کمیونسٹ پارٹی وہاں سماجی تبدیلی کا انجن ہے۔

ہمارا اگلا سوال تھا کہ یہ ریفارم، مارکیٹ اکانومی اور اوپن نیس کیا معاملات ہیں؟

دونوں کا کہنا تھا کہ 1970 کی دہائی کے اواخر میں چین نے اپنے انقلاب کے دوام اور اس کے ثمرات کی بہتر انداز میں عوام تک رسائی کے لئے جو پالیسی اپنائی اس کے اہم ترین نکات میں سے ایک یہ تھا کہ فوجی بجٹ میں زبردست کمی کی جائے۔ تمام سیاست کو معاشی ترقی کے ماتحت کر دیا جائے۔ حتیٰ کہ نظریہ کو بھی معاشی ترقی کے ماتحت ہونا چاہیے۔ امریکہ کے ساتھ سٹریٹجک افہام و تفہیم پیدا کرنا چاہیے۔ غیر ملکی ٹکنالوجی حاصل کی جائے، ملک میں بڑھتی ہوئی مارکیٹ والی معیشت کی طرف مائل ہوا جائے۔ اور داخلی معیشت میں مقابلہ کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ایک بیرون بین معاشی سماجی پوزیشن لی جائے۔

چینی پارٹی کا خیال ہے کہ اس طرح ایک ہم آہنگ معاشرہ وجود میں آجائے گا۔ ہم آہنگ یا ''ہارمنی'' والا یہ لفظ وہ لوگ بار بار استعمال کرتے ہیں۔ ہم آہنگ معاشرہ سے ان کا مطلب یہ ہے کہ ایک تیز، مستقل اور متوازن معاشی ترقی سے عام آدمی بالخصوص دیہی عوام کی بہبود ہو جائیگی۔ دوسرا یہ کہ اس سے جمہوریت بڑھتی جائیگی، قانون کی حکمرانی مضبوط تر ہوتی رہے گی۔ ایک مشترک نظریہ اور اخلاقی بنیاد کھڑی ہو جائیگی، سماجی برابری اور انصاف کے امکانات بڑھ جائیں گے اور ماحولیات کا تحفظ ممکن ہو سکے گا۔

جنکشی یو کے بقول مندرجہ بالا اصلاحات ہوا میں معلق نہیں ہیں بلکہ بہت ساری سماجی پرتیں ان کی حمایت کرتی ہیں۔ ان میں کاشتکار، ہلکی اور درمیانی صنعت کے مزدور، اور مینجرز، فنانشل الیٹ، بلند ترین سیاسی قیادت کی اکثریت، فوج کی اکثریت وغیرہ شامل ہیں۔ اصلاحات کی حمایت کرنے والے ان گروہوں کا اتحاد اس قدر وسیع اور گہرا ہے کہ اسے کسی بھی گھمسان کی لڑائی میں شکست نہیں دی جا سکتی، نہ ہی کسی مقامی سیاسی دھماکے کے ذریعے دیر تک ان اصلاحات کا رخ موڑا جا سکتا ہے۔

یہ معاشی اصلاحات روز بروز اپنے فوائد عوام پر آشکار کرتی چلی جا رہی ہیں۔ چینیوں کو احساس ہو چکا ہے کہ معاشی ترقی سماجی تبدیلیوں کا باعث بنتی ہے۔ جس سے سماجی

آزادی بڑھتی ہے۔ معاشی لبرلائزیشن حکمرانوں کے سب سے مضبوط لیور کو ڈھیلا کر دیتی ہے یعنی روزگار پر اس کے کنٹرول کو۔ اسی طرح معاشی ترقی، تجارت، سفر اور بیرونی اصلاحات کو وسعت دیتی ہے۔ چنانچہ تعلیم یافتہ، خود اعتماد اور سیاسی قوت منظّم کرنے کی اہل آبادی مضبوط اور وسیع ہوتی جائیگی۔

مگر چین نے یکلخت ایسا نہ کیا۔ اس کے سوشلسٹ احکامات بتدریج مارکیٹ فورسز کو جگہ دیتی رہیں۔ سب سے پہلے قیمتوں کے نظام کو مارکیٹ کے حوالے کیا گیا۔ بنکنگ کے شعبہ میں پیپلز بنک آف چائنا کو مرکزی بنک قرار دے کر مالیاتی پالیسی میں اسے مکمل آزادی دی گئی ۔ زراعت میں انہوں نے فارم کسانوں کو واپس کر دیئے جس سے پیداوار اور آمدنی زبردست طور پر بڑھی ہے۔ دگنی بڑھی ہوئی آمدنی والے ان لوگوں کی عداد 800 ملین ہے۔ چھوٹے پیمانے کے صنعتکار طبقے کو ابھرنے میں مدد دے کر اور لائٹ و میڈیم صنعت کو ابھرنے پہ اکسا کر دسیوں ملین مزدوروں منیجروں کی حمایت حاصل کی۔

خود ریاست نے انفراسٹرکچر اور بنیادی صنعتوں پر بڑی سرمایہ کاری کی۔ جس کے نتیجے میں ریلوے، شاہراہوں، بندرگاہوں، ائر پورٹوں اور بجلی کی صنعت میں زبردست ترقی ہوئی۔

غیر ملکیوں کے ساتھ بڑے پیمانے کی تجارت نے چین میں ایک لیگل سسٹم شروع کروایا۔ چین فارن ایکسچینج منیجمنٹ کے ایک مارکیٹ نظام کی طرف تیزی سے حرکت کرتا رہا۔ ہر مارکیٹ پسند اصلاح نے فوری فوائد پیدا کئے جنہوں نے اصلاحات کو مزید مضبوط کیا۔

ان سب اصلاحات کے لئے ہانگ کانگ کو استعمال میں لایا گیا۔ ہم پاکستان میں تو ہمیشہ سمجھتے رہے کہ چین ہانگ کانگ کو ایک جغرافیائی اور سیاسی استعمال کیلئے اپنے ساتھ ملانا چاہتا ہے مگر اب پتہ چلا کہ ہانگ کانگ تو بنیادی طور پر ایک معاشی یوٹیلٹی ہے۔ ہانگ کانگ جدید سروس فنکشنز کے ایک وسیع سلسلے کو تقویت بخشنے کیلئے قوانین کے ایک وسیع سلسلے کو بہتر بناتا ہے۔ یہ جدید سروس فنکشنز میں گلوبل فنانشل سنٹر، مینوفیکچرنگ فرموں کے ریجنل ہیڈ کوارٹرز، دیگر سروسز مثلاً اکاؤنٹ اینڈ ٹیکسیشن کے لئے ریجنل سینٹر، چین کے لئے تجارتی کھڑکی، اور جنوبی چین کے لئے منیجمنٹ Consulting اور ڈیزائن سینٹر کا کام کرتا ہے۔ چین نے ہانگ کانگ کو اپنی معاشی کامیابی کی کنجی قرار دیا اور اس کنجی کی کامیابی کو چین کے ساتھ معاشی وابستگی کو ترقی دینے کے ساتھ مشروط قرار دیا۔ لہٰذا ہانگ کانگ کی حد سے زیادہ خوشحالی کو یقینی بنانا بھی ہے اور چین کو بھی حد سے زیادہ فوائد (اس کے ایکسپورٹ پراسسنگ زون سے) کو یقینی بنانا بھی ہے۔ اسی لئے تو ڈینگ ژیاؤ پنگ نے کہا تھا کہ ہانگ کانگ کے آزاد سرمایہ دار، نظام کو پچاس کی بجائے سو سال تک قائم رہنا چاہیے اور چین کو اضافی ہانگ کانگوں کی ضرورت ہے۔ چنانچہ آج بھی صورتحال یہ ہے کہ ایشیاء کی بلند ترین عمارت، بنک آف چائنا میں بنک کے 14 ہزار ہانگ کانگ ملازمین کام کرتے ہیں۔ چین ہانگ کانگ کے اصل Estate میں سرمایہ کاری کرتا ہے۔ وہ ہانگ کانگ کی کمپنیوں میں وسیع ہولڈنگز رکھتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ چین ہانگ کانگ میں سب سے وسیع واحد سرمایہ کار بن چکا ہے۔

اسی طرح چین میں غیر ملکی سرمایہ کاری کا دو تہائی حصہ ہانگ کانگ سے آتا ہے۔

ہانگ کانگ چین کا آکسیجن سیلنڈر، اس کی شاہ رگ کی روانی ہے۔ ہانگ کانگ چین کیلئے ٹیکنالوجی، سرمایہ، منیجمنٹ مہارتوں اور خیالات کا دروازہ ہے۔ ہانگ کانگ اپنی Enterpot کردار کی وجہ سے عظیم ترین بندرگاہ ہے۔ یہ فنانشل سنٹر ہے۔ علاقائی سروس ہیڈ کوارٹر ہے۔ ہانگ کانگ چین کا مینوفیکچرر ہے۔ یہ چینی سائنس کا کمرشلائزر ہے۔ اور ہانگ ہی چین کا پریس سینٹر ہے۔

چینیوں نے موجودہ منزل تک پہنچنے میں ہانگ کانگ کی ناگزیریت سیڑھی کو خوب خوب استعمال کیا۔

پھر پڑوسی ایشیائی ملکوں میں چین نے اپنی سستی اشیاء کی وجہ سے بہت صارفین پیدا کیئے ہیں۔چین سے بڑھتی ہوئی سپلائی ایشیائی معیشتوں میں افراط زر کم رکھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔

اُدھر ملٹی نیشنلز کے اپنے مفادات ہیں۔ان کا مطمعِ نظر اپنے کاروبار کو گلوبل ترقی دینا ہے۔چنانچہ انہوں نے یکے بعد دیگرے چین پہ دھاوا بول دیا۔انہوں نے بہت گرمجوشی سے یہاں سرمایہ کاری شروع کردی۔پہلے پہلے یہ کمپنیاں چین کو مینوفیکچرنگ صنعت پہ فوکس کیئے رکھتے تھے۔ان میں سے بہت سے اسے اپنی مارکیٹ کی بجائے پراسیسنگ Bases کہتے تھے۔مزدور لاگت کم تھی اس لئے وہ سمگلنگ وغیرہ یہاں کرتے تھے۔مگر پھر انہوں نے اس کے ساتھ ساتھ چین کو پراسیسنگ بنیاد کے ساتھ ساتھ اسے اپنا عظیم توانائی والی مارکیٹ لینا شروع کیا۔آپریشن کو بہتر بنانے کے لئے انہوں نے یا تو اپنے ہیڈکوارٹر ہی یہاں منتقل کر دیئے،یا پھر انہیں بہت زیادہ خودمختاری دے دی۔

دہائیوں پر مشتمل ان اصلاحات سے چینی معیشت میں ایک بنیادی تبدیلی آئی ہے۔یہ منصوبہ بند معیشت سے مارکیٹ معیشت بن چکی ہے۔ملکی آمدنی بہت بڑھ گئی ہے۔اور لوگوں کا معیارزندگی بہت بلند ہوا ہے۔

اس طرح چین داخلی طور پر بہت خوشحال ہو چکا ہے اور سماجی آزادی کی بلند سطح پر پہنچ گیا ہے۔کنزیومرز کا ایک وسیع طبقہ پیدا ہو گیا ہے۔وہ چین میں موجود 600 میکڈونالڈ اور 1000 کے۔ایف۔سی اوں میں سے کھانا کھاتی ہے۔وہ سپرنگ فیسٹول، لالٹین فیسٹول، ڈریگن بوٹ فیسٹول مناتی ہے۔چھوٹا کسان اپنی نئی موٹر سائیکل پر مارکیٹ آتا جاتا ہے،ایک خاتون مزدور نئی سے نئی کاسمیٹکس استعمال کرتی ہے۔

اِس وقت چین میں مڈل کلاس محض 20 فیصد ہے۔آئندہ بیس برس میں انکا خیال ہے کہ یہ 40 فیصد تک ہو جائیگی۔جب مڈل کلاس 40 فیصد ہو جائے تو وہ سماج قدرے Stable سیاسی ومعاشی حالت میں آجاتا ہے،ایک اچھا سماجی نظام اور ایک متوازن سماج۔ان اصلاحات نے شہری آزادیوں، بنیادی انسانی حقوق اور جمہوریت کے لئے ناقابل بیان انداز اور سطح تک راہیں ہموار کی ہیں۔دیہات کی سطح پر سیلف گورننس کے ذریعے بنیادی سطح کی جمہوریت کو پروان چڑھایا جارہا ہے۔اور وہاں براہ راست الیکشن کرائے جا رہے ہیں۔حتیٰ کہ چین سے سستی درآمدات نے امریکہ کے بڑھتے ہوئے افراطِ زر کے دباؤ کو گھٹانے میں مدد دی ہے۔چین کی خود اعتمادی کا یہ عالم ہے کہ اس نے ویٹیکن سے محض دو شرائط پر دوستانہ تعلقات قائم کرنے کی پیشکش کر رکھی ہے۔

1۔تائیوان سے سفارتی تعلقات ختم کر کے واحد چین کو تسلیم کرو۔

2۔مذہبی معاملات میں چین کے داخلی امور میں مداخلت نہ کرو۔

جن چیلنجوں پر قابو پانا ہوگا وہ ہیں:

امیری کے نتیجے میں نقل مکانی کی شرح میں اضافہ ہو رہا ہے، طلاق کی تعداد میں اضافہ، امیر غریب خلیج میں اضافہ، دیہات شہر خلیج میں اضافہ ہو رہا ہے۔بچے خاندانوں کی بجائے گلی میں دھکیلے جا رہے ہیں۔بے روزگاری بڑھ رہی ہے۔طوائف بازی بڑھتی جا رہی ہے۔

افراطِ زر، اجناس کی کمی، ریاستی صنعتوں اور ٹاؤن شپ اور دیہی انٹر پرائزز کی ناقص کارکردگی، حکومتی سبسڈیزSubsidies کے ختم ہونے کے بعد بھی کسانوں کی آمدنیاں جاری رکھنی، بڑھتی ہوئی بے روزگاری، مرکزی حکومت کی ٹیکس ریونیوؤں میں کمی، بینکنگ اصلاحات، سوشل سیفٹی جال کا سکڑ جانا، اور وسیع طور پر موجود کرپشن۔پھر اس Modernity نے لوگوں کی زندگیوں میں ہیجانی تبدیلیاں پیدا کی ہیں۔یہ روایات کو کچلتا جا رہا ہے اور خود مسلط ہوتا جا رہا ہے۔اس میں خاندانی نظام سب سے زیادہ متاثر ہوتا ہوتا جا رہا ہے۔

معاشی ترقی، کنٹرول کی مرکزیت مانگتی ہے، مگر یہ قومی اتحاد پہ بھی انحصار کرتی ہے۔ یہ امیر اور غریب کے درمیان خلیج کو وسیع کرتی ہے اور اس خلیج کو پاٹنے کیلئے مرکزی حکومت کی مدد کی ضرورت پڑتی ہے۔ ترقی نہ صرف کچھ نہ کچھ جمہوری اصلاحات چاہتی ہے بلکہ کچھ روایتی سماجی بندھنیں بھی مانگتی ہے جو جمہوری اصلاحات میں مداخلت کرتی ہیں۔ معاشی ترقی خارجی تاجر اور سرمایہ کاری مانگتی ہے۔

چین کے تجربے نے بتا دیا کہ کسی سماجی تباہی کے بغیر بھی سوشلسٹ معاشی نظام، مارکیٹ نظام سے ہاتھ ملا سکتا ہے۔ ''چینی مارکیٹ اکانومی وِدھ چینی خصوصیات'' اسے وہ سوشلسٹ مارکیٹ اکانومی کہہ رہے ہیں۔ ایک مارکسسٹ ریاست ایک سرگرم مارکیٹ سسٹم کے ساتھ کیا جوڑ بناتی ہے، دیکھنا ہوگا۔ مارکیٹ قوتیں آزادانہ کام کرتی ہیں، وہ صرف معاشی سگنلوں کو جانتی ہیں۔ وہ نہ تو سرکار کو جانتی ہیں نہ مرکزی حکومت کو مانتی چین کی پارٹی نے جو ہدف مقرر کر رکھا وہ یہ ہے: ایک خوشحال، جمہوری، ہم آہنگ، جدید سوشلسٹ ملک ہیں۔ اور نہ انہیں شہریوں کو معاشی حقوق کی ضمانت دینے سے غرض ہوتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو تین امکانات ہیں:

1۔ معاشی ترقی کی فری مارکیٹ پراسیس بالآخر مارکسسٹ ریاست کو زیر کرلے گی۔

2۔ یا مارکسسٹ نظام حساس تبدیلیوں کی مزاحمت کرے گا۔

3۔ یا پھر بہت عرصے تک دونوں نظاموں کی convergence جاری رہے گی۔

ہمارا اپنا اندازہ ہے کہ تیسرے امکان کے زیادہ امکان ہیں۔ اب تک کی چینی کمیونسٹ پارٹی کی ساری پیش قدمیاں اسی جانب رہی ہیں۔ اس نے خود کو ایک ماڈرن، ترقی کی طرف جھکاؤ رکھنے والی تنظیم میں ڈھال دیا ہے اور ''اخلاقی بحران'' پر نظر رکھتے ہوئے بتدریج معاشی اور سیاسی اصلاحات کرتی رہی ہے۔ پارٹی ابھی بھی سمجھتی کہ اجتماعی خوشحالی سوشلزم کا بنیادی اصول اور جستجو ہے۔

اس convergence کی اور بھی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ مثلاً لینن کی نیو اکنامک پالیسی۔ چین آج کسی نہ کسی صورت مکمل صنعتی نظام میں جانا چاہتا ہے۔

یہ بات حتمی ہے کہ معاشی اصلاحات بہت عرصہ تک کمیونسٹ پارٹی کے تحت چلائی جاتی رہیں گی، وہ لوگ کمیونسٹ پارٹی کی ہراول خصوصیات برقرار رکھنے کی سرتوڑ کوششیں کر رہے ہیں۔ ان کی ساری تگ و دو ترقی کے سائنسی نقطہ نظر کے اطلاق کی مشق، سوشلسٹ ہم آہنگ سماج کی تعمیر، اور پارٹی کی حکمرانی کی اہلیت بڑھانے کی تدبیروں پر مرکوز ہے۔ اس پارٹی کی قیادت میں چین کی عوامی جمہوریت میں عوام کی واضح اکثریت ریاستی امور کی مالک ہے۔۔ اس حکمرانی کی ضمانت جمہوریت ہے جس کا بنیادی اصول جمہوری مرکزیت ہے۔ ایک ایسا سوشلسٹ سماج جو جمہوری ہے، قانون کی حکمرانی والا ہے، قابل اعتبار اور منظم ہے۔ ایک مارکسسٹ حکمران پارٹی، کی حیثیت سے کمیونسٹ پارٹی کی حکمرانی کی پانچ اہلیتیں ہیں:

1۔ سوشلسٹ مارکیٹ اکانومی کنٹرول کرنے کی اہلیت

2۔ سوشلسٹ جمہوری سیاست کو ترقی دینے کی اہلیت۔

3۔ ترقی یافتہ سوشلسٹ کلچر کی تعمیر کی اہلیت۔

4۔ ایک ہم آہنگ سوشلسٹ سماج کی تعمیر کی اہلیت۔

5۔ عالمی صورتحال سے نبرد آزما ہونے اور بین الاقوامی تعلقات سے نمٹنے کی اہلیت۔

چین کی پارٹی نے جو ہدف مقرر کیا ہے وہ ہے: ایک خوشحال، جمہوری، ہم آہنگ، جدید سوشلسٹ ملک۔

دنیا میں چین ہی وہ سربراہ ملک ہے جہاں سوشلسٹ نظام پیداوار اور کھلی منڈی والی معیشت کے امتزاج کا انوکھا تجربہ ہو رہا ہے۔ یہ تجربہ بہت خوبصورتی سے چل رہا ہے۔ اور یہ تجربہ صرف دنیا کی سب سے بڑی آبادی والے ملک چین کے لئے ہی اہم نہیں ہے بلکہ دنیا بھر کے انسانوں کے لئے بھی اہم ہے۔

3۔عشقیہ داستان

بتیس ڈشوں پہ مشتمل ایک اور کھانا، پھر آدھ گھنٹہ آرام، تازہ دم ہونے کے لئے اپنے رات والے Equatorial ہوٹل پہنچائے گئے۔ بعدازاں ایک بار پھر ہم کوسٹر میں بیٹھے، شنگھائی شہر کے ناقابلِ یقین فلم کی طرح حیران کن نظارے لوٹتے ہوئے چائینیز رائٹرز ایسوسی ایشن شنگھائی برانچ کی خوبصورت عمارت پہنچے۔ شنگھائی کے ادیب، شاعر، ایڈیٹرز اور دانشوروں نے مین گیٹ پہ ہی ہمارا استقبال کیا۔ انہوں نے فرمائش کی کہ پہلے ان کی بہت ہی شاندار بڑی عمارت کا دورہ کیا جائے، راؤنڈ ٹیبل کانفرنس پھر ہوگی۔ انہوں نے ہمیں ایک متاثر کن جگہ دکھائی۔ عمارت کے مین گیٹ کے ساتھ ہی psyche کا نیم ملبوس بہت بڑا مجسمہ تھا جو کہ ایک حوض کے اندر ایستادہ تھا۔

یہ خاتون محبت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے مشہور ہے۔ اور یہ دلچسپ بات ہے۔ عام انسان اگر ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو جائے تو مشہور نہیں ہوتا ملیریا، ٹی بی، یرقان، الغرض عام انسان کی کوئی بھی بیماری اسے شہرت عطا نہیں کرتی جبکہ محبت کا مرض اسے دسیوں ہزار برس تک کی شہرت عطا کرتا ہے۔ میں نے Psyche[1] کیلئے جب خاتون کا لفظ استعمال کیا تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ دیوی نہیں ایک عام فانی انسان تھی۔ دوسری دلچسپ بات یہ ہے کہ محبت کی یہ کہانی یونانی نہیں ہے بلکہ رومن ہے۔ اس رومن خاتون کا حسن اس قدر غرق کر دینے والا تھا کہ محبت کی دیوی وینس (یہ پھر رومن کردار ہے، یونانی نہیں) اس سے حسد کرنے لگی۔ وینس کے بیٹے کا نام کیوپڈ (Cupid) تھا۔ وہی کیوپڈ جو محبت کے دیوتا کے بطور جانا جاتا ہے اور جس کی تصویر عام ملتی ہے جس میں وہ تیر کمان اور پیوست دلوں سے لیس شرارتی بچہ کے بطور نظر آتا ہے، جس کے پر ہیں۔ تیر، محبت کے جذبات اور خواہشات کی عکاسی کرتے ہیں۔ کیوپڈ تیروں سے دیوتاؤں اور انسانوں کا نشانہ باندھتا ہے اور انہیں محبت میں گہرا گرا دیتا ہے۔ رومن مائتھالوجی کی رو سے حاسدہ وینس نے اپنے بیٹے کیوپڈ کو سائیکی نامی حسینہ کو محض اس لئے سزا دینے کا حکم دیا کہ وہ اس قدر خوبصورت کیوں ہے۔ مگر کیوپڈ بجائے اُسے قتل کردیتا الٹا اس کی محبت میں گرفتار ہوگیا۔ اور اس نے اسے اپنی دلہن بنالیا۔ مگر وہ خود تو دیوتا تھا اور سائیکی عام انسان تھی اس لئے اس نے سائیکی پہ پابندی لگادی کہ وہ کیوپڈ کی طرف دیکھے گی نہیں۔ سائیکی بہت مطمئن بہت خوش تھی۔ مگر اس کی بدبخت بہنوں نے اسے کیوپڈ کی طرف دیکھنے پر اکسایا۔ اور جونہی سائیکی نے کیوپڈ کی طرف دیکھا تو کیوپڈ نے سزا کے بطور اسے چھوڑ دیا۔ پل بھر میں خوبصورت محل اور باغات بھی ختم ہوئے اور سائیکی نے خود کو کھلے ویران میدان میں تن تنہا پایا۔ جہاں نہ آدم زاد تھا، نہ چرند نہ پرند اور نہ ہی کیوپڈ وہاں تھا۔ سائیکی اپنے محبوب کی تلاش میں نکل پڑی۔ گرتے پڑتے، بالآخر محبوب کی تلاش میں وینس کے محل پہنچی۔ محبت کی دیوی وینس اس کو برباد کرنا چاہتی تھی لہٰذا اسے بہت سارے جان لیوا کٹھن امتحانوں میں ڈال دیا۔۔۔۔ ایک سے ایک مہلک امتحان۔ آخری امتحان یہ تھا کہ سائیکی کو ایک چھوٹا سا ڈبہ دے دیا کہ وہ اسے پاتال لے جائے اور پاتال کے دیوتا Pluto کی بیوی Proserpine کے حسن سے تھوڑی سی خوبصورتی لے لے اور اسے اس ڈبے میں ڈال کر لے آئے۔ وینس نے سائیکی کو اس دوران پیش آنے والے خطرات سے بچاؤ کے طریقے بھی بتائے۔ اسے یہ تنبیہہ کی کہ وہ اس ڈبے کو ہرگز ہرگز نہ کھولے۔ سائیکی نے اپنے محبوب کے حصول کے لئے ایک بار پھر درجنوں خطرات میں کود کر یہ کام بھی انجام دیا۔ مگر حرص و ترغیب ایک بار پھر سائیکی پہ حاوی ہوگئی اور اس نے ڈبہ کھول دیا۔ اب حسن کی بجائے اسے موت ملی اور وہ مرگئی۔ کیوپڈ نے اسے زمین پر پڑا پایا۔ اس نے اس کے جسم سے موت کی سی نیند کو اکٹھا کیا اور اسے دوبارہ ڈبے میں ڈال دیا۔ سائیکی دوبارہ زندہ ہوگئی۔ اس کے عشق میں غرق کیوپڈ نے اسے معاف کردیا اور

پھرونیس نے بھی۔ دیوتا بھی کیوپڈ سے اس کی والہانہ محبت کرنے کی وجہ سے، بہت متاثر ہوئے اوراسے دیوی کا درجہ دیدیا۔ چنانچہ سائیکی مائتھالوجی میں وہ واحد انسان ہے جسے عشق نے دیوتاؤں میں شامل کردیا۔

یہاں شنگھائی میں ادیبوں کی انجمن کے دفتر میں قائم سائیکی کے مجسمے کے دائرے والے اس حوض کے کناروں پر مینڈکیں بنی ہوئی تھیں اوران کے منہ سے فوارے کی صورت پانی کی اونچی دھاریں اس حسن کی دیوی کے جسم کو نہلا رہی تھیں۔اورخوبصورت لائٹنگ کے ذریعے اس جادوئی منظر کو پرستان بنادیا گیا تھا۔ Psyche کے نہلاتے مجسمے کے نہانے کا منظراور میزبانوں کا خلوص۔۔۔ہم آپے میں رہ سکتے تھے کیا؟۔فوٹو بنائے،گروپ فوٹو بنائے، طرح طرح کے سوالات کئے،طرح طرح کے جوابات دیئے،خوب خوب لطف اٹھایا اورپھر عمارت میں داخل ہوگئے۔

4۔محبت کی شادی یا شادی کی محبت

ہم نے دیکھا کہ کمپاؤنڈ کے ایک طرف چمن میں کرسیاں رکھی جارہی تھیں،زرق برق لباس میں فیملیز آجارہی تھیں۔۔۔ پتہ چلا،ایک شادی ہورہی تھی۔ہم نے ادیبوں سے بات ہی منگنی،شادی،طلاق اوراولاد کے رسوم کی چھیڑی اور کلچر پہ ان کے اثرات کنگھالے۔

ہمیں بتایا گیا کہ فیوڈل چین میں ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا رواج نہ صرف موجودتھا بلکہ کنفیوشس فلسفے کے تحت قانونی بھی تھا۔ پانچویں اورچھٹی صدی قبل مسیح میں یہ عام بات ہوا کرتی تھی کی ایک فیوڈل سرداراپنی بیٹی دوسرے فیوڈل سردار کو بیاہ دیتا تھا۔وہ دلہن کی کئی کزنوں اوررشتہ داروں کو گھریلو ملازماؤں کی حیثیت سے ساتھ کردیتا تھا۔تاکہ اگر دلہن مرجائے تو اس کی اُن رشتہ داروں میں سے کوئی حرم کی سربراہ بن جائے.......کنفیوشسی فلسفہ یہ بندوبست اسلیے کرتا تھا کہ وارث کے بغیر مرجانا ایک ناقابلِ معافی گناہ تصور ہوتا تھا۔

1950 اور 1960 کی دہائیوں تک والدین جوڑے بنانے کا کام کررہے تھے اورنوجوان لوگ اپنی جیون ساتھی کے انتخابات کی آزادی خال خال ہی رکھتے تھے۔

1970 اور 1980 کی دہائیوں تک میں بھی ارینج شادیاں ہی مروج تھیں۔ زیادہ تر جوڑے، جوڑے بنانے والوں کے توسط سے ملتے تھے اورشادی کی گرہ میں بندھ جانے کی کوشش سے قبل والدین کی رضامندی کے ضرورت مند ہوتے۔لڑکا لڑکی کا ملنا جلنا اور آزادانہ محبت اتنے عام نہ تھے،لہٰذا جوڑے شادی سے قبل ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ نہ جانتے تھے۔اس نسل کے زیادہ تر لوگ کہتے ہیں کہ وہ شادی کر چکے اور بعد میں باہم محبت کرنے لگے۔

1990 کی دہائی میں زیادہ تر نوجوانوں نے محبت میں گرفتار ہونے کے بعد شادیاں کیں۔سارے متعلقہ لوگوں کے سامنے اپنی محبت کا اعلان کرنے کے بعد وہ عام شادی والے عمل سے گزرے۔

آج کل جوان لازمی طور پر شادی کے پیچھے نہیں بھاگتے۔وہ اس کی بجائے محبت اورخوشی کا پیچھا کرتے ہیں۔

عوامی جمہوریہ چین کو فیوڈل ازم اور فیوڈل اخلافیات پر تین حرف بھیجے نصف صدی بہت چکی ہے۔اس طرح باقی باتوں کے علاوہ جنس اور جنسی عمل بھی اب بہت مخفی اور بہت شرمندگی کے عوامل نہیں رہے۔اس جدید عہد میں اب وہاں کوئی بھی اس حقیقت سے انکارنہیں کرسکتا کہ مرد اورعورت کے درمیان جنسی کشش فطری ہے اور یہ کہ سیکس کسی تعلق کا ایک اہم حصہ ہوسکتا ہے۔درحقیقت جنس Erotic محبت کی فزیالوجیکل بنیاد ہے اور ایک حد تک محبت کا ایک فطری اظہار بھی۔البتہ سیکس ایک متشددانہ قوت بھی ہے۔ جو اگر قابو سے باہر آجائے

تو تباہ کن نتائج بھی دے سکتی ہے۔ چین کا سماج شادی سے قبل والے سیکس کے بڑھتے ہوئے رجحان سے خبردار ہوتا جارہا ہے۔ کچھ دہائی قبل شادی سے پہلے حاملہ عورت کو رائے عامہ مسترد کیا کرتی تھی۔ حتیٰ کہ اسے خودکشی کرنا پڑتی تھی۔ مگر آج کل وہاں شادی کے موقع پر اچھی خاصی ایڈوانس حمل والی دلہن کا نظر آنا نایاب نہیں ہوتا۔

دوسری طرف یہ بھی حقیقت ہے کہ روایتی اخلاقی پابندیوں سے جنسی عمل کی آزادی نے کئی جسمانی اور سماجی مسائل کو جنم دیا ہے۔ جس میں جنسی بیماریاں، ایڈز، منشیات، شادی سے قبل یا بغیر شادی کے حمل، بچپن کی زچگی، نفسیاتی مسائل وغیرہ شامل ہیں۔

چینی ادیب و دانشور بحثیں کررہے ہیں کہ آیا یہ سماجی ترقی کا اظہار ہے یا یہ سماجی ترقی کے لئے دی جانے والی قیمت ہے۔ ممکن ہے عوامی جمہوریہ چین اس کا کوئی علاج کوئی مداوا تلاش کرنے میں کامیاب ہو، اور ہم ان کے تجربے سے مستفید ہو جائیں وگرنہ ترقی کی یہ قیمت مستقبل کے بلوچستان کو بھی ادا کرنی پڑے گی۔ جو بہت ہی تکلیف دہ ہوگی۔

آج کے چین میں شادی لڑکے لڑکی کی باہمی رضامندی کا معاملہ ہے۔ اس میں پھوپھیوں، خالاؤں، چاچیوں، بہنوں، باپوں اور ماؤں کی کوئی مداخلت نہیں ہوتی، نہ ہی ظالم سماج کی آسمان تک دیوار حائل ہوتی ہے۔ (کوڑی بے بخت انت کہ عاشقانی غیوءَ کفاں۔ مست)۔ باہمی تفہیم ہی کافی ہوتا ہے، لڑکا لڑکی کی آپسی انڈرسٹینڈنگ ہی ملاّ قاضی ہوتی ہے۔ شادی کے لئے محبت والوں کو کھیتوں، کھنڈروں، نالوں، درختوں میں چھپ چھپ کر ملنا نہیں پڑتا۔ نہ دردناک آہیں ہوتی ہیں، نہ چرسیوں والے گانے ہوتے ہیں، نہ ہی دھائیاں دینی پڑتی ہیں۔ کوئی ڈوئیل، کوئی سیاہ کاری نہیں ہوتی۔

چینی آئین کے مطابق مرد 22 اور عورت 20 سال کی عمر سے قبل شادی نہیں کرسکتے۔ کوئی جوڑا اسی وقت میاں بیوی تسلیم کئے جاتے ہیں جب وہ شادی کے رجسٹریشن آفس میں بذات خود جا کر شادی کا سرٹیفکیٹ حاصل کرلیں۔ جہیز، لب، مٹنٹر، لافی بانہہ، کوئی بکواس نہیں ہوتا۔ میاں بیوی دونوں کو اپنا اپنا خاندانی نام استعمال کرنے کا حق حاصل ہے۔ بچے دونوں میں سے کسی کا بھی خاندانی نام اپنا سکتے ہیں۔ میاں بیوی کے کاموں کی کوئی تخصیص نہیں۔ ایک سے زیادہ بیوی کی گنجائش نہیں ہے۔ سرکاری طور پر عورت مرد کے برابر کا درجہ رکھتی ہے۔ اسقاطِ حمل کوئی جرم نہیں بلکہ معمول کا عمل ہے۔ ناجائز بچوں کو بھی وہی حقوق حاصل ہیں جو جائز بچوں کو ہیں۔ بلوچی زبان کی طرح چینی زبان میں مذکر مونث کی قید نہیں ہے۔ (چینی زبان میں گرامر بھی نہیں ہوتا)۔

میاں بیوی میں تعلق بوجھ بن جائے تو نوبت مار کٹائی تک نہیں پہنچتی۔ نہ عورت کے چہرے پر تیزاب پھینکا جاتا ہے۔ نہ ہی سٹوو پھاڑے جاتے ہیں۔ نہ اسے پنکھے سے لٹکا کر اس کی خودکشی کا اعلان کیا جاتا ہے۔ نہ مائی مختاراں، نہ زینب کے قصے دہرائے جاتے ہیں۔ چین میں ہر علاقے اور محلے کی سطح پر ایک ثالثی کونسل موجود ہے۔ جہاں دونوں میں سے ایک شکایت لے کر جاتا ہے۔ فریقِ ثانی کو بلایا جاتا ہے، والدین بھی آجاتے ہیں۔ مل کر طلاق سے بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ گلے شکوے بیان کرنے کا موقع دیا جاتا ہے۔ اگر پھر بھی مصالحت نہ ہوئی تو علیحدگی کی رسید لکھ دی جاتی ہے۔ نہ رونا نہ دھونا۔ نہ طلاق یافتہ کو کوئی مسلح باڈی گارڈ چاہئیں نہ دوسری شادی اس وجہ سے رک جاتی ہے کہ وہ کیوں طلاق یافتہ ہے۔

5۔ مادی ترقی اور ادب

ادبی انجمن کی اس شنگھائی برانچ کی یہ عمارت واقعی بہت خوبصورت تھی۔ اور وسیع بھی۔ انہوں نے اوپر کی منزل پر ایک بڑے ہال میں ہمارے لیے بیٹھک سجائی۔ جو کہ ان کی لائبریری تھی اور چاروں طرف کتابوں بھرے شیلف لگے تھے۔ چھ سات کمپیوٹر رکھے ہوئے

تھے۔آڈیو ویژوئل کے سیٹ رکھے ہوئے تھے اور ایک بہت بڑا فلیٹ ٹی وی رکھا ہوا تھا جو پروجیکٹر کا کام کرتا تھا۔۔میں نے اتنا بڑا ٹی وی سیٹ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔

راؤنڈ کی بجائے یہ ٹیبل مستطیل تھا۔آپسی تعارف ہوا۔مما لک کی دوستی کی روایتی باتیں اور پھر سوال جواب کا سلسلہ چل نکلا۔

گو کہ چین زبردست ترقی یافتہ ملک ہے اور اب بھی اس کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہے۔مگر اب پاکستان بھی کچھ کچھ ترقی کرنے لگا ہے۔فطری طور پر اس ترقی کے مسائل ہونے تھے ادب پر، سماج پر۔ہم نے ان کے تجربات جاننے چاہے۔اور وہ بتانے میں بہت ہی سخی نکلے۔

ترقی کا انڈکس تو طبقاتی ہوا کرتا ہے مگر اگر ہم بورژوا معیار بھی رکھیں تو آپ اس ترقی کا خود اندازہ کریں کہ ہر روز **14** ہزار نئی گاڑیاں چین کی سڑکوں پر اترتی ہیں۔چین اس وقت دنیا میں سب سے زیادہ کوئلہ استعمال کرنے والا ملک بن گیا ہے۔چین درآمدات برآمدات میں جاپان، برطانیہ اور فرانس کو پیچھے چھوڑ گیا ہے۔وہ اس وقت دنیا کی **70** فیصد فوٹو کاپی مشینیں، مائیکرو ویو اون، ڈی وی ڈی پلیرز اور جوتے تیار کرتا ہے۔دنیا کے آدھے سے زیادہ ڈیجٹل کیمرے اور **20** فیصد کمپیوٹر بھی چین میں بنائے جا رہے ہیں۔چین دنیا کا سب سے بڑا گوشت، کپاس، دالیں، مونگ پھلی، کینولا اور فروٹ کے ساتھ ساتھ سٹیل، کوئلہ، سمینٹ، کھاد، کپڑا، اور ٹیلی وژن بنانے والا ملک بن گیا ہے۔

چینی ادیبوں کی معصوم شکایت بھی سنیے:

''صنعتکاری نے شاعری کا تناسب کم کر دیا ہے، ترقی نے شاعری کو محدود کر دیا ہے۔عام لوگوں، کالجوں یونیورسٹیوں میں شاعری کے گروپ ہیں۔انٹرنیٹ پہ شاعری ہو رہی ہے۔رسالوں میں جگہ اُنہی نئے شاعروں کو ملتی ہے جو انٹرنیٹ پر مشہور ہو جاتے ہیں۔

انہوں نے بتایا کہ انٹرنیٹ پر ادبی سائٹس ہیں۔ وہاں روزانہ لاکھوں کی تعداد میں نوجوان ملتے ہیں۔انٹرنیٹ پر لٹریچر بہت پڑھا جاتا ہے۔وہاں فورم پہ بہت بحثیں ہوتی ہیں۔نوجوان لوگ پہلے انٹرنیٹ پہ اپنی نگارشات بھیجتے ہیں۔وہاں کے قارئین کا اندازہ لگا لیتے ہیں اور پھر چھپواتے ہیں۔مگر کتاب خوانی بھی اچھی خاصی ہے۔

میں چونکہ ایک ماہوار میگزین ''سنگت'' کا ایڈیٹر تھا۔اس لئے مجھے سوالات زیادہ بھگتنے پڑے۔رسالہ کتنی تعداد میں چھپتا ہے، پیسہ لیتے ہیں یا نہیں، موضوعات کیا ہیں، اخراجا ت کہاں سے پورے ہوتے ہیں۔

عورتیں اپنی زندگیوں پر بہت کچھ لکھ رہی ہیں۔اس کی وجہ یہ ہے کہ مارکیٹ اکانومی اور معاشی قوانین میں تبدیلیوں نے کچھ ایسے پالیسی امور کو کم اہمیت والا بنانا شروع کر دیا جو عورتوں کے حقوق اور مفادات کی ضمانت دیا کرتے تھے۔

تجارتی دنیا میں لفظ ''منافع'' باقی ساری باتوں کو دھندلاتی جا رہی ہے۔لوگوں میں زندگی اور موت کی سی جدوجہد نظر آتی ہے۔گلا کاٹنے والا مقابلہ۔اور اس مقابلہ میں جب کبھی ''منافع'' اور ''عزتِ نفس'' کا تصادم ہو جاتا ہے تو خواتین لکھاری ''منافع'' والی عورت کو چھوڑ دیتی ہیں اور ''عزتِ نفس'' والی کو ساتھ رکھتی ہیں۔

عورتیں اپنی زندگیوں کے حالات پر لکھ رہی ہیں۔فیمینزم موجود ہے۔

انہوں نے بتایا کہ ان کے ہاں پانچ مقامی ادبی میگزین ہیں:

1۔Harvest: سب سے مقبول رسالہ ہے۔یہ ہر دو ماہ پر چھپتا ہے۔سانس روک کے سنئے کہ یہ رسالہ ایک لاکھ تیس ہزار کی تعداد میں چھپتا ہے۔اور اس میں کوئی اشتہار نہیں ہوتا۔اس رسالے کو باہر سے بھی کسی مالی مدد کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی۔یہ نہ صرف خود کفیل ہے بلکہ ایڈیٹروں کو اچھی خاصی آمدنی بھی ملتی ہے۔

2۔شنگھائی ادب: یہ رسالہ صرف افسانے چھاپتا ہے۔اس لئے دس ہزار کی تعداد میں شائع ہوتا ہے۔یہ خود کفیل نہیں ہے اور رائٹرز ایسوسی ایشن اس کی مدد کرتی ہے۔دو **IT** کی

کمپنیاں بھی اس کی مالی مدد کرتی ہیں۔

3۔ ینگ بلڈ: نوجوانوں کے لئے ہے۔ یہ ماہنامہ ہے اور 45 ہزار کی تعداد میں چھپتا ہے۔

4۔ادبی سرکل شنگھائی

5۔کلچرل سرکل شنگھائی

اس کے علاوہ اخباروں میں ادبی صفحات موجود ہوتے ہیں۔

6۔دوستی، مہمان نوازی

بعدازاں عشائیہ (مغربیہ یا غروب آفتابیہ) تھا۔ شنگھائی میں جو چائنیز رائٹرز ایسوسی ایشن ہے۔ اس کے سربراہ پارلیمنٹ کے ممبر بھی ہیں۔ ان کا ایک مسلمان سرمایہ دار دوست ہے جس کا ایک شاندار ہوٹل ہے جہاں کے کھانے بہت مشہور ہیں۔ وہ ہمیں وہاں لے گئے۔ یہ ہفتے کی رات تھی۔ یعنی اگلی صبح اتوار تھا، چھٹی تھی۔

شنگھائی والوں کے ہاں رواج ہے کہ وہ ویک اینڈ پر اپنی فیملی یا پھر، اپنے یاروں دوستوں کے ساتھ کھانا ہوٹل میں کھاتے ہیں۔ آج وہی دن تھا۔ اس ہوٹل کے کھانے مشہور تھے لہٰذا پورا شہر امڈ آیا تھا یہاں۔ حسن، بناؤ، سنگھار، مسرت، چہچہاہٹ۔ انسان صدا خوش رہے، صدا کلیلیں بھرے، صدا خیر سے ہو۔

ہم ہوٹل کے گیٹ پر کھڑے تھے۔ اور اس طرح واقعتاً حوروں کے پریڈ کی سلامی وصول کر رہے تھے، ہم چینی گڑیاؤں کی جھرمٹ میں اپنی تمام سمتیں کھو بیٹھے تھے۔ دل کرتا ہر عورت کو چھو کر دیکھوں کہ واقعہ جاندار، انسان ہے یا خیالات کے پیکر کی گڑیا ہے۔ بلوچ ماما کی عقل دنگ، خیالات کا منہ حیرت سے کھلا اور سٹی گم ہو چکی تھی۔ کلمہ طیبہ تک یاد نہ رہا کہ

واپس اپنی فیوڈل دنیا میں لوٹ آتے۔

کھانے کیلئے گو کہ ہمارے لئے عالیشان چھوٹا سا کمرہ پہلے ہی مخصوص تھا مگر دسویں منزل کے اس ڈائننگ ہال میں پہنچنے کے لئے تو لفٹ چاہیے تھی۔ مگر دونوں لفٹوں میں سے کوئی خالی ہو تو ہم جا پائیں۔ بالآخر کسی چینی کو پتہ چل ہی گیا کہ ہم ''باجستانی'' دوست ہیں تو پھر آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ انہوں نے کیا کیا ہوگا۔ فوراً ہی بچوں، بوڑھوں، جوانوں کا دریائے نیل دو حصوں میں منقسم ہوا، درمیان میں ایک خشکی بنی اور ہم پلک جھپکتے ہی لفٹ کی آغوش میں تھے۔ اور ابھی دو چار پلک جھپکے ہونگے کہ ہم اپنے مخصوص ڈائننگ ہال میں تھے۔ وہی گول ضیافتی میز، اس کے اوپر وہی گھومتا شیشہ جس پر ڈیزائن بھرا دلکش پھولوں پتوں کا تیار کردہ کنگ سائز گلدستہ۔ ہوٹل کا مالک ملک سے باہر گیا ہوا تھا لہٰذا ہمارے استقبال کے لئے خود موجود نہ تھا۔ مگر ہوٹل کی اہم ترین خاتون ''شخصیت'' نے ویٹر کا کام سنبھالا ہمارے لئے۔ آپ کو بتاؤں کہ ہم پاکستانیوں کے لئے، ہم اہل قلم کے لئے، ہم رائٹرز کے لئے کتنی بڑی میزبانی ہو رہی تھی۔ جی ہاں، ہوٹل کی پارٹنر مالک خود ہمارے لئے ویٹریس بن چکی تھی۔ کروڑ پتی مالکن ہماری بیرا تھی۔ ہمیں دوستی نے بہت بڑا بنا دیا تھا۔ اپنی نااہلی کے سبب اس بڑی خاتون کا نام نہ پوچھ سکا مگر اس کے احترام میں میرا قلم اب بھی سلام پیش کر رہا ہے اور وہیں بھی ہم سب مہمانوں نے اردو اور انگریزی میں ان کے توقیر میں دل کھول کر باتیں کیں۔ ہم اس قدر متاثر ہوئے کہ ہمارے میزبان (ایسوسی ایشن کے سربراہ نے ہم سے وعدہ کیا کہ وہ ہمارے دلی احترام و توصیف کے جذبات اس خاتون کو بھی سنائیں گے، ملک سے واپسی پہ مالک کو بھی اور حتیٰ کہ سٹی گورنمنٹ کے سربراہ کو بھی۔۔۔ ہم حیران تھے کہ ہم پاکستان میں یہ خبر کس کو سنائیں جہاں نہ سٹی ہے نہ گورنمنٹ۔ چنانچہ اے میرے اچھے قاری۔ ہم آپ کی توسط سے چین کے محنت کش عوام کی توصیف کر رہے ہیں)۔

ایسا بھی نہیں کہ یہ خاتون ڈش کی ریڑھی کسی اور سے کھچوا کر لاتی اور خود محض ہماری

میز پر سجاتیں۔نو،نو۔وہ مہربان افسر عورت کچن سے ریڑھی پہ لادکر بے انتہا رش میں سے ہوتی ہمارے کمرے تک آتیں اور ہمارے سامنے چنتیں۔چین میں باقی ہر جگہ ہم کھاتے تو کامن ڈونگے میں آکر چیز میز پر سجتی اور ہم میز گھما گھما کر اپنی پسند اور مقدار کے مطابق اپنی اپنی پلیٹوں میں ڈالتے۔مگر یہاں اس خاتون نے الگ انتظام کررکھا تھا۔وہ ہر ایک کے لئے الگ پلیٹ میں خود ڈال کر ہر ایک کے سامنے رکھتی جاتیں۔ہم بارہ افراد تھے۔سو، ہر ڈش کی بارہ پلیٹیں وہ کچن سے لاتیں اور ہر ایک کے سامنے بڑے رکھ رکھاؤ سے رکھتیں۔کل 31 ڈشیں تھیں۔اکتیس بار وہ کچن تک گئیں اور 31x12 دفعہ میز پر کھانے چنتی رہیں۔وہ معزز ومحترم و نازک دل وجسم کی خاتون دو گھنٹے تک پاؤں پہ کھڑی یکے بعد دیگرے ڈشیں لاتی رہیں۔ہم اخلاق ومحبت کے بھوکے کس قدر مقروض ہو چکے تھے چین میں۔مردوں کے بھی خواتین کے بھی۔اس خاتون کی سرزمین اور نظریے پہ قربان۔

7۔آنکھیں بڑی نعمت ہیں

ہم ہوٹل سے رات کا کھانا کھا کر ساڑھے نو بجے نکلے جو عام حالات میں چینیوں کے لئے ادھ رات ہوتی ہے۔مگر محبت ہو اور کل صبح چھٹی ہو تو پھر ٹائم اتنا مسئلہ نہیں رہتا۔ ہمارے رائٹر ایسوسی ایشن کے مقامی دوست تو رخصت ہوئے مگر ہمارے میزبانوں نے ہمارے لئے عجیب انتظام کررکھا تھا۔انہوں نے ایک ایسا بازار دکھانے کا بندوبست کیا جو بالکل ہمارے پاکستان کے بازاروں جیسا تھا۔لیاقت روڈ کوئٹہ۔سڑک کے دونوں طرف دکانیں ہی دکانیں تھیں۔خوبصورت لائٹیں تھیں۔یہاں گاڑیوں کا داخلہ ممنوع تھا اور صرف پیدل ہی جایا جاسکتا تھا۔یہ شہر کا،لہٰذا پورے چین کا اول نمبر کا شاپنگ سنٹر سمجھا جاتا ہے۔میری عینک تو Yellow River کے کنارے گم ہو چکی تھی ژنگ ژو میں۔اور میں گزشتہ دو دن سے بے عینک تھا۔میں نے چینی دوستوں کے ناک میں دم کررکھا تھا کہ اتنا بڑا چین اور اس میں عینک نہیں۔مگر یاروں نے ہمارا شیڈول ہی اس طرح کا بنایا ہوا تھا جس میں عینک خریدنے کا وقفہ ہی نہ تھا۔اس وسیع سڑک پر مشتمل رنگ ونور سے مرصع بازار میں بالآخر ہم عینک والے بن ہی گئے۔چینی احباب ایسے خوش تھے جیسے انہوں نے بہت بڑا معرکہ سر کرلیا ہو ۔میرا تکیہ کلام ختم ہو گیا،انہیں چین نصیب ہوئی۔ہمارے اظہار صاحب اشیاء پر ٹوٹ پڑے۔ پتہ نہیں کتنے پتلون خریدے،کتنی ٹائیاں اڑس لیں،کتنے شرٹس کا سودا کیا۔میں نے بھی پانچ ٹائیاں خریدیں اور چالیس یوآن کی ایک شرٹ خریدی۔۔نئی نویلی شرٹ (پچھلی رات ہوٹل والے نے شرٹ کی دھلائی کے چالیس یوآن مانگے تھے)۔مگر اے شریف لوگو۔چین میں شرٹ خریدتے وقت ہماری طرح محض گردن کا سائز نہ دیکھئے بلکہ آستین کی لمبائی بھی دیکھئے کہ ان کے گردن کی موٹائی تو آپ والی ہو سکتی ہے مگر ان کے قد نسبتاً چھوٹے ہوتے ہیں اور آستینیں چھوٹی نکلیں گی جیسے کہ ہمارے۔ہنستے مسکراتے،سیر شکم،محبتوں سے لدے پھندے، دوستی کی امانتیں سود کے ساتھ لوٹانے کا عہد کئے ہم ساڑھے دس بجے رات ہوٹل پہنچ گئے۔

8۔گناہ بھی بڑے ڈھنگ سے

28 نومبر ہمارا شنگھائی سے واپسی کا دن ہے بیجنگ کی جانب۔ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر ہم یوگارڈن Yu Garden دیکھنے گئے۔یوگارڈن شنگھائی کے تاریخی باغات میں سے ایک ہے۔یہ پرائیویٹ باغ ایک نواب کا تھا۔جو کہ قدیم شنگھائی کا باسی اور صوبہ سی چوآن کا گورنر تھا۔اس کا نام پان ین دوان تھا۔18 برس میں یہ باغ مکمل ہوا

۔یہ 1559 میں بن گیا۔اس باغ کا کل رقبہ بارہ ایکڑ تھا اور اس باغ کا نام Yu Yuan (باغِ مسرت) تھا۔

اس کی بہت سی ممتاز خصوصیات میں سے ایک یہ ہے کہ اس کے گیٹ پہ ایک بہت بڑا ڈریگن بنا ہوا ہے اور یہ ڈریگن پورے باغ کی چار دیواری پر دوڑنے جیسا لگتا ہے۔مگر بادشاہ سلامت ڈریگن کو تو اپنا استحقاق سمجھتا تھا، بھلا اور کسی کو جرات کہ وہ اس کی طاقت کے نشان ڈریگن کو اپنے گھر میں لگا دے۔حکم ہوا ''سرقلم کر دیا جائے''۔مگر نواب تو استاد ہوتے ہیں اور شہنشاہ کی تعریف کرو تو بس سمرقند بھی تمہارا اور بخارا بھی۔ چالاک نواب نے کہا کہ ''باغ مکمل ہوتے ہی میں ظلِ الٰہی کو اس کے معائنہ کرنے کے لئے مدعو کرنے کا منصوبہ بنا چکا تھا اور یہ کہ جب حضورانور تشریف لاویں گے اور گیٹ پر ڈریگن دیکھیں گے تو یہ معائنہ آپ کے شایان شان رہے گا۔ بھائی صاحب پھونک میں آ گیا اور نواب کی جان بخشی ہوگئی۔

یہ ساڑھے چار سو برس قبل کا بہت ہی خوبصورت باغ ہے۔ جو عجب قسم کے ہالوں پر مشتمل ہے۔ایک ہال میں میزیں، کرسیاں سب کی سب بڑ کی جڑوں سے بنا دی گئی ہیں۔ اس پہ لگے بورڈ پر لکھا ہے'' Eye Hall...Made of Roots of Banyan''۔ایک اور ہال اس طرح تعمیر کیا گیا ہے کہ لاؤڈ سپیکر کی غیر موجودگی میں بھی آواز ہر کونے تک پہنچ سکے۔یہی وہ ہال ہے جسے 1853 میں Dagger سوسائٹی نے مانچو سلطنت کے خلاف بغاوت کے لئے اپنا ہیڈ کوارٹر بنایا تھا۔ باغ میں عجیب قسم کے پتھروں سے مصنوعی چٹانیں بنا دی گئی ہیں۔ جو ڈیرہ بگٹی کے سورج زدہ پہاڑوں جیسے لگتے ہیں۔ فرش بہت خوبصورت ہیں اور بڑی بڑی سلوں کے درمیان میں رنگین اور چھوٹے چھوٹے گھڑے ہوئے پتھروں سے درزیں بھری ہوئی ہیں۔اس باغ کی رنگین ترین بات یہ ہے کہ کمروں اور ہال وغیرہ کے اردگرد مصنوعی ندی بنائی گئی ہے۔ یہاں کے نواب گناہ بھی لذت آور ماحول میں کیا کرتے تھے۔

ہم نے دیکھا کہ یہاں کے سیاح زیادہ تر مقامی لوگ تھے۔مڈل کلاس اور لوئر کلاس کے لوگ تھے۔زندگی سے بھرپور قہقہے لگاتے ہوئے،لڑکے لڑکیاں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے اپنا اتوار جشن کے سے انداز میں منا رہے تھے۔

9۔ٹوٹ پڑو

یو گارڈن کے گیٹ سے نکلتے ہی ہمارے احباب کی شاپنگ کی بے پناہ بھوک مٹانے کے لئے بازار شروع ہو چکا تھا۔میزبانوں نے ہمیں یہاں تک ہانکا اور اس کے بعد ہمارے یار بازار پر ایسے ٹوٹ پڑے جس طرح کہ بھوکا ریوڑ سرسبز گھاس پہ جھپٹ پڑتا ہے۔ منہ بھر بھر کر لقمے اکھاڑنا، آدھا کھانا، آدھا گرانا، بقیہ گھاس کو کھریوں تلے روندنا۔عملاً جیسے سکندر بلوچستان پہ ٹوٹ پڑا تھا۔

ہمارے احباب کی شاپنگ کی ازلی تڑپ ختم نہ ہوئی نہ دھندلا گئی مگر میزبانوں کو دوپہر کا کھانا کھلانے کا اپنا فریضہ یاد آیا۔انہوں نے ہم سے رائے پوچھی کہ کیا ہاٹ پاٹ کھانا ہے؟ چونکہ یہ سب کے لئے نئی بات تھی اسلئے فوراً راضی ہوگئے۔ چنانچہ اپنی کوسٹر میں بیٹھے اور ہاٹ پاٹ کھانے چل دیئے۔ہم مڈل کلاس رہائشی علاقے سے گزرے جو فلیٹس کا علاقہ ہے۔ اور ہر جگہ دھلے ہوئے کپڑے رضائیاں وغیرہ سکھائی جا رہی تھیں۔ یہ لوگ رسیوں پر کپڑے نہیں سکھاتے بلکہ ایک تین چار گز لمبی لوہے کی پائپ اپنی متعلقہ منزل پہ واقعہ گھر کے کسی کمرے کی کھڑکی سے آدھا باہر نکالتے ہیں اور اس پر کپڑے اٹکا کر دھوپ میں سکھاتے ہیں۔

جب چاہا اس پائپ کو مع سوکھے کپڑوں کے کھینچ کر کھڑکی سے اندر کرلیا۔

ہم ہاٹ پوٹ پہنچے۔ یہاں ہوٹل والوں نے ہماری میز پر قدرتی گیس کے چولہوں پر مستطیل اور ہموار پیندے والی کڑھائی رکھ دی، ٹرے جیسی کڑھائی اور ہمیں بڑے بڑے چمٹے تھما دیئے۔ وہ پکانے کا سامان ٹکڑے ٹکڑے کر کے لاتے تھے اور ہم پکاتے جاتے کھاتے جاتے۔ بے صبرا ظہار الحق بیچ بیچ میں ضرور پوچھتے۔ ''وٹ از دِس''۔ گیٹ پر ایک خاتون نے چین کا روایتی لمبی گلابی چوغے جیسی تنگ قمیض پہن رکھی تھی، اس لمبی قمیض پر نیچے جا کر چیرا دیا ہوا تھا اور ٹانگیں بغیر لباس کے تھیں۔ یہ دروازے کے قریب استقبالیہ نما چیز پہ کھڑی تھی، باہر بارش ہو رہی تھی، سردی تھی، ادھر سے اس کو زبردستی مسکرانا پڑ رہا تھا۔ میں غور سے انسانی حسن اور اس کے استحصال پر غور کر رہا تھا۔ لگا جیسے چینی لڑکیاں بوٹ پالش نہیں بوٹ شائننگ ٹائپ کی چیز بطور لپ سٹک لگاتی ہیں۔ ان کی قدرتی سرخی کو چمک عطا کرنے والی کوئی اسٹک۔ ہونٹ اور رخسار، رخسار اور ہونٹ، دنیا یہیں طواف کرے۔ ایسا حسن جو آپ کو مستغرق کر دے، قیامت لائے، حسن تراش کی صناعی پہ توصیف و ثنا کروائے۔ نظریں ہٹانی ہی پڑیں کہ نہ جلووں کی تاب تھی نہ لمبا قیام تھا۔ پندرہ منٹ بعد ہی تو اس کا شہر چھوڑنا تھا۔

کھانا کھا کر ہوٹل سے نکلے، مڑ کر بھی نہ دیکھا کہ دیکھنا ''انسان خسارے میں ہے'' کا مصداق بن جاتا ہے۔ سیدھا ہوٹل آئے اور سامان لے کر ائیر پورٹ پہنچے۔ اور اب کے ایک نئی کمپنی ''ائیر چائنا'' کے جہاز پر بیٹھے۔

10۔ کمیونسٹ ہونے کا کچھ فائدہ نہیں

جہاز میں میرے ساتھ ایک نوجوان بیٹھا تھا۔ یکدم آپس میں ہم انگریزی بول رہے تھے۔ اور وہ اچھی خاصی رواں انگریزی بول رہا تھا۔ کمپیوٹروں کے مشہور عالم کمپنی **IBM** میں ملازم تھا۔ گپ شپ شروع ہوئی۔ اس کی عمر پوچھی تو جس چیز کی تائید ہوئی وہ یہ تھی کہ چینی لوگ پیدائش کی تاریخ کو ڈیٹ آف برتھ نہیں کہتے، بلکہ وہ حمل ٹھہرنے کی تاریخ کو تاریخ پیدائش قرار دیتے ہیں۔ اسلئے جو شخص اپنی عمر **25** برس بتائے تو ہمارے حساب سے وہ **24** سال تین ماہ کا ہے۔ (ہے نا دلچسپ بات!!)

دروغ سارا، (اور دنیا بھر کا، اور ازل سے ابد تک) بر گردن ملاّ، یہ شخص **6000** امریکی ڈالر ماہوار تنخواہ لیتا ہے۔ اس کا ایک ذاتی مکان شنگھائی میں ہے اور دو سنگا پور میں۔ اسکے پاس اپنی موٹر کار ہے۔ یہ شخص ماں باپ سے الگ رہتا ہے، اپنے بچوں کے ساتھ۔

میں نے اس سے پوچھا کہ اب آپ لوگ اپنے چین کو کیا کہتے ہو، سرمایہ داری نظام والا چین، کمیونزم والا چین!

اس نے کہا ''سرمایہ داری نظام، کمیونسٹ پارٹی کے ذریعے''۔

اس نے بتایا کہ اس کی بیوی بیالیس برس کی ہیں اور وہ پندرہ برس کی عمر میں کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہوئی تھیں مگر پچھلے سال ''بے فائدہ'' سمجھ کر مستعفی ہو گئیں۔ میرا باپ ساری زندگی کمیونسٹ پارٹی کا ممبر رہا۔ ابھی پچھلے سال مستعفی ہو گیا''۔

''کیوں؟''

''فائدہ کچھ نہیں ہے''

سولھواں باب

کونجوں کی وطن واپسی

ہم بیجنگ اپنے نووٹیل ہوٹل میں پہنچے۔ پھر سیدھا سفیر، ریاض احمد خان کے گھر گئے جہاں ہماری دعوت تھی۔ اب تک تو ہم 30,32 ڈشوں پر مشتمل بادشاہی، مہنگے ترین کھانے کھاتے رہے اور وہ بھی چین کے ہر گوشے، ہر کونے اور ہر قومیت کی ڈش۔۔۔ اور اب پاکستانی کھانے کی بڑی طلب ہو رہی تھی۔ مر رہے تھے اپنے ساگ روٹی پہ۔ اور ہم ٹوٹ پڑے چپاتی پہ۔ چینی ملازم پھلکا بازی سے تھک ہار کر ہتھیار ڈال چکا مگر ہم ''اور لا، اور لا، اور لا، ہور لا ہور، لا۔۔۔'' بن چکے تھے بنگال گیا، ہور لا، ہور، کشمیر گیا ہور لا ہور، بلوچستان لٹا مگر ہور لا، ہور۔۔۔۔

ہم سفیر صاحب کی خوبصورت باتیں سنتے رہے۔ ان کی اپنی فکری بالیدگی بھی بول رہی تھی اور ان کی موجودہ سرکاری پالیسی بھی۔ وہ بہت ترقی پسند باتیں کر رہے تھے۔ ان کی باتوں کا لب لباب یہ تھا کہ ملاؤں نے ہمارے ملک کا بھٹہ بٹھا دیا ہے۔ مّلا نے ہر بات کو اسلامی بنا بنا کر اور مسلمان کو دوبارہ مسلمان بنانے کے مہلک ہتھیار کو جاری رکھ کر پاکستانی سماج کو قرونِ وسطٰی میں پٹخ دیا ہے۔ سفیر صاحب میرے اس استدلال سے بالکل متفق تھے کہ جب تک جاگیرداروں کی لینڈ ہولڈنگ ختم نہیں ہوتی ملک ترقی نہیں کر سکے گا۔

29 کی صبح ہماری آخری صبح تھی عوامی جمہوریہ چین میں۔ ہمیں شاپنگ پہ جانا تھا۔ نو بجے پاکستانی سفارتخانے میں متعین کلچرل سیکرٹری سعید جاوید اپنے اسسٹنٹ افضل کے ساتھ آئے۔ ہم لوگ اپنی کوسٹر میں خونچاؤ مارکیٹ چلے گئے۔ جو بیجنگ میں نسبتاً سستا بازار ہے جہاں دنیا جہاں کی ساری اشیاء بکتی ہیں، تھوک میں بھی اور پرچون میں بھی۔

یاروں نے یلغار کر دی۔ کیمرے، گھڑیاں، ٹیلی فون، سی ڈی، وی سی ڈی۔۔

دوکاندار سب کی سب (جی ہاں سب کی سب)، خواتین تھیں سو فیصد خواتین۔ ایک سے بڑھ کر ایک ماہ لقا تھی۔ مسکراہٹوں کے جال گاہکوں پہ حملہ آور تھے۔ شوکیسوں میں اشیاء کی چمک گاہکوں کے منہ میں پانی لا رہی تھی۔ مول ہو رہا تھا تول ہو رہا تھا۔ خودکار سیڑھیاں لوگوں کو منزلوں پر چڑھا رہی تھی۔ اور پھر انہی لوگوں کو شاپنگ بیگز سے لدے پھندے واپس اتار

رہی تھیں۔

ہمارے دوست جاوید ہم سب کو شاپنگ کروا رہے تھے۔دکان کی سلیکشن بھی انہی کی ، مال کا انتخاب بھی انہی کا اور مول تول کے نازک مذاکرات بھی انہی کے۔خوبصورت جوان ہیں،چینی بولتے ہیں۔ بولنے میں بے تکلف ہوتے ہیں اور چینی دکاندارنیاں رام ہو جاتی ہیں۔

اس مارکیٹ میں ڈالر یوآن میں تبدیل کرنے کی سہولت موجود تھی اور یاروں نے بھی کوئی کسر نہ چھوڑی۔ڈالر بدلے، یوآن لئے ،مگر نوٹ جیبوں میں رہنے کے لئے تھوڑی ہوتے ہیں۔کم بخت مچل مچل کے جیبوں سے ہاتھوں میں آجاتا ہے اور ہاتھوں سے ہاتھوں میں چلا جاتا ہے۔مردانہ پاکستانی ہاتھوں سے زنانہ چینی ہاتھوں میں۔۔۔کتنا بے وفا ہے نوٹ ،کسی کا نہیں رہتا۔

یہاں اصلی موتی ہیں جنہیں ہمارے ہم سفر ہر وقت ہر جگہ Pearl،Pearl کہہ رہے تھے۔۔۔العتش العتش ، پرل پرل۔آج ہم نے یہ پرل بھی دیکھا۔ایک پوری منزل (ایک پورا بازار) ان اصلی موتیوں کا ہے۔سینکڑوں چھوٹے چھوٹے جھروکے اور سٹائل تھے جہاں چائنیز پرلز اور جیولری فروخت ہو رہی تھی۔۔۔ان موتیوں کی چمک قابل دید تھی۔۔۔یہ سب ''کلچرڈ پرلز'' تھے۔یعنی انہیں چینی سمندروں میں اگایا گیا تھا۔۔۔سیپیوں کے منہ کھول کر موتی تخلیق کرنے والے کیڑوں کو مجبور کیا گیا تھا کہ وہ ایک اور موتی تخلیق کریں۔۔۔ان میں آف وائٹ ،تقریباً سیاہ اور جامنی رنگ کے پرلز تھے۔ یہاں کی دکاندارنیاں بہت تیز، بہت طرار، بہت گاہک شناس اور بہت گاہک پھانس ہیں۔ رواج کے مطابق یہ دکاندارنیاں پانچ گنا زیادہ قیمت بتاتی ہیں۔پھر کیلکو لیٹر نامی مذاکراتی خصوصی ''نمائندن'' کو راستہ دیا جاتا ہے ۔اور آپ ابتدائی قیمت کو پانچ گنا کم کر کے بھی دل میں مطمئن نہیں ہوتے کہ پتہ نہیں اب بھی بہت مہنگا لیا ہو۔

جاوید ہمیں ایک دکان پر لے گئے جہاں پرویز مشرف کی شریکِ حیات بیگم صہبا پرویز کی تصویر لگی ہوئی تھی۔تصویر میں وہ اس دکاندارنی کے ساتھ اس کی دکان پہ موتیاں خرید رہی ہیں۔تصویر کو بڑی کر کے فریم میں سجا کر دکان پر لٹکایا گیا تھا۔شاید ہمیں پھانسنے کے لئے ۔ورنہ اور خریداروں کو کیا پتہ کہ خریدار خاتون کون ہیں۔

دکاندارنی آرڈر پہ آرڈر وصول کر رہی تھی اور اڑوس پڑوس کی دکاندارنیوں کو مدد کے لئے بلا رہی تھی۔آن کی آن میں دس لڑکیاں آئیں اور تیزی تیزی سے موتیاں ہاروں میں پرونے لگیں۔ ہار بنے ، انگوٹھیاں بنیں اور کانوں والے ٹاپس۔ پھر انہیں ریشم کی خوبصورت رنگین پوٹلیوں میں ڈالا اور گاہک کے حوالے۔ہم بھی ریوڑ گاہکاں میں شامل تھے۔ہم سے بھی نہ رہا گیا۔ہم نے بھی ایک آدھ پوٹلی لی۔ پھر ایک پوٹلی تو بہت چاہت کے ساتھ اس طرح نزاکت سے اٹھالی کہ جہاں دیدہ یوسفی صاحب نے آنکھوں کی مخصوص چمک پڑھ لی کہ اس پوٹلی میں میرا دل ہے۔

ہم دوستوں نے آن کی آن میں خود کو ٹھنڈا کر دیا۔ ابھی ابھی شاپنگ کے شوق میں آنکھیں پتھرائی ہوئی تھیں اور ابھی دیکھو تو بلوچستان میں دو دنوں کی پیاسی گائے کی طرح تالاب سے غٹا غٹ کرنے کے بعد اب بے قدر و قیمت و بے جان و جسہ کھڑے تھے۔

شاپنگ کے دوران موتی فروش لڑکیاں جس خود اعتمادی ، جس بھر پور بے تکلفی ، البتہ حدود کی محدودیت میں رہتے ہوئے تجارت کرتی رہیں اس سے کم از کم وہ تین گھنٹے ہم خود کو روایتی پاکستانی حواس باختہ مرد سے بہت اونچا محسوس کر رہے تھے۔ یہاں نہ مرد مرد تھا نہ عورت عورت تھی ، نہ آوازیں کسنے کی حقارت سوجھتی تھی نہ پست تبصرہ بازی جاگتی تھی۔۔۔ہم مکمل انسان بن چکے تھے۔چینی عورت کی اسی مسکراہٹ ، ملائمت ، اخلاق اور بے پناہ خود اعتمادی ہی میں تو چین کی ترقی کا اصل جوہر ہے۔

چینی ریشم سے زیادہ مشہور چیز دنیا میں اور کیا ہے؟ ۔سو ہم سب دوستوں کی اگلی

جنگ جاہ یہی ریشم والی دکانیں تھیں۔ پوری کی پوری منزل ریشم کے لئے وقف تھی۔ عورتیں ہی عورتیں، کیلکولیٹر اور میٹر ہاتھ میں، تھان کے تھان لا رہی ہیں، رکھ رہی ہیں۔ اور وہ اس وقت سوائے دکاندار کے اور کچھ بھی نہیں۔ نہ وہ عورت ہے نہ وہ چینی ہے، نہ اسے ٹوِن ٹاور کا پتہ، نہ کیوبا کے کاسٹرو کا۔ جب اچھی طرح ہمیں جیبی بوجھ سے ہلکا کر کے کندھے کے بوجھ سے ہلکان کرنے کا سامان کر چکی تو ہم نے دیکھا کہ وہ دوسرے انسانوں کی طرح کھانس بھی سکتی ہے، عورت کی سرخی اور لجاجت میں بھی مبتلا ہو سکتی ہے۔۔۔۔۔ ہم نے ایک سوٹ تو ظاہر ہے کہ بہت ممتاز اور نازوں والا خریدا ہوگا!!۔

بزدل بادشاہوں کی دیواروں فیصلوں کے اس دیس میں ہم دیوار و محل و موتی و ریشم کے روحانی وجسمانی حصار میں قید واپس کس طرح ہوٹل پہنچے، پتہ نہیں۔ البتہ ہانس کو تکلیف دے کر پندرہ منٹ کے حاصل وقفے کو استعمال میں لاتے ہوئے آخری بار کتابوں کی دکان ضرور آئے۔ ہم عملاً دوڑتے ہوئے آئے کہ چین میں ہماری آمد بھی کتابوں کی دکان سے ہوئی تھی۔ اور ہم سفر کا اختتام بھی کتاب کی خریداری پہ کرنا چاہتے تھے۔ آدھا کلومیٹر جس تیز رفتاری سے طے کیا وہ میں جانوں یا وہ چینی جوان۔ البتہ جنگشی یو کو ہماری ادا بہت پسند آئی۔ اور ہمیں صوفی محمد مصری کی بات یاد آئی کہ:

''جہالت کی پیروی کرتے رہنے سے علم کے پیچھے بھاگتے رہنا بہت ارفع کام ہے''۔

ہم آخری بار اس سفر کے آخری نہج پہ ایغور کے ریڈ روز ہوٹل میں موجود تھے۔ چونکہ یہ بے راہ و بے مغز و بے تہذیب و بے انسانیت بیوروکریٹوں کا معاملہ نہ تھا۔ بلکہ سنگتی، کامریڈی، دوستی اور برابری کی بات تھی اس لئے جنگشی یو نے خوب خاطر مدارت کی، لطیفے حکایتیں سنائیں، اپنی مہمان نوازی میں کسی بھی کمی بیشی کی معذرت چاہی۔ ہم نے بھی ان کو زحمت دینے اور کبھی کبھی مہمانی کی بجائے اکڑ خانی تک جا پہنچنے کی معافی چاہی۔ جنگشی یو نے چینی مہمان نوازی کے رواجوں کے بارے میں باتیں کیں اور کہا کہ گو کہ ہم جبر نہیں کرتے لیکن چینی لوگ رواجاً اپنے مہمانوں کو آخر میں ایک پیالہ بیئر کا پیش کرتے ہیں۔ ہم ملاؤں، دو تہوں والوں اور سفید پوش نیک صالحوں میں سے ایک نے پاکستان کی لاج رکھ ہی دی ۔مقدار نیم قدح۔ اس سے زیادہ نہ میزبان نے لنڈھائی نہ مہمان نے، کہ ایک رواج ہی پورا کرنا تھا۔

یاروں، یاروں کے بازاروں، بازاروں کی سرزمین، سرزمین کا دارالخلافہ، دارالخلافے کا ائیرپورٹ۔ ہمارے پیارے میزبان ہمیں اپنی مقدس سرزمین کی خوبصورت زیارت کروا کر ہمیں اندر داخل کر کے، ہمیں ہجوم میں سے ہاتھ ہلاتے دیکھتے اوجھل ہو گئے۔ کہ اندر داخلے کے لئے ان کے پر جلتے تھے۔ ہم نے انہیں انسانی بھائی چارے کی عمیق احساس کے ساتھ ہزاروں افراد کی چہل پہل میں آنکھوں سے تو اوجھل کر دیا مگر وہ ہمارے دلوں میں، ہمارے ذہنوں میں ابھی تک محفوظ ہیں۔ ہم اس اشرف المخلوقاتی جذبے کو کبھی مدہم نہ ہونے دیں گے۔

تھرڈ سیکرٹری جاوید بمع اپنے اسسٹنٹ کے پہنچے ہوئے تھے۔ گلے میں سفارتی کارڈ لٹکا دو تو دارالخلافوں میں بہت سی بندشوں سے نجات مل جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ اور بندشیں لگ بھی جاتی ہیں۔ چنانچہ جہاں چینی رفیق، جنگشی یو نہ جا سکا وہاں جاوید کے پر جلنے سے Immune تھے۔ شریف آدمی نے لائن میں کھڑے لوگوں میں سے ہمارے وفد کی عزت کروائی۔ سامان پاسپورٹ وغیرہ وغیرہ سب کچھ برابر کر کے دے دیا۔ درمیان درمیان میں کبھی کوئی لطیفہ ٹھونس دیا کبھی کوئی شعر پیوند کر دی۔ کچھ سرکاری ڈیوٹی تھی، کچھ ہم وطنی کا جذبہ تھا، کچھ ہنس مکھ مزاج کے تقاضے تھے، کچھ محفل نوازی کی لوزامات سے آشنائی تھی۔ ہم اس دوست سے متاثر ہی ہو کر آگے بڑھے، جہاں، اب یہ فرشتہ بھی نہ جا سکتا تھا۔

ایک بہت ہی بری اور کچھ ساتھیوں کے ساتھ تو کریہہ تلاشی کے بعد ہم ائیرپورٹ

کے اندر والے علاقے میں، جسے محض لاؤنج کہہ دینا زیادتی ہے، بے مہار چھوڑ دیئے گئے۔ یہ جتنا وسیع علاقہ ہے اس کا تصور قاری کی حیثیت سے ممکن نہیں خود جا کر دیکھنے کا متقاضی ہے۔ یہ چراگاہ بھی تھی، تماش گاہ بھی تھی، انتظار گاہ بھی تھی، سیر گاہ بھی تھی، خورد ونوشی جاہ بھی تھی، خرید و فروخت گاہ بھی تھی، نشست گاہ بھی تھی، آرام گاہ بھی تھی، گپ گاہ بھی تھی۔۔۔

ہمیں یہاں دو گھنٹے کی وقت گزاری کرنی تھی۔ لہٰذا کون ایک جگہ پہ ٹک کے بیٹھے، سو ایک آدھ چکرا کیلے لگایا، پھر یوسفی صاحب کو ساتھ لیا اور کتابوں کی دکان میں گھومے۔ ایک آدھ کتاب بہت مہنگی قیمت پر خریدی۔ خصوصاً ماؤ کی شاعری والا کتابچہ یہاں سے لے لیا۔ پھر 82 سالہ دوست کو پیشاب کی حاجت ہوئی اور ہم باتھ روم چلے گئے جو پہلے یہ لیٹرین ہوا کرتا تھا، پھر ٹوائلٹ ہوا، پھر باتھ روم اور آج کل واش روم۔ یہاں گئے تو دیکھا نلکے کھلتے ہی نہ تھے۔ یوسفی صاحب نے شکایت کی۔ میں نے جوانی دکھائی۔ جب بات نہ بنی تو وزیر خان کا پوتا پن یعنی عقل استعمال کیا۔ اور نلکہ فوراً کھل گیا۔ اور کیا خوبصورت طریقہ تھا نلکہ کھلنے کا۔ آپ اسکے نیچے ہاتھ لے جائیں وہ خود اسے محسوس کرے گا اور کھل جائے گا۔ اور جب تک آپ کا ہاتھ اس کے نیچے رہے گا نلکہ چلتا ہے گا۔ آپ صابن لگانے کے لئے ہاتھ نکالیں آٹو میٹک بند۔ یہ تھا ہائی جینن اور یہ تھی پانی کی بچت۔ یہی حال ہاتھ خشک کرنے والی مشین کا بھی تھا۔ آپ ہاتھ اس کے نیچے لے جائیں Sensor محسوس کرے گا اور گرم ہوا چالو ہو جائے گی اور جس وقت آپ کا ہاتھ خشک ہو جائے ہاتھ ہٹائیں اسی دم گرم ہوا بند۔ (چین تم پہ زور تو نہیں چلتا)۔ یوسفی صاحب نے یہ معجزہ دیکھا تو فی البدیہہ بولے: ''ڈاکٹر صاحب! حالانکہ پیشاب کرنا کریہہ کام ہے لیکن بیجنگ ائیر پورٹ وہ واحد جگہ ہے جہاں پیشاب کرنے کا بھی مزہ آتا ہے''۔

ہمیں اس ترقی یافتہ ترین ائیر پورٹ پہ چیرمین ماؤ یاد آئے، چو این لائی، لیو شاؤ چی یاد آئے، ہمیں لوہسون یاد آئے، ہمیں چین کے ایک شاعر کی یہ رباعی یاد آئی:

دامنِ کوہ میں دیکھو یہ سنہری کھیتی
ہم نے جو بویا یہاں، دوسرے کاٹیں گے اسے
وہ بھی اس خرمن و حاصل پہ نہ اترائیں کہ یاں
دوسرے ان کی جگہ، جلد ہی آجائیں گے

ہم ائیر پورٹ گھومتے رہے۔ اور پھر اچانک دیکھا کہ پروفیسر ڈاکٹر سلیم اختر کی پتلون کی زپ کھلی ہوئی ہے۔ وہ ہمارے محترم ہم سفر تھے۔ اس لئے بڑی احتیاط سے انہیں بتا دینا ضروری تھا۔ میں نے 440 وولٹ کے خطرے سے بچاؤ کے پیش نظر بہت ہی میٹھا بن کر کہا ''پروفیسر صاحب، برا نہ منائیں، میں آپ کو بتا دوں کہ آپ کے پتلون کی زپ کھلی ہوئی ہے''۔ بڑی بے نیازی اور بغیر فوری ردعمل کے، سرد مہری سے کہنے لگے: ''آپ نے بڑی دیر کر دی بتانے میں۔ دراصل میری پتلون تنگ ہے، زپ بند نہیں ہوتی۔ اسی لئے تو ہمیشہ دونوں ہاتھ وہیں باندھے رکھتا ہوں۔۔۔''۔ میں حیران ہوا، یوسفی صاحب سے کہا ''آپ کو یاد ہے ضیاء الحق بھی یہیں ہاتھ باندھے رکھتا تھا اور خاتون صحافی ایما ڈنکن نے اپنی کتاب ''بریکنگ دی کرفیو'' میں لکھا تھا کہ ضیاء ہمیشہ اپنے ہاتھ اپنے پرائیویٹ پارٹس پر رکھتا ہے۔۔۔'' یوسفی صاحب نے کہا: ''اپنے سفرنامے میں لکھیے اور بے شک میرے حوالے سے لکھیے کہ حُسن کے پارکھ سلیم اختر نے چین کی سیاحت کھلے ذہن اور کھلے زپ کے ساتھ کی''۔

بالآخر ہم جہاز پہ پہنچ گئے پی آئی اے کے اس جہاز میں ایک فضول، بدصورت اور مردانہ معاشرہ قائم تھا۔ اور سواریوں میں بھی جاپان سے پاکستان جانے والے پنجابیوں کی اکثریت تھی جو بالکل بھی اچھے ہم سفر نہ تھے۔ چار چھ پٹھان تھے۔ وہی سوداگروں والے گندے میلے کپڑے اور پسماندہ طرزِ حیات۔ ہم بالکل بور ہوئے۔ مگر اڑان کے پون گھنٹے بعد جو واقعہ رونما ہوا وہ اس سفر کے خوبصورت ترین واقعات میں سے تھا۔

بین الاقوامی پروازوں پہ ٹیکس فری اشیاء کی ایک ٹرالی جہاز کے مسافروں کے بیچ

گھمائی جاتی ہے۔ جس طرح پھیری والے اپنی چیزیں بیچتے ہیں۔ اسے ایک نیوی کٹ سفید داڑھی والے بزرگ سن مرد اور ایک خاتون دھکیل رہے تھے۔ چاکلیٹ، فرانسیسی عطر، اعلیٰ برانڈ کے سگریٹ وغیرہ۔ مجھ سے پچھلی سیٹ پہ یوسفی صاحب اور سلیم اختر بیٹھے تھے۔ وہ پھیری والے چھوٹی داڑھی کے بزرگ ذرا سا رُکے، یوسفی صاحب کو غور سے دیکھا اور احترام سے پوچھا، ''آپ مشتاق یوسفی صاحب ہیں؟''۔

''جی ہاں''۔

وہ شخص ریڑھی، عہدہ، ڈیکورم سب چھوڑ پتلون کے ساتھ وہیں ان کے قدموں میں بیٹھ گیا اور احترام کے ساتھ یوسفی صاحب کے گھٹنے چھوئے۔ اور بڑے یوسفی نے اتنا ہی کبیر و بزرگ فقرہ ان سے کہا ''بھئی بہت خوشی ہوئی کہ آپ ادب وقلم کی عزت کرتے ہیں''۔

ہمارا جہاز اسلام آباد اتر گیا۔ ایسا دیس جو مجھے بہت ہی عزیز ہے۔ اس خطے کا نام مہر گڑھ ہے اور اس کی مالکن ایک ساحرہ ہے جس کا نام ''مہر'' ہے۔ مہر بلوچی میں محبت کو کہتے ہیں۔ میں اسی مہر مرکزے کا الیکٹران ہوں۔ مہر گڑھ کی گرم آغوش کا جایا۔ اسلام آباد ائیر پورٹ پہ افتخار عارف اپنے پورے عملے کے ساتھ موجود تھے، بہت خوشی ہوئی۔ مگر اصلی خوشی تو وہ تھی جب کانوں میں چوڑیاں کھنکیں، جام ٹکرائے: ''ویلکم ٹو اسلام آباد، لو میرے پردیسی بابو، ایک بہت ہی گرمجوش احساس میرے دل میں ابل رہا ہے کہ تم آئے ہو۔

''مجھ سے پوچھو کہ ایک ہفتہ کتنا طویل ہوتا ہے۔ خالی جیسے تاریک گڑھا، بے انت جیسے سمندر، خشک جیسے صحرا، بے امید جیسے کہ بغیر چاندنی کی رات ۔۔۔ میں زندگی بھر خود کو تنہا چھوڑے جانے کے خلاف اس جلتے احساس کو نہ بھول پاؤں گی''۔

''جب بھی دل نے تمہارے بارے میں سوچا آنکھیں برسیں ۔۔۔ یاد ہے ایک بار تم نے میری آنکھوں کی قسم کھائی تھی، لہٰذا اب کے انہوں نے ثابت کر ہی دیا کہ وہ قسم کھائے جانے کے قابل بھی ہیں، انہوں نے ہی تمہاری غیر موجودگی سب سے

زیادہ محسوس کی اور تمہارے لئے روئیں۔ پھوٹ پھوٹ کے، برس برس کے''۔

اے سسی راہروانِ ہستی سے
جانے کیا کہہ گیا سفر تیرا

شاہ لطیف